# بۇلبۇل خۇش نۇۋا

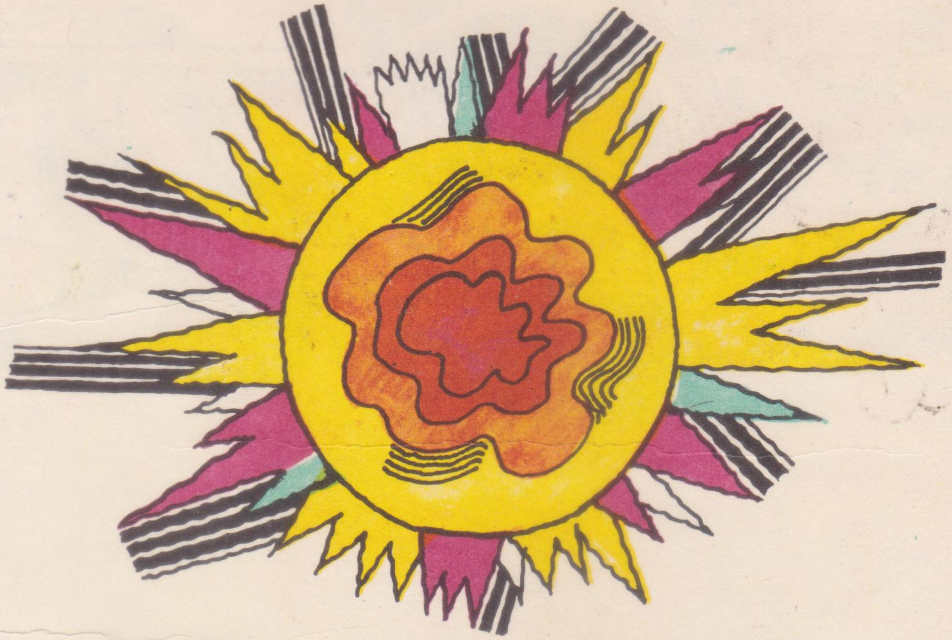

# بلبلِ خوش نوا

## ازبیک لوک کہانیاں

دارالاشاعت ترقی
تاشقند

# تین بہادر بھائی

بہت دنوں پہلے کی بات ہے، کسی مقام پر ایک آدمی رہتا تھا۔ وہ نہ امیر تھا نہ غریب۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ بیٹے بڑے خوبصورت اور سجیلے جوان تھے۔ لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تھے۔ بڑے ہوشیار اور سمجھدار تھے۔ اچھے لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، برے لوگوں سے دور رہتے تھے۔

سب سے بڑے بھائی تونغیچ باتر کی عمر اکیس سال کی، منجھلے بھائی اورتنچہ باتر کی اٹھارہ سال کی اور سب سے چھوٹے بھائی کینجہ باتر کی سولہ سال کی تھی۔

ایک دن باپ نے تینوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا۔ ان کو اپنے پاس بٹھاکر ہر ایک کو لاڈ پیار کیا، سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر کہنے لگا:

"میرے عزیز بیٹو! میرے پاس کوئی دولت نہیں ہے۔ میرے مرنے کے بعد جو کچھ تمہارے لئے رہ جائےگا وہ بہت دن نہیں چل پائےگا۔ تم لوگ مجھ سے زیادہ کی امید نہ رکھو۔ تم لوگوں کے لئے جو کچھ کر سکتا تھا کیا۔ میں نے تم لوگوں کو تین گن دئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں نے تم لوگوں کو صحت‌مند اور طاقت‌ور بنایا۔ دوسرا یہ کہ

میں نے تم لوگوں کو ہتھیاروں سے کام لینا سکھایا اور تم لوگ ماہر سپاہی بن گئے۔ تیسرا یہ کہ میں نے تم لوگوں کو سکھایا کہ کسی سے نہیں ڈرنا چاہئے اور تم لوگ بہادر بن گئے۔ اب میں تم لوگوں کو تین نصیحتیں کرتا ہوں۔ ان کو سن لو اور ہمیشہ یاد رکھو۔ ایماندار بنے رہو۔ ہمیشہ پریشانی سے دور رہوگے، شیخی نہ بگھارا کرو۔ تم کو شرمانا نہ پڑےگا۔ محنت سے جی نہ چراؤ۔ آرام اور سکھ سے جیوگے۔ باقی سب کی فکر تم لوگ خود کرو۔ میں نے تم لوگوں کے لئے تین گھوڑے تیار کر رکھے ہیں - کالا، بھورا اور خاکی رنگ کا۔ تمہارے تھیلوں میں اتنی خوراک بھر دی ہے جو ایک ہفتے کے لئے کافی ہوگی۔ اب تم لوگ سفر پر روانہ ہو جاؤ۔ دنیا میں گھومو پھرو۔ دنیا کو دیکھے بغیر آدمی نہ بن سکوگے۔ جاؤ، اپنی قسمت کو آزماؤ۔ سفربخیر میرے بیٹو!"

یہ کہہ کر باپ اٹھا اور چلا گیا۔

تینوں بھائی سفر کی تیاری میں لگ گئے۔ اگلے دن پو پھٹتے ہی وہ تینوں گھوڑوں پر سوار ہوکر سفر پر روانہ ہوئے۔ وہ سارا دن رکے بغیر چلتے رہے اور اپنے گھر سے بہت دور نکل گئے۔ شام ہوئی اور اندھیرا چھانے لگا تو ایک جگہ آرام کرنے کے لئے رکے۔ وہ اپنے گھوڑوں سے اترے، بیٹھکر کھانا کھایا اور سونے کی تیاری کرنے لگے۔ وہ مقام بالکل سنسان اور ویران تھا۔ چنانچہ بھائیوں نے سوچا کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم تینوں ہی سو جائیں۔ بہتر ہے کہ رات کو تین حصوں میں بانٹ لیں اور باری باری پہرہ دیں۔

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ سب سے پہلے بڑا بھائی تونغیچ باتر پہرہ دینے لگا۔ باقی دونوں لیٹ کر سو گئے۔ تونغیچ باتر بڑی دیر تک بیٹھا اپنی تلوار سے کھیلتا رہا اور چاروں طرف نظریں دوڑاتا اپنے بھائیوں کی نیند کی حفاظت کرتا رہا۔ چاندنی رات تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سارا ماحول گھری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک ایک طرف سے شور سنائی دیا۔ تونغیچ باتر فوراً اٹھا اور ننگی تلوار پکڑکر چوکنا کھڑا ہو گیا۔

یہ تینوں بھائی جہاں رکے تھے وہاں سے کچھ دوری پر جنگل تھا اور اس میں ایک شیر اپنے کھوہ میں پڑا ہوا تھا۔ انسان کی بو پاکر وہ اب اپنے کھوہ میں سے نکل کر کھلے میدان میں آ گیا تھا۔

شیر کو دیکھکر تونغیچ باتر ذرا بھی نہ گھبرایا۔ اسے یقین تھا کہ شیر سے نپٹ

لے گا۔ بس اس بات کی فکر تھی کہ بھائیوں کی نیند خراب نہ ہو۔ اس لئے وہ ایک طرف کو دوڑ پڑا۔ شیر نے اس کا پیچھا کیا۔ تھوڑی دور جاکر تونغیچ باتر نے پیچھے مڑتے ہوئے شیر کے دائیں پنجے پر تلوار ماری۔ زخمی شیر دھاڑتا ہوا اس پر لپکا۔ تونغیچ باتر پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور اپنی تلوار سے شیر کے بائیں پنجے پر بھرپور وار کیا۔ شیر اپنی تمام طاقت یکجا کرکے ایک بار پھر بہادر پر ٹوٹ پڑا۔ تونغیچ باتر پھر طرح دے گیا اور اس بار اس نے شیر کے سر پر کھینچ کر تلوار ماری۔ شیر دھم سے گر پڑا اور فوراً مر گیا۔ تونغیچ باتر شیر کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے شیر کی کھال میں سے ایک لمبا سا پٹا کاٹ کر کرتے کے اندر، اپنی کمر کے گرد باندھ لیا۔ پھر وہ اپنے بھائیوں کے پاس لوٹ آیا اور کچھ اس طرح اپنی جگہ پر بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد تونغیچ باتر کی پہریداری کا وقت ختم ہو گیا۔ وہ سونے لیٹا اور اورتنچہ باتر پہرہ دینے لگا۔ اس کی پہریداری کا وقت بغیر کسی حادثے کے بیت گیا۔ اب کینجہ باتر کی باری آئی۔ اس کی پہریداری کے دوران بھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی۔

پہلی رات اس طرح گزر گئی اور صبح ہوئی تو تینوں بھائی اپنے گھوڑوں پر سوار ہوکر پھر آگے چل پڑے۔ وہ بہت دیر تک چلتے رہے اور ایک لمبا راستہ طے کیا۔ سورج ڈوبتے وقت وہ ایک پہاڑ تک پہنچے۔ اس پہاڑ کے دامن میں ایک بہت اونچا درخت اگا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک چشمہ تھا۔ بھائیوں نے یہیں چشمے کے کنارے رات کاٹنے کا فیصلہ کیا۔

چشمے کے قریب ایک غار تھا اور اس کے اندر سانپوں کا بادشاہ اژدر سلطان رہتا تھا۔ لیکن بھائیوں کو اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے گھوڑوں کو پانی پلایا۔ پھر درخت سے باندھ کر ان کو صاف کیا، ان کی پیٹھ کی مالش کی، ان کے سامنے چارہ ڈال دیا اور پھر خود کھانا کھانے بیٹھے۔ کھا پی چکے تو انہوں نے آپس میں طے کیا کہ پچھلی رات کی طرح آج بھی وہ باری باری سوئیں گے اور باری باری پہرہ دیں گے۔ چنانچہ گزشتہ رات کی طرح منجھلا اور چھوٹا دونوں بھائی لیٹ کر سو گئے اور بڑا بھائی تونغیچ باتر پہرہ دینے لگا۔ اس کی پہریداری میں کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ اب اورتنچہ باتر پہرہ دینے بیٹھا۔

چاندنی رات تھی۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیکن اچانک شور سنائی

دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد غار سے اژدر سلطان نکل آیا۔ وہ اپنے دیگ کے سے سر کو اٹھائے، موٹے کندے جیسے بدن کو گھسیٹتا اور پھنکار مارتا ہوا چشمے کی طرف بڑھا۔ اورتنچہ باتر ذرا بھی نہیں ڈرا۔ اس خیال سے کہ بھائیوں کی نیند میں خلل نہ پڑے، وہ اٹھکر چشمے سے پرے کھلے میدان کی طرف دوڑا۔ انسان کی بو پاکر اژدر سلطان نے اس کا تعاقب کیا۔ ذرا دور جاکر اورتنچہ باتر رک گیا اور اپنی تلوار سے سانپوں کے بادشاہ کی دم پر وار کیا۔ تلوار کی ضرب سے اژدر سلطان زمین پر لوٹنے لگا۔ بہادر نے چستی سے اس کی پیٹھ پر زور سے تلوار ماری۔ سانپ سخت زخمی ہو گیا اور تیسرے وار سے اس نے دم توڑ دیا۔ اورتنچہ باتر نے اس کی کھال میں سے ایک لمبا پٹا کاٹ کر اس کو کرتے کے اندر، کمر کے گرد باندھ لیا اور واپس آکر اپنی جگہ پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

تھوڑی دیر میں اس کی پہریداری کا وقت ختم ہوا اور کینجہ باتر کی باری آئی۔ اس کی پہریداری کا وقت بھی بخیر و خوبی گزر گیا۔ اس طرح دوسری رات بھی ختم ہوئی۔ صبح ہوتے ہی تینوں بھائی گھوڑوں پر چڑھکر پھر اپنے راستے پر روانہ ہو گئے۔

وہ دن بھر چلتے رہے، آگے بڑھتے رہے۔ پہاڑوں سے گزرے، بیابانوں سے گزرے اور جب سورج ڈوبنے لگا تو ایک ٹیلے تک پہنچے۔ وہیں رات گزارنے کا ارادہ کرکے گھوڑوں سے اترے۔ رات اندھیری تھی کیونکہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے آگ جلا لی۔ پھر انہوں نے بیٹھکر کھانا کھایا۔ حسب معمول دو بھائی سونے لیٹے اور سب سے پہلے بڑا بھائی پہرہ دینے لگا۔ پھر اس کی جگہ منجھلے بھائی نے لی۔ اس کے بعد چھوٹے بھائی کی باری آئی۔

چھوٹا بھائی کینجہ باتر دیر تک بیٹھا پہرہ دیتا رہا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس لئے کینجہ باتر کان کھولے لیکن آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی آنکھیں کھول‌کر ادھر ادھر دیکھتا اور پھر آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ ایک دفعہ جو اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ آگ بجھ گئی ہے۔

"یہ اچھا نہیں ہوا کہ آگ بجھ گئی ہے۔ اس کو پھر جلانا چاہئے" اس نے سوچا۔

یہ سوچ‌کر وہ ٹیلے پر چڑھ گیا اور ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا کہ شاید کہیں آگ جلتی ہوئی نظر آ جائے۔ اچانک اسے ایک طرف بہت دور کوئی چراغ سا ٹمٹماتا

ہوا دکھائی دیا۔ وہ فوراً ٹیلے سے اترکر گھوڑے پر چڑھا اور اسی طرف کو چل دیا۔ وہ بہت دیر تک چلتا رہا اور آخر ایک اکیلے مکان تک پہنچا۔ وہ گھوڑے سے اترا اور آہستہ آہستہ پنجوں کے بل چلتا ہوا جاکر کھڑکی سے اندر جھانکا۔ اندر روشنی تھی۔ کمرے کے بیچوں بیچ چولھے پر دیگ میں کھانا پک رہا تھا اور اس کے گرد کوئی بیس آدمی بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان سب کے چہرے خوفناک تھے اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ لوگ کوئی سازش کئے بیٹھے ہیں۔

"یہ تو ڈاکوؤں کا اڈا معلوم ہوتا ہے" کینجہ باتر نے سوچا۔ "ان کو یوں ہی چھوڑکر چلا جاؤں تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ کسی ایماندار آدمی کے لئے ایسا کرنا مناسب نہیں ہے۔ چلو، چالاکی سے کام لوں۔ ان کے بیچ رہ‌کر ان کی چال ڈھال معلوم کر لوں۔ ایسا کروں کہ ان کو مجھ پر اعتبار ہو جائے اور میں موقع دیکھ‌کر اپنا کام کر جاؤں۔"

یہ طے کرکے اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اچانک ایک اجنبی آدمی کو اس طرح اندر آتے دیکھ‌کر ڈاکو چونک اٹھے اور اپنے ہتھیار سنبھال لئے۔ کینجہ باتر نے ڈاکوؤں کے سردار سے مخاطب ہوکر کہا:

"حضور! میں آپ کا ایک حقیر سا غلام ہوں۔ دور دراز کے ایک شہر سے آیا ہوں۔ اب تک میں چھوٹے موٹے دھندے کرتا رہا ہوں۔ لیکن بہت دنوں سے میرا ارادہ تھا کہ کسی گروہ میں شامل ہو جاؤں۔ آپ کے جیسے کسی گروہ میں۔ اب اچانک مجھے حضور کا پتہ لگ گیا اور میں یہاں چلا آیا ہوں۔ اب آپ ہی کا آسرا ہے۔ از راہ کرم مجھے اپنے گروہ میں شامل کر لیجئے۔ حضور! آپ میری جوانی پر نہ جائیے گا۔ میں بہت سے گر جانتا ہوں۔ مجھے سرنگیں کھودنا، ٹوہ لگانا، چپکے سے ادھر ادھر کی باتیں معلوم کرنا آتا ہے۔ میں ضرور آپ کے کام آؤں گا۔"

کینجہ باتر نے اس صفائی سے سوانگ بھرا کہ ڈاکوؤں کے سردار نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا اور کہا:

"تم نے بہت اچھا کیا کہ آئے۔ آؤ، بیٹھو۔"

کینجہ باتر نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے جھک‌کر سلام کیا اور آگ کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔

کھانا تیار ہو گیا۔ سب نے کھانا کھایا۔

اس رات ڈاکوؤں نے بادشاہ کا خزانہ لوٹنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ چنانچہ کھانے

کے بعد وہ سب گھوڑوں پر چڑھکر شاہی محل کی طرف روانہ ہو گئے۔ کینجہ باتر بھی ان کے ساتھ چلا۔ تھوڑی دیر میں وہ بادشاہ کے باغ کے سامنے پہنچ گئے اور آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ محل میں کس طرح گھسا جائے۔ آخر انہوں نے طے کیا کہ سب سے پہلے کینجہ باتر دیوار پر سے باغ میں اترےگا اور چپکے سے یہ پتہ لگائےگا کہ پہریدار سو رہے یا جاگ رہے ہیں۔ اگر وہ سو رہے ہوں‌گے تو باقی سب ڈاکو ایک ایک کرکے باغ میں اترکے ایک ساتھ محل میں گھس جائیں گے۔

ڈاکوؤں کی مدد سے کینجہ باتر باغ کی اونچی دیوار پر چڑھا اور وہاں سے چھلانگ لگاکر نیچے باغ میں اتر گیا۔ تھوڑی دیر باغ کے اندر گھوم پھرکر اس نے معلوم کیا کہ پہریدار سب غفلت کی نیند سو رہے ہیں۔ باغ کے اندر ایک طرف دو بڑے بڑے پہیوں‌والی ایک اونچی گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ کینجہ باتر اس کو کھینچتا ہوا لایا اور دیوار کے پاس کھڑا کر دیا پھر اس پر چڑھکر ساتھیوں کو اطلاع دی کہ بہت اچھا موقع ہے۔

اپنے سردار کے اشارے پر ڈاکو ایک ایک کرکے دیوار پر چڑھنے لگے۔ پہلے ڈاکو نے جونہی اپنا پیٹ دیوار پر رکھکر سر باغ کی طرف جھکایا کینجہ باتر نے اس کی گردن پر تلوار ماری۔ اس کا سر کٹ کر باغ میں گر پڑا اور باتر نے اس کے مردہ جسم کو کھینچکر باغ میں گرا دیا۔ باقی سب ڈاکوؤں کا بھی یہی حشر ہوا۔ پھر کینجہ باتر محل کی طرف روانہ ہوا۔

وہ احتیاط سے چلتا ہوا سوئے ہوئے چوکیداروں کے پاس سے گزرکر ایک بڑے ہال میں داخل ہوا۔ ہال میں تین طرف تین دروازے تھے۔ یہاں بھی دس لڑکیاں پہرے پر تعینات تھیں۔ لیکن وہ بھی سب کی سب سوئی پڑی تھیں۔ کینجہ باتر چپکے سے تین دروازوں میں سے ایک میں داخل ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک بہت ہی سجا سجایا کمرہ ہے۔ دیواروں پر ریشم کے پردے لگے ہیں جن پر سرخ رنگ کے خوبصورت گلاب کے پھول کڑھے ہوئے ہیں۔ کمرے کے بیچ میں چاندی کے پلنگ پر ایک نہایت خوبصورت لڑکی سفید چادر میں لپٹی سو رہی ہے۔ وہ اتنی حسین ہے کہ دنیا کا کوئی بھی پھول مقابلہ نہیں کر سکتا۔

کینجہ باتر دبے پاؤں چلتا ہوا اس حسینہ کے پاس آیا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی سے سونے کی انگوٹھی آہستہ سے اتارکر اپنی جیب میں ڈالی اور پھر واپس ہال میں آ گیا۔

"اب آؤ، دوسرے کمرے کا معائنہ کر لیں- دیکھیں، وہاں کیا کیا راز ھیں" اس نے اپنے آپ سے کہا-

یہ سوچ کر وہ دوسرے کمرے میں داخل ھوا- یہ کمرہ پہلےوالے کمرے سے بھی زیادہ خوبصورت اور زندہ سجا ھوا تھا- ھر طرف دیواروں پر ریشم کے پردے لٹک رہے تھے جن پر طرح طرح کی چڑیوں کی تصویریں کڑھی ھوئی تھیں- کمرے کے بیچوں بیچ چاندی کے پلنگ پر ایک لڑکی سو رھی تھی جس کے حسن پر سورج اور چاند میں برابر بحث چل رھی تھی- سورج کہتا تھا کہ اس نے اپنا حسن مجھ سے لیا ھے اور چاند کہتا تھا کہ مجھ سے لیا ھے- اس کے پلنگ کے ارد گرد کوئی نو دس کنیزیں نیند میں ڈوبی پڑی تھیں-

کینجہ باتر نے آھستہ سے جاکر پلنگ پر سوئی ھوئی حسینہ کی انگلی سے انگوٹھی اتارکر اپنی جیب میں رکھی اور پھر واپس ھال میں آ گیا- اب وہ تیسرے کمرے کی طرف بڑھا-

تیسرے کمرے کی آرائش و زیبائش پہلےوالے دونوں کمروں سے بھی بڑھ کر تھی- اس کی دیواریں ھلکے ھلکے گلابی رنگ کے ریشم سے سجی ھوئی تھیں- کمرے کے ایک پلنگ پر سولہ کنیزوں سے گھری ھوئی ایک حسینہ سو رھی تھی- اس کا حسن ایسا تھا کہ ستاروں کی ملکہ ستارۂ سحر زھرہ بھی اس کی غلامی کرتی- کینجہ باتر نے آھستہ سے لڑکی کے دائیں کان کی بالی اتار لی اور کمرے سے نکل آیا- وہ محل سے نکلا، باغ سے ھوکر، دیوار کو پھاندکر باھر آ گیا اور گھوڑے پر چڑھ کر واپس اپنے اڈے کی طرف چلا- وھاں پہنچا تو اس کے بھائی ابھی سو رہے تھے- کینجہ باتر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور اپنی تلوار سے کھیلتا ھوا صبح ھونے کا انتظار کرنے لگا-

پو پھٹی- دنیا پر سے رات کا سیاہ پردہ اٹھ گیا- تینوں بھائیوں نے بیٹھ کر ناشتہ کیا- ناشتے کے بعد وہ اپنے گھوڑوں پر زین کس کر ان پر سوار ھوئے اور آگے چل پڑے- کچھ دیر چل کر تینوں بہادر ایک شہر میں پہنچے اور ایک کارواں سرائے میں جاکر اترے- انھوں نے چھپر کے نیچے اپنے گھوڑوں کو باندھ دیا اور چائےخانے کی طرف چلے- وھاں وہ چائے پیتے ھوئے آرام کرنے لگے- اتنے میں سڑک پر ایک ڈھنڈورچی نمودار ھوا اور اونچی آواز سے اعلان کرنے لگا:

"اے شہر کے باشندو! کان کھول کر سن لو- آج رات بادشاہ سلامت کے محل میں ایک عجیب و غریب واقعہ ھوا ھے- محل کے باغ میں کسی نے بیس ڈاکوؤں کے سر قلم

کر دئے ہیں— اور شہزادیوں کی ایک ایک سونے کی چیز غائب ہو گئی ہے— بادشاہ سلامت نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ شہر کے تمام باشندے چاہے وہ بڑے ہوں یا چھوٹے، اس راز کو کھولنے میں ہاتھ بٹائیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کونسا بہادر ہے جس نے یہ انوکھا کارنامہ انجام دیا ہے— جس کسی کے ہاں دوسرے شہروں اور ملکوں سے آئے ہوئے اجنبی ٹھہرے ہوں وہ ان کو فوراً دربار میں حاضر کرے—"

چنانچہ کارواں سرائے کے مالک نے اپنے مہمانوں سے کہا کہ وہ جلدی سے دربار میں پہنچ جائیں— تینوں بھائی اٹھے اور شاہی دربار کی راہ لی— بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ تین اجنبی آئے ہیں تو بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کو ایک الگ کمرے میں ٹھہرایا جائے اور اپنے وزیر سے کہا کہ تم ان سے بات کرکے راز معلوم کرو—

وزیر نے کہا:

"سیدھے طریقے سے پوچھا جائے تو ممکن ہے، وہ کچھ نہ بتائیں— بہتر ہوگا کہ انہیں اکیلا ہی چھوڑ دیا جائے اور چھپ کر ان کی گفتگو سنی جائے—"

ایسا ہی کیا گیا— تینوں بھائیوں کے سامنے دسترخوان بچھاکر کھانے کی طرح طرح چیزیں چن دی گئیں— تینوں نوجوان کھانا کھانے لگے اور ساتھ کے کمرے میں بادشاہ اور وزیر بیٹھے ان کی باتیں سننے لگے—

تونغیچ باتر نے کہا:

"ہمیں ایک نوعمر بھیڑ کا گوشت کھانے کو دیا گیا ہے— لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس بھیڑ کو کسی کتیا نے اپنا دودھ پلایا تھا—"

"ہاں، آپ کی بات صحیح ہے" اورتنچہ باتر نے کہا— "بادشاہ لوگ کتے کا گوشت کھانے سے بھی گریز نہیں کرتے— مجھے تو اس بات پر تعجب ہو رہا ہے کہ انگور کے اس مربے سے انسان کی بو کیسے آ رہی ہے—"

کینجہ باتر نے بھی مربے کو چکھکر دیکھا اور کہا:

"ہاں سچ ہے— بادشاہ سب خونخوار ہوتے ہیں— مربے میں بھی آدمی کا خون ملا ہوا ہو تو تعجب کی کوئی بات نہیں— میں بھی ایک بات پر حیران ہوں— طشتری میں روٹیاں اس سلیقے سے ایک ماہر نانبائی ہی چن سکتا ہے—"

"ہاں ایسا ہی ہوگا" تونغیچ باتر نے کہا— "ہم کو یہاں اس لئے بلایا گیا ہے کہ ہم سے محل میں ہونےوالے واقعے کا راز معلوم کیا جائے— ہم سے ضرور پوچھ گچھ کی جائے گی— ہم ان کو کیا جواب دیں گے؟"

"ہمیں جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں" اورتنچہ باتر نے رائے دی– "ہم ان سے سچی بات کہہ دیں گے–"

"ہاں، اب یہی وقت ہے کہ تین دنوں کے سفر میں ہم پر جو کچھ گزرا ہے وہ ہم ایک دوسرے کو کہہ سنائیں" کینجہ باتر نے کہا–

چنانچہ تینوں بھائیوں نے اپنا اپنا قصہ سنانا شروع کیا– سب سے پہلے تونغیچ باتر نے اپنی آپ بیتی سنائی کہ کس طرح اس نے شیر سے لڑکر اس کو مار ڈالا اور ثبوت کے طور پر اس نے شیر کی کھال میں سے جو پٹا کاٹ کر اپنی کمر کے گرد باندھ لیا تھا اسے کھول کر اپنے بھائیوں کے سامنے رکھ دیا–

پھر اورتنچہ باتر نے اپنی سرگزشت بیان کی اور سانپ کی کھال میں سے کاٹا ہوا پٹا اپنی کمر سے کھول کر بھائیوں کو دکھایا– اب کینجہ باتر کی باری آئی– اس نے تیسری رات والا سارا واقعہ کہہ سنایا اور ان چیزوں کو اپنی جیب سے نکال کر دکھایا جنھیں وہ محل سے لیتا گیا تھا–

بادشاہ اور وزیر پر سارا راز کھل گیا– لیکن بھائیوں نے گوشت، مربے اور روٹیوں کے بارے میں جو باتیں کہی تھیں وہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں– چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے چرواہے کو بلا بھیجا جو فوراً حاضر ہوا–

"سچ سچ بتا!" بادشاہ نے بڑے رعب سے چرواہے سے کہا– "تو نے کل جس بھیڑ کا گوشت بھیجا تھا کیا اس کو کسی کتیا نے دودھ پلایا تھا؟"

"جہاں پناہ!" چرواہے نے گڑگڑاتے ہوئے کہا– "آپ میری جان بخش دیں تو عرض کروں–"

"بخش دی تیری جان– سچ سچ بتا–"

چرواہا بولا:

"جاڑوں میں میری ایک بھیڑ جس کے ابھی کچھ دن پہلے میمنا ہوا تھا سردی سے مر گئی– مجھے میمنے پر رحم آ گیا اور میں نے اسے ایک کتیا کو سونپ دیا– اس کتیا ہی نے اپنا دودھ پلاکر اس کو پالا– کل میں نے اسی بھیڑ کو کاٹ کر اس کا گوشت آپ کے لئے بھیج دیا تھا کیونکہ میرے پاس وہی ایک بھیڑ رہ گئی تھی– باقی سب کو آپ کے نوکر پہلے ہی لے جا چکے تھے–"

اب بادشاہ نے مالی کو بلوایا– جب وہ حاضر ہوا تو بادشاہ نے رعب سے پوچھا:

"سچ سچ بتا! کیا انگور کے مربے میں آدمی کا خون ملا ہوا تھا؟"

"حضور! ایک واقعہ ہوا تھا— اگر جان کی امان پاؤں تو وہ واقعہ بیان کروں"
مالی نے جواب دیا—
"بخش دی تیری جان میں نے— سنا، کیا ہوا تھا؟" بادشاہ نے کہا—
مالی بولا:
"پچھلے سال گرمیوں کی بات ہے— میں نے آپ کے لئے سب سے اچھے انگور بچا رکھے تھے— نہ جانے کون روز رات کے وقت آکر ان کو چراکر لے جانے لگا— میں انگور کی بیلوں کے نیچے چھپ کر چور کا انتظار کرنے لگا— اچانک ایک آدمی آتا ہوا دکھائی دیا— جب وہ قریب آیا تو میں نے لاٹھی کھینچ کر اس کے سر پر ماری— چور وہیں مر گیا— میں نے انگور کی بیلوں کے نیچے ہی ایک گڑھا کھودکر مردے کو اس میں گاڑ دیا— اگلے سال انگور کی بیلیں اس طرح پروان چڑھیں اور ان پر اتنا انگور لگا کہ خدا کی پناہ! پتوں سے زیادہ انگور کے گچھے تھے— لیکن اس کے مزے میں ذرا سا فرق تھا— اس لئے میں نے تازے انگور آپ کو نہ بھیج کر ان کا مربا بنوا لیا—"

اس طرح بھائیوں کی کہی ہوئی دو باتیں سچ ثابت ہوئیں— رہی تیسری روٹیوں والی بات تو وہ بھی بالکل صحیح تھی— طشتری پر روٹیاں خود بادشاہ نے اپنے ہاتھوں سے چنی تھیں— معلوم ہوا کہ اس کا باپ نانبائی تھا—

بادشاہ بھائیوں کے پاس کمرے میں گیا، ان سے سلام علیک کیا اور پھر کہا:
"تم نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ نکلا ہے— اس وجہ سے تم لوگ مجھے اور بھی پسند آ گئے ہو— اب میرے معزز بہادر مہمانو! میری تم لوگوں سے ایک گزارش ہے—"
"فرمائیے" بھائیوں نے کہا— "آپ کی فرمائش اگر مناسب ہوگی تو ہم اس کو ضرور پورا کریں گے—"
بادشاہ بولا:
"میرے تین بیٹیاں ہیں اور بیٹا کوئی نہیں ہے— تم لوگ یہیں رہ جاؤ— میں اپنی بیٹیوں کی تم لوگوں سے شادی کر دوں گا— سارے شہر کو دعوت دوں گا— چالیس دنوں تک سب کو پلاؤ کھلاتا رہوں گا—"
"آپ کی یہ بات تو بہت اچھی ہے" تونغیچ باتر نے جواب دیا— "لیکن ہم آپ کی بیٹیوں سے شادی کیسے کر سکتے ہیں؟ ہم نہ تو بادشاہ زادے ہیں اور نہ ہی ہمارے باپ کوئی امیر آدمی ہیں— آپ نے اپنی دولت بادشاہت سے کمائی ہے— اور ہم نے محنت کرنا سیکھا ہے—"

بادشاہ اصرار کرنے لگا:

"یہ ٹھیک ہے کہ میں پورے ایک ملک کا فرماں‌روا ہوں۔ اور تمہارے باپ نے تم لوگوں کو اپنی محنت کی کمائی سے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ مگر وہ ایسے بہادر بیٹوں کا باپ تو ہے۔ پھر وہ کس بات میں مجھ سے کم ہے؟ اصل میں وہ تو مجھ سے زیادہ دولتمند ہے۔ اسی لئے تو میں جوکہ ایسی لڑکیوں کا باپ ہوں جن کے آگے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ سر جھکا چکے ہیں، منتیں کر چکے ہیں، تم لوگوں سے یہ پیشکش کر رہا ہوں کہ میری بیٹیوں سے شادی کر لو۔"

تینوں بھائی راضی ہو گئے۔ بادشاہ نے بڑی دھوم دھام سے اپنی تینوں بیٹیوں کی ان تینوں بھائیوں سے شادی کر دی۔ سارے شہر میں خوشیاں منائی گئیں۔ سارے شہر نے دعوتیں کھائیں اور یہ سلسلہ چالیس دنوں تک چلتا رہا۔ تینوں بھائی اپنی بیویوں کے ساتھ شاہی محل میں رہنے لگے۔ بادشاہ اپنے دامادوں سے بہت خوش تھا۔ کینجہ باتر سے اس کو سب سے زیادہ محبت تھی۔

ایک دن بادشاہ اپنے باغ میں نالے کے کنارے ایک ٹھنڈی جگہ پر سو رہا تھا۔ کینجہ باتر بھی پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اور کوئی نہیں تھا۔ اچانک نالے سے ایک زہریلا سانپ نکل آیا جو بادشاہ کو کاٹنے ہی والا تھا کہ کینجہ باتر نے اس کو دیکھ لیا اور اپنی تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دئے۔ وہ ابھی تلوار کو غلاف میں ڈال ہی رہا تھا کہ بادشاہ کی آنکھ کھل گئی۔ کینجہ باتر کو اس حالت میں دیکھکر اس کے دل میں شبہہ پیدا ہوا۔ اس نے دل ہی میں سوچا:

"میری بیٹی سے شادی کرکے اس کی ناک اور بھی چڑھ گئی ہے، یہ اور بھی لالچی ہو گیا ہے۔ یہ تو اب مجھ کو مارکر خود بادشاہ بننا چاھتا ہے۔"

بادشاہ اٹھکر اپنے وزیر کے پاس گیا اور واقعہ اس کو سنا دیا۔ وزیر بہت دنوں سے بہادر بھائیوں سے جلا بیٹھا تھا۔ بس موقعے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب موقع پاکر اس نے بادشاہ سے ان کی خوب جی بھرکر برائی کی۔

"میری رائے لئے بغیر آپ نے ان لفنگوں سے اپنی پیاری بیٹیوں کی شادی کر دی" وزیر نے کہا۔ "اور یہ لیجئے، آپ کا عزیز داماد آپ کو قتل کرنا چاھتا تھا۔ یہ مکاری سے کسی نہ کسی دن آپ کا خاتمہ ہی کر دے گا۔ دیکھ لیجئے گا۔"

بادشاہ وزیر کی باتوں میں آ گیا اور اس نے حکم دیا کہ کینجہ باتر کو جیل میں ڈال دیا جائے۔ اس کو پکڑکر جیل میں بند کر دیا گیا۔

کینجه باتر کی بیوی، سب سے چھوٹی شہزادی بہت اداس ہوگئی— دن دن بھر روتے روتے اس کے رخساروں کی سرخی غائب ہو گئی— ایک دن وہ اپنے باپ کے پاس آئی اور اس کے قدموں میں گرکر کہنے لگی که اپنے داماد کو رہا کر دیجئے—"

تب بادشاہ نے حکم دیا که کینجه باتر کو جیل سے نکال کر لایا جائے— اس کو بادشاہ کے سامنے حاضر کیا گیا تو بادشاہ نے اس سے مخاطب ہوکر کہا:

"میں نے سوچا بھی نہیں تھا که تم اتنے مکار ہوگے— تم نے مجھ کو مار ڈالنے کا اراده کیسے کر لیا تھا؟"

اس کے جواب میں کینجه باتر نے بادشاہ کو طوطے کا قصه سنایا—

## طوطے کا قصه

کسی زمانے میں کسی جگه ایک بادشاہ رہتا تھا— اس کے ایک طوطا تھا— بادشاہ اپنے طوطے سے اتنا پیار کرتا تھا که طوطے کے بغیر اسے پل بھر کو بھی چین نہیں آتا تھا— طوطا اپنے مالک سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا اور اس کا دل بہلاتا رہتا تھا— ایک دن اس نے بادشاہ سے کہا:

"میں اپنے وطن ہندوستان میں اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کو چھوڑکر آیا ہوں— میں بہت دنوں سے قید میں ہوں— اب میں آپ سے گزارش کرتا ہوں که مجھے بیس دن کی چھٹی دیجئے— میں اپنے وطن ہو آؤں— چھے دن جانے میں لگیں گے، چھے دن لوٹنے میں اور آٹھ دن میں اپنے گھروالوں - اپنے ماں باپ، بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ رہوں گا—"

"نہیں، میں تم کو جانے نہیں دوں گا" بادشاہ نے کہا— "تم ایک بار چلے جاؤگے پھر لوٹ کر نہیں آؤگے اور میرا دل اچاٹ ہو جائے گا—"

"جہان پناہ! میں وعده کرتا ہوں که لوٹ آؤں گا— آپ میری بات کا یقین مانئے—"

بادشاہ راضی ہو گیا اور اس نے کہا:

"اچھی بات ہے— میں تم کو چھٹی دیتا ہوں مگر صرف دو ہفتوں کی—"

"یوں ہی سہی" طوطے نے کہا— "میں کسی طرح دو ہفتوں میں واپس آ جاؤں گا—"

بادشاہ نے پنجره کھول دیا— طوطا پھر سے اڑکر پنجرے سے نکلا اور دیوار پر جا

بیٹھا— اس نے سب لوگوں کو الوداع کہا اور جنوب کی طرف اڑ چلا— بادشاہ پیچھے سے اس کو دیکھتا رہ گیا— اس کو یقین تھا کہ اب طوطا لوٹ کر نہیں آئے گا—

طوطا چھے دنوں میں اپنے وطن ہندوستان پہنچ گیا اور کسی طرح اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیا— بیچارہ اتنا خوش تھا کہ کچھ نہ پوچھئے— ادھر ادھر اڑتا پھرتا، پھدکتا رھتا، قلابازیاں کھاتا، چیختا چلاتا، جنگل کی ہریالی میں جی بھرکر نہاتا— وہ کتنے ھی عزیزوں، رشتےداروں اور دوستوں کے ھاں مہمان بنا— اس کو پتہ بھی نہ چل پایا کہ کس طرح دو دن گزر گئے اور پھر دوبارہ قید میں جانے کا وقت آ گیا— بیچارے طوطے کا اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں سے دوبارہ جدا ہونے کو جی نہیں چاھتا تھا— خوشی کے دن پلک جھپکتے میں گزر گئے تھے اور اداسی کے پہاڑ جیسے دن شروع ہو رہے تھے— اس کے سب رشتےدار اور دوست احباب جمع ہو گئے— ان سب کو طوطے پر بہت رحم آ رہا تھا— سب اس کو یہی سمجھا رہے تھے کہ اب ادھر لوٹ کر مت جاؤ—لیکن طوطے نے کہا:

"نہیں— ایسا نہیں ہو سکتا— میں وعدہ کر چکا ہوں— وعدہ خلافی کیسے کروں؟"

"ارے تم بھی کیا باتیں کرتے ہو" ایک طوطے نے کہا— "بھلا تم نے کبھی کسی بادشاہ کو اپنا وعدہ پورا کرتے سنا ھے؟ تمہارا بادشاہ اگر انصاف والا ہوتا تو وہ تم کو چودہ سال تک قید میں رکھنے کے بعد کیا صرف دو ھی ھفتوں کی چھٹی دیتا؟ کیا تم اس دنیا میں اسی لئے آئے ہو کہ قید میں رہو— کسی کا دل بہلانے کی خاطر اپنی آزادی کو ھاتھ سے نہ جانے دو— بادشاہ کی نیکیاں کم اور برائیاں زیادہ ھیں— بادشاہ کے اور شیر کے قریب رھنا حماقت بھی ھے اور خطرناک بھی—"

لیکن طوطے نے کسی کی بات نہ مانی اور لوٹنے کے لئے تیار ہو گیا— تب اس کی ماں نے اس سے کہا:

"تم نے جو لوٹنے کی ٹھان ھی لی ھے تو میری ایک بات سنو— ھمارے یہاں ایک قسم کے پھل ہوتے ھیں — امرت کے پھل— کوئی بوڑھا ان کو کھائے گا تو ایک دم جوان ہو جائے گا— تم ان پھلوں میں سے کچھ لے جاکر اپنے بادشاہ کو دینا اور اس سے گزارش کرنا کہ تم کو قید سے آزاد کر دے— ممکن ھے، اس کے دل میں انصاف جاگ اٹھے اور وہ تم کو آزاد کر دے—"

سبھوں نے اس کی ھاں میں ھاں ملائی— کچھ طوطے فوراً جاکر امرت کے چھوٹے چھوٹے تین پھل توڑ لائے— طوطے نے ان پھلوں کو لے لیا اور سب کو الوداع کہہ کر

شمال کی طرف اڑ چلا- اس کے سب عزیز اور دوست پرامید نگاہوں سے پیچھے سے اس کو دیکھتے رہ گئے-

چھے دنوں میں وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا- اس نے اپنے لائے ہوئے پھل بادشاہ کو دئے اور ان کی خاصیت بتائی- بادشاہ بہت خوش ہوا اور طوطے کو آزاد کر دینے کا وعدہ کر لیا- اس نے امرت کا ایک پھل اپنی بیوی کو دے دیا اور باقی دو خود کھانے کی غرض سے ایک پیالی میں اپنے پاس رکھ لئے-

ادھر لالچ اور غصے سے وزیر کا دل ڈاواں ڈول ہو اٹھا اور اس نے پلٹرا پلٹانے کی غرض سے جلدی سے کہا:

"بادشاہ عالم! آپ یہ پھل ابھی نہ کھائیے- پہلے ان کو آزماکر دیکھیں- اگر یہ اچھے پابت ہوں گے تو آپ ان کو کھا لیجئے گا- ذرا دیر سے کھانے میں کوئی ہرج نہیں-"

وزیر کی بات بادشاہ کو پسند آئی- وزیر نے بادشاہ کی آنکھ بچاکر پھلوں میں زوداثر زہر ملا دیا- پھر ان کو آزمایا گیا- دو موروں کو لاکر ان سے یہ پھل چکوائے گئے- مور وہیں گرکر ٹھنڈے ہو گئے-

"دیکھا آپ نے؟" وزیر نے کہا- "ان کو اگر آپ نے کھا لیا ہوتا تو آپ کا کیا حال ہوتا؟"

"بس میں بھی مر جاتا" بادشاہ نے بڑے ہیجان کے عالم میں جواب دیا- اس نے فوراً طوطے کو پنجرے سے نکالا اور اس کی گردن مروڑ دی- بیچارے طوطے کو بادشاہ سے یہی انعام ملا-

اس واقعے کے بعد کچھ دن گزر گئے- ایک دن بادشاہ کو ایک بوڑھے پر غصہ آیا اور اس نے بوڑھے کو موت کی سزا سنا دی- امرت کا جو ایک پھل بچا ہوا تھا اس کو بادشاہ کے حکم پر بوڑھے کو کھلایا گیا- بس پھر کیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھے کے سر پر از سر نو کالے کالے بال اگ آئے- منہ میں نئے دانت نکل آئے، آنکھوں میں جوانی کی چمک پیدا ہو گئی اور ستر سال کا بوڑھا ایک‌دم بیس سال کا نوجوان بن گیا- اب بادشاہ کو پتہ چلا کہ اس نے ناحق طوطے کی جان لی تھی- لیکن اب پچھتانے سے کیا ہو سکتا تھا-

یہ قصہ ختم کرکے کینجہ باتر نے بادشاہ سے کہا:

"اب میں آپ کو وہ واقعہ سناتا ہوں جو اس وقت ہوا تھا جب آپ سو رہے تھے-"

یہ کہہ کر وہ باغ میں گیا اور جس سانپ کے اس نے تلوار سے دو ٹکڑے کر دئے تھے اس کے دونوں ٹکڑے اٹھا لایا۔ بادشاہ اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوا اور کینجہ باتر سے معافی مانگنے لگا۔

کینجہ باتر نے بادشاہ سے کہا:

"حضور! ہم بھائیوں کو اجازت دیجئے کہ ہم اپنے وطن، اپنے گھر چلے جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے ساتھ نیکی اور امن و آشتی سے رہا نہیں جا سکتا۔"

بادشاہ نے بہت منتیں کیں، بہت ہاتھ جوڑے کہ مت جاؤ لیکن تینوں بھائی راضی نہ ہوئے۔

"ہم درباری بن کر شاہی محل میں نہیں رہ سکتے" انہوں نے کہا۔ "ہم تو اپنی محنت کے بل بوتے پر جئیں گے۔"

"تب پھر میری بیٹیاں تمہارے ساتھ نہیں جائیں گی۔ یہ اپنے گھر رہیں گی" بادشاہ نے کہا۔

لیکن شہزادیاں ایک آواز میں بول اٹھیں:

"نہیں، ہم اپنے شوہروں سے جدا نہیں ہوں گی۔"

یہ سن کر بادشاہ ہکا بکا رہ گیا اور اس نے با دل نخواستہ ان سب کو جانے کی اجازت دے دی۔

تینوں بہادر جوان اپنی بیویوں کے ساتھ اپنے آبائی گھر لوٹ آئے اور اپنی قوت بازو سے محنت مزدوری کرتے ہوئے بڑے آرام اور سکون سے زندگی بسر کرنے لگے۔

# آفتابی سرزمین کا بہادر

کسی زمانے میں ایک جگہ ایک بوڑھا آدمی رہتا تھا۔ اس کے رستم نام کا ایک چھوٹا سا لڑکا تھا اور بیوی مر چکی تھی۔ یہ بوڑھا بہت ہی غریب تھا۔ باپ بیٹا دونوں چیتھڑوں میں لپٹے رہتے اور اکثر فاقے کرتے تھے۔ ایک دن بوڑھا اپنے نوعمر بیٹے کے ساتھ سلیم بائے نام کے اپنے ایک امیر ہمسایے کے دروازے پر گیا اور روتے ہوئے اس سے کہا:

"مالک! از راہ کرم ہماری کچھ مدد کیجئے۔ ہم دونوں آپ کا ہر حکم بجا لانے کے لئے تیار ہیں۔ ہم پر رحم کیجئے۔"

امیر سلیم بائے نے بوڑھے کو گھور کر دیکھا اور کہا:

"میرے گھر میں مفت کی روٹی نہیں ہے۔ تم پہلے اپنا قرض چکا دو۔ آج نہیں تو کل مر جاؤگے پھر آخر تمہارا قرض کون چکائے گا؟ تمہارے لڑکے کو تو کوئی پوچھے گا ہی نہیں۔"

قرض کی بات سن کر بوڑھے کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ تھرتھر کانپتے ہوئے اس نے امیر سے پوچھا:

"مالک! آپ کون سے قرض کی بات کر رہے ہیں؟ آپ نے مجھے کبھی کچھ دیا ہی کہاں تھا!"

سلیم بائے نے اپنی آنکھیں چمکاتے ہوئے کڑک کر کہا:

"چپ رہو! بےشرم کہیں کے! کیا تم نے مجھے دھوکا دینے کی سوچی ہے؟"

یہ کہہ کر وہ بوڑھے کو چابک سے مارنے لگا۔ بوڑھا بیدم ہوکر گر پڑا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ بچہ حیران و پریشان ہوکر باپ سے لپٹ گیا اور سسک سسک کر رونے لگا۔ بوڑھے کے حواس جب ذرا درست ہوئے تو اس نے گڑگڑاتے ہوئے امیر سے کہا:

"حضور! از راہ کرم ذرا اپنی بات مجھے سمجھائیے تو۔ اگر میں کچھ بھول

بیٹھا ہوں تو یاد دلا دیجئے- میرے اوپر آپ کا کون سا قرض باقی ہے؟ آخر میں نے آپ سے کیا اور کب لیا تھا؟"

سلیم بائے نے بچے کو باپ سے الگ کرکے ایک طرف ڈھکیل دیا اور بوڑھے کو گریبان سے پکڑکر دانت پیستے ہوئے کہا:

"اچھا لو سنو، بدمعاش! جب تمہاری بیوی مری تھی تو غسال کو پیسے کس نے دئے تھے؟ میں نے ھی تو دئے تھے- جب تمہاری بیوی کا جنازہ اٹھا تھا تو محلے کے بڑے بوڑھوں کو تم قبرستان کس کی گاڑی پر لے گئے تھے؟ میری گاڑی پر کہ نہیں؟ تمہاری بیوی کے فاتحے پر محلےوالوں کی دعوت کس نے کی تھی؟ سو آدمیوں کو پلاؤ کس نے کھلایا تھا؟ یہ سب تم بھول گئے؟ اور خود تم دونوں نے بھی کیا ڈٹ کر پلاؤ نہیں کھایا تھا؟"

سلیم بائے کے اس سفید جھوٹ پر بوڑھے کو بہت غصہ آیا- اس نے دل ھی دل میں اپنے بےایمان امیر ھمسایے کو خوب گالیاں دیں لیکن منھ سے ایک لفظ نہ نکالا- بےچارہ کرتا بھی کیا- بڑھاپے اور فاقوں سے اس میں تو اپنے جسم کو سنبھالنے کی بھی طاقت نہیں رہ گئی تھی-

اتنے میں محلے کا بنا ہوا مولوی وھاں آ گیا- اس کو دیکھتے ھی سلیم بائے نے بوڑھے سے کہا:

"لو، اگر تمہیں میری بات پر یقین نہ آتا ہو تو حضور گواھی دے سکتے ھیں-"

مولوی نے خوشامدانہ لہجے میں پوچھا:

"جی، کیا بات ھے؟ حضور مجھ سے کس بات کی گواھی دلانا چاھتے ھیں؟"

"حضور! پچھلی عید کے مبارک موقعے پر جب میں نے محلےوالوں کو پلاؤ کھلایا تھا تو حضور ھی نے تو تلاوت قرآن فرماکر اس کار خیر کا سارا ثواب اپنی زبانی اس بوڑھے کی بیوی کے لئے وقف کیا تھا نا؟ میں جھوٹ تو نہیں بول رھا ھوں؟"

مولوی نے سلیم بائے کا مطلب سمجھتے ہوئے بڑی متانت سے کہا:

"جی ھاں، آپ کا کہنا بالکل صحیح ھے- ھم نے اس کار خیر کا سارا ثواب اس کی بیوی کے لئے وقف کر دیا تھا-"

"سنا تم نے؟ اب یقین آیا؟" سلیم بائے نے بوڑھے سے کہا- "پڑوسی ہونے کے ناطے میں نے تم پر ترس کھاکے تمہاری مدد کی، اپنے پیسے خرچ کئے- اور تم بےایمان میرے احسان سے منکر رھے ھو-"

مولوی نے سلیم بائے کی ھاں میں ھاں ملاتے ھوئے نصیحت کے انداز میں بوڑھے سے کہا:

"واہ! کیسی شرم کی بات ھے! تمہیں اس طرح کی گستاخی نہیں کرنا چاھئے- تمہیں ان کا شکرگزار ھونا چاھئے- تم عیدوالی اس دعوت کے تمام اخراجات اپنے اوپر لے لو-"

بوڑھے نے اپنے بچے کو ترس بھری نگاھوں سے دیکھتے اور اس کے سر پر ھاتھ پھیرتے ھوئے رو روکر کہا:

"میرے بدنصیب بچے! میں تو بوڑھا ھو چکا ھوں- آج نہیں تو کل اس دنیا سے جانے والا ھوں- لیکن اب تمہارا کیا حال ھوگا- ھم تو یوں ھی روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے ترستے ھیں، فاقوں سے کسی طرح نجات نہیں مل پاتی- اوپر سے اب ڈھیر سارا قرض ھمارے گلے پڑ گیا ھے-"

مولوی نے بوڑھے کو غصے سے گھورتے ھوئے کہا:

"ارے بیوقوف! تم روتے کیوں ھو؟ مالک تم سے یہ تو نہیں کہہ رھے ھیں کہ میرا قرض ابھی اسی دم چکا دو- جب پیسے آئیں تب ھی دینا- ابھی تو بس اتنا ھی کافی ھے کہ تم اپنا قرض تسلیم کر لو- کچھ دنوں میں تمہارا لڑکا بڑا ھو جائے گا، کوئی ھنر اپنا لے گا اور پیسے کمانے لگے گا- تب ھی چکا دینا یہ قرض-"

بوڑھے کو مجبوراً کہنا پڑا:

"اچھی بات ھے-"

لیکن مولوی نے کہا:

"نہیں- تمہارے "اچھی بات ھے" کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا- تم مالک سے سن لو کہ تمہارے اوپر کتنی رقم آتی ھے اور اچھی طرح یاد کر لو-"

یہ کہہ کر اس نے کاغذ قلم لیا اور امیر سے پوچھا:

"آپ ذرا یہ تو بتائیے کہ اس پر آپ کی کل کتنی رقم باقی ھے؟"

"سونے کے پندرہ سکے" سلیم بائے نے جواب دیا-

یہ سن کر بوڑھے کے اوسان خطا ھو گئے- اس نے اپنی زندگی بھر پندرہ کیا، سونے کا ایک سکہ بھی اپنے ھاتھ سے نہیں چھوا تھا- مولوی نے کاغذ پر یہ رقم لکھکر اس کے نیچے باپ بیٹے دونوں کے انگوٹھے لگوائے اور کاغذ سلیم بائے کے حوالے کر دیا-

ایک دن تین سپاھی بوڑھے کے گھر میں گھس آئے اور قرض کے عوض میں

اس کے مکان کو ضبط کر لیا۔ انہوں نے بوڑھے اور اس کے بیٹے دونوں کو ڈھکیل کر وہاں سے نکال دیا۔ بوڑھا یہ کہہ کر احتجاج کرنے لگا کہ میں نے کسی سے کچھ نہیں لیا ہے تو سپاہیوں نے اس کو دو کاغذ دکھائے۔ ان میں سے ایک وہی کاغذ تھا جس پر مولوی نے ان دونوں کے انگوٹھے لگوا لئے تھے اور دوسرا حاکم شہر کا حکم‌نامہ تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر بوڑھا اپنی مرضی سے مکان خالی نہ کرے یا ذرا بھی چوں و چرا کرے تو اس کو پکڑکر زنداں میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ بیچارہ بوڑھا اپنے بیٹے سمیت اپنے گھر سے محروم ہو گیا، اس مکان سے نکال دیا گیا جہاں وہ پیدا ہوا، پروان چڑھا اور بوڑھا ہوا تھا۔

بوڑھا اپنے روتے بلکتے ہوئے بچے کو اپنی پیٹھ پر لادے پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔

وہ چلتے چلتے ایک پہاڑ تک پہنچا اور ارچہ کے درختوں کے ایک جنگل میں آکر ٹھہر گیا۔ اس نے اپنے بچے رستم کو اپنی پیٹھ پر سے اتارا اور خود ایک درخت کے تنے سے پیٹھ لگاکر بیٹھ گیا۔ وہ بہت زیادہ تھکا ہوا تھا۔ آنکھیں بند کئے تلخ خیالوں میں غرق بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو یہ دیکھ‌کر کانپ اٹھا کہ سامنے کچھ ہی فاصلے پر ایک بڑی سی ریچھنی اور اس کا ایک بچہ دونوں اس پر جھپٹنے کے لئے تیار سے کھڑے ہیں۔ اچانک وہ دونوں بوڑھے کی طرف بڑھنے لگے۔ بوڑھا خوف کے مارے پتھرا گیا۔ نہ کہیں بھاگ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کر سکتا تھا۔ رستم تو ان عجیب و غریب ہیبت‌ناک جانوروں کو دیکھ‌کر زور سے چیخ مارکر رو پڑا۔ بوڑھا یہ سوچ‌کر کہ بچے کا کام تمام ہو گیا، بےہوش ہو گیا۔ بعد میں جب اسے ہوش آیا اور آنکھیں کھولیں تو اس نے اپنے آپ کو ایک غار کے اندر پایا۔ اس کا بیٹا رستم غائب تھا۔ ادھر ادھر دیکھا تو رستم ایک طرف ریچھنی کے بچے کے ساتھ بیٹھا شہد کھاتا نظر آیا۔ بوڑھے نے اس کو آواز دی۔ بچہ باپ کی آواز سنتے ہی اٹھ‌کر دوڑا ہوا آیا اور اس سے کہا:

"ابا! آپ جاگ گئے؟ چلئے شہد کھائیے۔"

"تمہیں اس سے ڈر نہیں لگتا؟" بوڑھے نے ریچھنی کے بچے کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں اس سے کیوں ڈروں۔ یہ تو میرا ساتھی ہے۔ اسی کی ماں تو آپ کو اٹھاکر یہاں لائی تھی اور لٹاکر ہم سے کہا تھا کہ شور مت کرو تاکہ ان کی نیند خراب

نہ ہو اور جی بھر کر سو لیں- اور پھر "میں جلد ہی لوٹ آؤں‌گی" کہہ‌کر کہیں چلی گئی تھی-"

بوڑھا بڑی حیرت سے اپنے بیٹے کا منھ تکتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی بات پر کہاں تک یقین کیا جائے کہ اتنے میں ریچھنی واپس آ گئی- وہ کہیں سے کدو کی بنی ہوئی ایک هانڈی میں دهی اور کچھ روٹیاں لے آئی تھی- اسے دیکھتے ہی بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا اور جھک‌کر سلام کیا- اریچھنی نے اپنی لائی ہوئی سب چیزیں بوڑھے کے آگے زمین پر رکھ دیں اور پھر اس سے مخاطب ہوکر کہا:

"گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے- آپ بیٹھ‌کر یہ روٹیاں دہی کے ساتھ کھا لیجئے اور پھر ہم آپ سے باتیں کریں‌گے-"

ریچھنی کا یہ احترام اور شفقت بھرا برتاؤ دیکھ‌کر بوڑھے کو بڑا تعجب ہوا- اس نے پوچھا:

"یہ ساری چیزیں تم کہاں سے لائیں؟"

"زیادہ تعجب کرنے کی بات نہیں ہے" ریچھنی نے جواب دیا- "یہاں آس پاس بہت سے چرواہے میرے دوست ہیں- یہ چیزیں میں انہی کے یہاں سے لے آئی ہوں-" پھر اس نے بوڑھے سے مخاطب ہوکر کہا:

"بابا! اب آپ مجھ کو اپنی بیٹی سمجھئے- یہ دونوں بچے ایک دوسرے کے دوست بن‌کر رہیں‌گے-"

وہ دونوں ریچھنی اور اس کے بچے کے ساتھ بڑے چین سے رہنے لگے- بوڑھا دن بھر آس پاس کے پہاڑی جنگلوں میں لکڑیاں کاٹتا- ریچنی رات کو ان لکڑیوں کو اٹھا اٹھاکر شہر کے نزدیک لے جاکے ایک جگہ رکھ دیتی اور بوڑھا ان کو وہاں سے بازار لے جاکر بیچ آتا- رستم بھی چھوٹے ریچھ کے ساتھ کھیلتا کودتا بڑا ہوتا گیا- ایک دن آس پاس کے چرواہے اس کو ریچھ کے ساتھ کشتی لڑتے ہوئے دیکھ‌کر بڑے متعجب ہوئے اور اس کی طاقت اور پھرتی کی داد دی- چار ہی پانچ برسوں کے اندر اندر رستم کی پہلوانی کی شہرت دور دور تک پھیل گئی- اس کی طاقت کی وجہ سے لوگ اس کو بھالو پہلوان کے نام سے یاد کرتے تھے-

ایک بار وہ دونوں بازار سے لکڑیاں بیچ‌کر گھر لوٹ رہے تھے تو بوڑھے نے ایک آدمی کی طرف جو عمدہ کپڑے پہنے وقار اور رعب داب کے ساتھ گھوڑے پر سوار چابک کو ہلاتا ہوا چلا جا رہا تھا، اشارہ کرتے ہوئے رستم سے کہا:

"یہ وہی سلیم بائے ہے جس نے ہمارا مکان ہم سے چھین لیا تھا–" سلیم بائے کے پیچھے پیچھے ایک ہجوم ایک اونٹ پر لدی ہوئی کسی چیز کو بڑے اشتیاق سے دیکھتا ہوا چلا جا رہا تھا– اچانک رستم کو کراہنے کی ایک آواز سنائی دی جو اسے جانی پہچانی سی لگی– رستم نے نزدیک جاکر دیکھا تو اونٹ پر ایک پنجرے کے اندر اس کا دوست ریچھنی کا بچہ پڑا کراہ رہا تھا– معلوم ہوا کہ سلیم بائے نے اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ شکار کھیلتے ہوئے ریچھنی کے بچے کو پکڑ لیا تھا اور اب اسے اپنے داماد حاکم شہر کی نذر کرنے لئے جا رہا تھا– رستم کو سخت غصہ آیا اور اس نے فوراً جاکر ان رسیوں کو توڑ ڈالا جن سے پنجرہ اونٹ پر بندھا ہوا تھا– اس نے اپنے دوست کو پنجرے سے باہر نکالا اور اس سے بغلگیر ہو گیا– سلیم بائے کے لوگ رستم پر ٹوٹ پڑے لیکن رستم نے ان سب کو اٹھا اٹھاکر پرے پھینک دیا اور ان کو دوبارہ اس کے قریب پھٹکنے کی جرأت نہ ہوئی– رستم سلیم بائے کی طرف مڑا ہی تھا کہ وہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا– رستم اپنے باپ اور ریچھ بھائی کے ساتھ اپنے ڈیرے کی طرف روانہ ہوا– جو لوگ وہاں کھڑے کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے ان سب نے رستم کی طاقت، شجاعت اور چابکدستی کی دل کھول کر داد دی– اس انوکھے واقعی نے خبریں سارے شہر میں اور آس پاس کے تمام علاقوں میں پھیل گئیں–

سلیم بائے اتنا گھبرا گیا تھا کہ اس نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا– شہر کے حاکم نے آگ بگولہ ہوکر حکم جاری کیا کہ جو پہلوان شکاریوں پر حملہ کرکے ان سے ریچھ کو چھین لے گیا ہے اس کو پکڑکر لایا جائے! لیکن کسی کو اس حکم کی تعمیل کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی– رستم کو پکڑنے کے لئے کسی کو زبردستی بھیجا جاتا تو وہ یوں ہی گھوم پھرکر واپس چلا آتا اور کہہ دیتا:

"میں نے بہت تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں ملا–"

ملک میں رستم کے نئے کارناموں کی خبریں پھیلتی گئیں– شہر کے مفلس، فاقہ کش اور مظلوم لوگ روٹی اور عافیت کی تلاش میں رستم کے پاس آنے اور یہاں لکڑھاری کرکے پیٹ پالنے لگے– ایک دن سلیم بائے کو معلوم ہو گیا کہ رستم اسی بوڑھے کا بیٹا ہے جس کو اس نے اس کے مکان سے نکلوا دیا تھا اور وہ امیروں کے یہاں سے بھاگنےوالے غریب لوگوں کو پناہ دےکر ان کی مدد کرتا ہے– یہ معلوم کرکے سلیم بائے کا خون کھول اٹھا اور اس نے فوراً ہی حاکم شہر کے پاس جاکر اس کو سارا حال سنا دیا– حاکم مارے غصے کے آپے سے باہر ہو گیا اور ایک سو بہترین گھڑسواروں

کے دستے کو ساتھ لےکر رستم کی تلاش میں پہاڑوں کی طرف چل پڑا۔ اس نے اپنے سپاہیوں میں اعلان کر دیا: "جو کوئی رستم کو زندہ پکڑ لےگا میں اس کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کرکے اس کو سو گھڑسواروں کا سردار کر دوں گا۔"

رستم کا باپ دوسرے لکڑہاروں کے ساتھ لکڑیاں بیچنے شہر گیا ہوا تھا۔ رستم ریچھنی کے بچے کے ساتھ ایک ٹیلے پر پڑا سو رہا تھا۔ اتنے میں اچانک ریچھنی بھاگتی ہوئی آئی اور رستم کو اٹھاکر ایک طرف کو لے چلی۔ رستم کی نیند کھل گئی اور یہ دیکھکر کہ ریچھنی اس کو اٹھائے لئے جا رہی ہے اس نے اس سے پوچھا:

"کیا بات ہے؟"

ریچھنی نے اس کو زمین پر رکھتے ہوئے کہا:

"دشمن تم پر حملہ کرنے والے ہیں۔ سپاہیوں کا ایک دستہ اس طرف آ رہا ہے۔ تم کو چھپ جانا چاہئے۔"

"ہم آخر کب تک اس طرح چھپتے پھریں گے۔ کیوں نہ ہم باہر جاکر دشمنوں کا کھلم کھلا سامنا کریں؟"

"وہ بہت سے ہیں اور سب گھوڑوں پر سوار ہیں۔ اور ہمارے ساتھی سب شہر گئے ہوئے ہیں" ریچھنی نے سمجھایا۔

اتنے میں چھوٹا ریچھ بھی دوڑتا ہوا وہاں آ گیا اور آکر بڑی محبت کے ساتھ رستم سے لپٹ گیا۔ ریچھنی رستم کو چھپ جانے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن رستم کسی طرح راضی نہ ہوا تو اس نے کہا:

"تب تو بہتر یہی ہے کہ ہم خود ہی دشمن پر دھاوا بول دیں۔"

چھوٹے ریچھ نے بھی اس کی تائید کی۔ اس نے بڑے جنگ‌جویانہ انداز میں اپنا سر اونچا اٹھاکر کہا:

"ہاں، اور کیا! ہمیں ان سپاہیوں کا کیا ڈر! ہم ان کے چھکے چھڑا دیں گے۔ ان کو کچل کے رکھ دیں گے۔"

اتنے میں سپاہی دکھائی دئے۔ وہ اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگاتے اور تلواریں لہراتے پہاڑ کے اوپر چڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ان کو شاید معلوم ہو گیا تھا کہ رستم کہاں چھپا ہوا ہے۔ وہ اتنے نزدیک آ گئے کہ حاکم کی چلا چلاکر اپنے سپاہیوں کو حکم دینے کی آواز اور گھوڑوں کی آوازیں رستم اور اس کے دوستوں کو صاف صاف سنائی دینے لگیں۔ تھوڑی دیر میں سپاہی اپنے گھوڑوں سے اترے اور بڑے بڑے پتھروں کی آڑ

لیتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگے۔ اب زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ رستم اور اس کے دوستوں نے دشمن پر دھاوا بول دیا اور پتھروں کو اٹھاکر ان پر پھینکنا شروع کر دیا۔ کتنے ہی سپاہی ہلاک اور کتنے ہی زخمی ہو گئے پھر بھی کچھ سپاہی اوپر چڑھ آئے۔ تینوں دوست ان کو اٹھا اٹھاکر نیچے پھینکنے لگے۔ وہ پہاڑ سے نیچے لڑھکتے چلے جاتے۔ کتنوں کے سر پھٹ گئے اور کتنوں ہی کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ سپاہیوں کی تعداد کافی کم ہو گئی پھر بھی دشمن نے ہار نہ مانی۔ بچے کھچے سپاہی ایک بار پھر اوپر رینگنے لگے۔ رستم اور اس کے دوستوں نے جتنے بڑے بڑے پتھر جمع کر رکھے تھے وہ سب ختم ہو گئے۔ یہی نہیں، اچانک یہ بھی پتہ چلا کہ ریچھنی کہیں غائب ہو گئی ہے۔ اور دشمن جو اوپر چڑھتے چلے آ رہے تھے، بالکل نزدیک آ گئے۔ اتنے میں اچانک ریچھنی ارچہ کے درخت کے ایک پورے تنے کو اٹھائے ہوئے آ گئی اور اس کو زور زور سے ادھر ادھر ہلاتے ہوئے آگے بڑھی۔ دشمن کے سپاہی اس کی زد میں آکر ایک ایک کرکے گرنے لگے۔ جو زندہ رہ گئے وہ حاکم سمیت بھاگ کھڑے ہوئے۔

بہادروں نے اطمینان کی سانس لی اور ایک بار پھر چین سے زندگی بسر کرنے لگے۔

حاکم کے شکست کھاکر شرمناک طور پر بھاگ کھڑے ہونے کی خبر اسی دن سارے شہر میں پھیل گئی۔ حاکم کا سر نیچا ہو گیا اور اس نے شرم کے مارے اپنے محل سے باہر آنا بند کر دیا۔ اس نے سارے شہر میں اعلان کرا دیا کہ جو کوئی رستم کو پکڑکر لائے گا اسے اس کے وزن کے برابر سونا انعام میں دیا جائے گا۔ جس نام‌نہاد مولوی نے محلے کے سب سے بڑے رئیس کے ساتھ مل‌کر رستم اور اس کے باپ کو بے‌گھر کرا دیا تھا اس کے ایک بوڑھی ماں تھی جو اسی کی طرح لالچی اور بے‌ایمان تھی۔ نہ منہ میں دانت تھے نہ سر پر بال، آنکھ بھی ایک ہی تھی۔ حاکم کا وعدہ سن‌کر اس کے منہ سے رال ٹپک پڑی۔ وہ فوراً محل میں حاضر ہوئی، حاکم کو جھک‌کر سلام کیا اور کہا:

"حضور! اگر اجازت ہو تو اس گداگر کو میں پکڑکر آپ کے سامنے حاضر کروں۔"

"ہاں، حاضر کرو" حاکم نے کہا۔ "اگر تم نے یہ کام کر دیا تو میں تمہاری ہر خواہش پوری کر دوں گا۔"

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بڑھیا نے کہا:

"لیکن حضور! شرط یہ ہے کہ ایک تو آپ پندرہ عدد ایسے مردوں کو میرے

ساتھ کر دیں گے جن پر آپ کو پورا پورا اعتماد ہو اور جن کے نہ سر پر بال ہوں اور نہ منھ پر داڑھی مونچھوں کا نام و نشان— اور دوسرے یہ کہ جب یہ کام بخیر و خوبی انجام پا جائے تو آپ حکومت کے ہر معاملے میں، ہر بات میں مجھ سے مشورہ کیا کریں گے—"

حاکم نے بڑھیا کی دونوں شرطیں منظور کر لیں۔ دوسرے ہی دن بڑھیا پندرہ گنجے مردوں کو جو عورتوں اور لڑکیوں کے لباس پہنے ہوئے تھے، ساتھ لے کر پہاڑوں کی طرف نکل گئی— جاتے ہوئے راستے میں بڑھیا کے کہنے پر ان نقلی عورتوں اور لڑکیوں نے آپس میں خوب ہاتھاپائی کی اور ایک دوسرے کو مار پیٹ کر، نوچ کھروچ کر لہولہان کر دیا۔ اس قابل رحم حالت میں وہ لوگ چیختے چلاتے فریاد کرتے ہوئے اس پہاڑی جنگل میں پہنچے جہاں رستم اور اس کے ساتھیوں کا ڈیرا تھا— ان کی فریاد سن کر رستم اور دوسرے لکڑہارے ان کے پاس دوڑے آئے اور پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے؟ تم لوگوں پر کونسی مصیبت آن پڑی ہے۔ بڑھیا نے جیسے کہ وہ انتہائی غم و اندوہ کی ماری ہوئی ہو، اپنے گلے کی پوری طاقت سے فریاد کرتے، اپنا سینہ پیٹتے اور اپنے بال نوچتے ہوئے کہا:

"ہائے مر گئے ہم تو! یہ ظالم ہم کو زندہ نہ چھوڑے گا! کاش رستم جان کہیں ہم کو مل جاتا— وہ تو ضرور ہماری فریاد سن لیتا، ہمارے اوپر رحم کرتا اور ہم کو موت کے منھ سے بچا لیتا— کاش ہم ایک بار اس کو دیکھ لیتے— ہمارا جی ہلکا ہو جاتا—

"روؤ نہیں، ماں— میں ہی ہوں رستم!" رستم نے تسلی دیتے ہوئے کہا— "بتاؤ تو سہی، ہوا کیا ہے؟"

پندرہ کی پندرہ نقلی عورتیں رستم کے قدموں پر گر پڑیں اور زور زور سے رونے دھونے لگیں— اور ان کی سردار بڑھیا نے بین کرتے ہوئے رستم سے کہا:

"رستم جان! ہمارے نور چشم! ہم کو بچاؤ۔ ظالم سے بچاؤ ہم کو۔ وہ جو تمہارے ہاتھوں سزا پاکر گیا ہے اب تلملاکر اس کا بدلہ ہم لوگوں سے لے رہا ہے— خدا کا قہر ہو اس ملعون حاکم پر، اس نے مردوں، عورتوں، بوڑھوں، بچوں، ہم سب کو ایک جگہ جمع کرایا۔ پھر ہمارے مردوں کو خوب پٹواکر زنداں میں ڈلوا دیا، بچوں کو پنجروں میں بند کرواکے لٹکوا دیا، ہم عورتوں کو شہر سے نکلوا دیا اور ہمارے گھروں میں آگ لگوا دی— اب ہم بیچاریاں کیا کریں؟ کس سے جاکر مدد مانگیں؟"

"عزیز ماؤ! پیاری بہنو! تم سب یہیں ہمارے ساتھ رہو۔ ہم تمہارے عزیزوں کو بھی نجات دلانے کی کوشش کریں گے" رستم نے ان سب کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ان سب نام نہاد غمزدہ عورتوں کو تسلی دے کر کھانا کھلایا گیا۔ پھر ان کے رہنے کے لئے جگہ کا انتظام کر دیا گیا۔ وہ سب لکڑھاروں کے ساتھ محنت کرتے ہوئے چین سے رہنے لگیں۔

ایک مرتبہ ریچھنی اور اس کا بیٹا دونوں کہیں دور گئے ہوئے تھے اور رستم اپنے خیالوں میں غرق اکیلا بیٹھا تھا۔ اتنے میں صدیق موچی جو رستم ہی کے محلے کا رہنے والا اور اس کا پڑوسی تھا، اس کے پاس آکر بیٹھ گیا اور کہا:

"تم کچھ کھوئے کھوئے سے نظر آ رہے ہو۔ کہو تو میں تمہیں ایک قصہ سناؤں۔"

"ہاں سناؤ۔ میں بڑے شوق سے سنوں گا" رستم نے جواب دیا۔

صدیق موچی قصہ سنانے لگا:

"کسی زمانے کی بات ہے، کسی جگہ ایک موچی رہتا تھا۔ وہ پھٹے پرانے جوتوں کی مرمت کرکے گزارا کرتا تھا۔ اس کے ایک بیٹی تھی جو اس کی غریبانہ، بے لطف اور بے مزا زندگی کا واحد سہارا تھی۔ لڑکی بڑی ہوشیار اور ساتھ ہی ساتھ خوبصورت بھی تھی۔ موچی تھا تو بہت ہی غریب لیکن پھر بھی اس کی بیٹی کے لئے بڑے بڑے امیروں اور رئیسوں کے ہاں سے رشتے کے پیغام آتے۔ موچی ان سب کو صاف جواب دے دیتا تھا۔ کیونکہ وہ بھانپ گیا تھا کہ اس کی بیٹی پڑوس کے ایک عقلمند اور خوبرو نوجوان سے محبت کرتی ہے۔ وہ دونوں ساتھ کھیلتے کودتے بڑے ہوئے تھے۔ لیکن بعد میں وہ نوجوان اور اس کا باپ دونوں شہر کے ظالموں کے جبر و ظلم کا شکار ہوکر شہر سے نکل گئے تھے اور کہیں پہاڑوں میں جاکر رہنے لگے تھے۔ ایک ایک کرکے کئی سال گزر گئے۔ وہ نوجوان ایک پہلوان بن گیا۔ وہ بڑا نیکدل تھا اور ظلم و ستم کا شکار ہونے والوں اور غریبوں سے بڑی ہمدردی سے پیش آتا اور حتی الامکان ان کو سہارا دیتا تھا۔ اسی وجہ سے آس پاس کے پہاڑی باشندے اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ ایسا پہلوان اور جیالا تھا کہ دشمنوں کو اس کے قریب آنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ موچی اور اس کی بیٹی، اس شریف اور بہادر نوجوان کے کارنامے اور اس کی تعریفیں سن کر پھولے نہیں سماتے تھے اور ہر وقت اسی انتظار میں رہتے تھے کہ شاید وہ ہم سے ملنے آ جائے لیکن سال گزرتے گئے اور اسے نہ آنا تھا نہ آیا۔

"ایمانداری کا کام نہیں کیا نوجوان نے" رستم نے بڑے خلوص کے ساتھ کہا-

صدیق موچی نے قصہ جاری رکھا:

"موچی کی حسین بیٹی کی تعریف حاکم شہر نے بھی سن لی- اس کے چار بیویاں تھیں- اس نے اس لڑکی کو اپنی پانچویں بیوی بنانے کا ارادہ کر لیا اور رشتے کا پیغام بھیجا- لیکن لڑکی کے باپ نے صاف جواب دے دیا- تب حاکم کے حکم پر اس کے آدمی موچی کے گھر آ دھمکے- انہوں نے موچی کے ہاتھ پاؤں باندھکر اسے دریا میں پھینک دیا، اس کے گھر میں آگ لگا دی اور اس کی بیٹی کو زبردستی محل اٹھا لے گئے- موچی کو ماہی‌گیروں نے بچا لیا- اس کی بیٹی اذیتیں سہتی ہوئی اپنے دل کے مالک نوجوان کا انتظار کرتی رہی- کچھ دن بعد ماہی‌گیروں نے موچی کا سارا حال بہادر نوجوان کو سنانے کے لئے پہاڑوں کی راہ لی-"

موچی کا قصہ یہیں تک پہنچا تھا کہ اچانک ان نام نہاد مظلوم عورتوں میں سے ایک نے ہانپتی کانپتی آکر رستم سے کہا:

"رستم‌جان! آپ کی ماں جی مر رہی ہیں- وہ آپ کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہی ہیں-"

یہ سنتے ہی رستم اٹھ کھڑا ہوا اور دوڑا دوڑا بڑھیا کے پاس گیا- وہ اس طرح سانس لے رہی تھی جیسے جان حلق میں اٹکی ہوئی ہو- رستم بڑھیا کے اوپر جھکا اور اس ساتھ‌والی "عورت" نے بڑھیا سے مخاطب ہوکر کہا:

"لیجئے ماں‌جی! آپ کے پہلوان بیٹے آ گئے-"

جان بلب بڑھیا نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ اٹھائے اور رستم کو اشارہ کیا جیسے کہہ رہی ہو کہ آؤ بیٹے، آخری دفعہ تمہیں گلے لگاکر چوم لوں- رستم اس کے اور بھی قریب آیا تو اس نے چپکے سے اس کو کوئی بوٹی سنگھا دی- اور پہلوان بے‌ہوش ہوکر وہیں گر پڑا- اس کا گرنا تھا کہ بڑھیا جھٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے آدمیوں سے کہا:

"سب آؤ، جلدی کرو! کام میں جٹ جاؤ-"

ان سب نے فوراً ہی رستم کے ہاتھ پاؤں خوب کس‌کر باندھ دئے، پھر اس کو ایک اسٹریچر پر ڈالا جسے انہوں نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا اور اٹھاکر شہر کی طرف چل پڑے- شہر پہنچ‌کر وہ رستم کو شاندار حویلی کے اندر لے گئے اور دروازے کے قریب زمین پر ڈال دیا- حویلی کے اندر مخمل کے بنے ہوئے قیمتی گدوں پر کچھ بڑے

بڑے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے سامنے قیمتی انعامات رکھے ہوئے تھے۔ رستم کو اندر لاکر زمین پر ڈالا گیا تو اس کو دیکھتے ہی حاکم شہر اٹھ کھڑا ہوا اور بیٹھے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا:

"حضرات! آپ لوگ ابھی تو ہماری یہ حقیر سی نذریں قبول کیجئے۔ باقی ہمارے اوپر قرض رہے گا۔"

پھر سلیم بائے اٹھا اور اپنی توند پھلائے اور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اعلان کیا:

"کل ہم عوام‌الناس کو میدان میں جمع کریں گے اور سب کے سامنے اس بدمعاش کو پھانسی پر چڑھا دیں گے۔ وہیں آپ سب کو بھی بیش‌بہا انعام و اکرام سے لاد دیں گے۔"

اسی وقت بڑھیا نے سلیم بائے کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا:

"امیرزادے! آپ کا کہنا غلط ہے۔ ایک تو اس گداگر کو لے جاکر عوام‌الناس کو دکھانا بہت ہی خطرناک ہے اور دوسرے، اس کو کل تک زندہ رکھنا بھی جان جوکھم کا کام ہے۔ ہوش میں آنے کی دیر ہے کہ یہ اپنے آپ کو بندھن سے آزاد کرا لے گا۔ اس لئے فوراً ہی اس کا کام تمام کر دینا چاہئے۔"

حاکم نے اس کو جواب دیا:

"بڑی بی! جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی کیا جائے گا۔"

"تو پھر لو سنو" بڑھیا نے کہا۔ "شیطان تیپا کے پہاڑ میں ایک بڑا سا سوراخ ہے۔ جو اس میں جائے لوٹ نہ پائے۔ اس کالے گڑھے کی تہہ میں دیو اور اژدھا رہتے ہیں اور آخر ان کو بھی تو غذا کی ضرورت ہے۔"

اس بات پر سب لوگ ہنس پڑے اور روسا میں سے ایک نے بڑھیا سے کہا:

"بڑی بی! چالاکی میں کوئی انسان کیا، شیطان بھی آپ کی برابری نہیں کر سکتا۔"

رستم کو لے جاکر اسی کھڈ میں ڈال دیا گیا۔

رستم جب اپنے پہاڑی ڈیرے پر رہتا تھا تو روز صبح بانسری پر چرواہوں کی ایک دل‌پسند دھن بجایا کرتا تھا۔ اس دھن کو سنتے ہی رستم کے لکڑہارے ساتھی اپنے بستروں سے اٹھ جاتے تھے۔ یہ دھن ان کے لئے صبح ہونے کی علامت تھی۔ لیکن آج بانسری کی آواز نہیں سنائی دی۔ لوگ جاگ تو گئے لیکن یہ سوچ کر کہ شاید ابھی

صبح نہیں ہوئی ہے، اپنے بستروں پر پڑے رہے۔ جب پڑے پڑے اوب گئے تو اٹھ اٹھکر اپنے جھونپڑوں سے باہر آ گئے۔ رستم کا باپ تو بانسری کی آواز نہ سنکر فکرمند ہو گیا اور جھونپڑے سے نکل کر مٹی کے اس چبوترے کی طرف چلا جہاں رات کو رستم سویا کرتا تھا۔ آکر دیکھا کہ چبوترے پر رستم کی صرف ٹوپی پڑی ہوئی ہے اور وہ خود غائب ہے۔ بوڑھا یہ دیکھکر گھبرا گیا اور چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے اونچی آواز میں "رستم! رستم!" پکارنے لگا۔ یہ پکار سنکر چاروں طرف سے لکڑھارے جمع ہو گئے۔ سب کو تعجب تھا کہ رستم اچانک کہاں غائب ہو گیا۔

"اسے ادھر ادھر تلاش کرنا چاہئے" لوگوں میں سے کسی نے مشورہ دیا۔

رستم کا باپ فکر میں ڈوبا ہوا کھڑا تھا۔ اسے جانے کیا خیال آیا کہ اچانک ان عورتوں کی جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر میں لوٹا تو ایک چھوٹی سی ناس‌دانی اس کے ہاتھ میں تھی جو کدو* کی بنی ہوئی تھی اور جس پر کوئی لفظ کھدا ہوا تھا جو شاید اس ناس‌دانی کے مالک کا نام تھا۔ بوڑھا کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھتا رہا اور پھر لوگوں کو دکھاتے ہوئے کہا:

"بھائیو! رستم‌جان رذیل دھوکابازوں کے جال میں پھنس گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو عورتیں مصیبت کی ماری دکھائی دیتی تھیں اور سینہ‌کوبی کرتی ہوئی چیخ چلاکر رو رہی تھیں وہ عورتیں نہیں تھیں۔ سب کے سب مرد تھے۔ اس کا ثبوت یہ ناس‌دانی ہے جو سلیم بائے کے بھتیجے بوری کی ہے۔"

ایک آدمی نے ناس‌دانی پر کھدے ہوئے لفظ کو کسی طرح پڑھ لیا اور بوڑھے کی بات کی تصدیق کر دی۔

اب ذرا رستم کا حال سنئے۔ وہ کھڈ کی گہری تہہ میں ایک دن اور ایک رات بےہوش پڑا رہا۔ ہوش آیا تو اسے یہ دیکھکر بےحد تعجب ہوا کہ وہ جانے کہاں پڑا ہوا ہے، ہاتھ پاؤں بلکہ سارا بدن رسی میں جکڑا ہوا ہے اور چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے۔ وہ اپنے آپ کو رسی سے آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ خوب زور لگایا لیکن کامیابی نہ ہوئی پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔ تھوڑی دیر آرام کرکے دوبارہ زور لگایا

---

*کدو کی ایک خاصی قسم جو کھانے کے قابل نہیں ہوتی۔ صرف ناس‌دانی اور ویسی ہی دوسری ڈبیاں بنانے میں استعمال کی جاتی ہے۔ اڈیٹر۔

اور آخرکار سینے پر رسی ٹوٹ گئی۔ کچھ دیر تک یونہی کوشش کرکے اس نے خود کو بالکل آزاد کر لیا۔ ایک طرف سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ رستم اٹھکر اسی طرف چل پڑا۔ وہ دیر تک چلتا رہا۔ آخرکار سامنے ہلکی سی روشنی دکھائی دی۔ تھوڑا سا اور چلنے پر کسی غار کا منھ دکھائی دیا جو ایک بڑی سی سل سے بند کر دیا گیا تھا۔ کراہنے کی آواز اسی غار کے اندر سے آ رہی تھی۔ رستم نے اپنے کندھے سے سل کو ایک طرف سرکا دیا اور غار کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر آتے ہی اس نے دیکھا کہ زمین پر چاروں طرف انسانی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں۔ وہ جرأت کرکے آگے چلا تو دیواروں پر جا بجا تصویریں نظر آئیں۔ ان تصویروں میں کچھ مرد تھے جن کے پاس جادوگر پہرہ دے رہے تھے۔ کچھ عورتیں تھیں جو زنجیروں میں جکڑی ہوئی لٹک رہی تھیں۔ غار کے اس سرے پر ایک چھوٹا محل سا بنا ہوا تھا۔ اس کے آگے پتھر کی بنی ہوئی ایک اونچی سی چیز تھی جو تخت شاہی سے ملتی جلتی تھی۔ چاروں طرف متعدد چراغ آخری سانسیں لے رہے تھے۔ پتھر کے چبوترے پر مختلف جانوروں کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں جو اپنا کام پورا کرکے اب گھل چلی تھیں۔ محل کے سامنے ایک طرف ایک اندھیری کوٹھری سی نظر آئی۔ رستم نے نزدیک جاکر اس کے اندر جھانکا تو وہاں کا منظر دیکھکر اس جیسے جیالے آدمی کے بھی دونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ وہاں مٹی کا ایک بڑا سا برتن رکھا تھا جس میں یخبستہ پانی بھرا ہوا تھا اور اس پانی میں تقریباً سترہ سال کی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ دونوں طرف کو تنی ہوئی تھیں۔ لڑکی کے سر کی چالیس چوٹیاں دیوار میں گڑی ہوئی کیلوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ وہ اتنی بیدم ہو چکی تھی اور ایسی ہلکی ہلکی سانسیں لے رہی تھی کہ لگتا تھا بس کچھ ہی پل میں دم توڑ دے گی۔ اتنی حسین لڑکی رستم نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے چہرے سے نور برس رہا ہو جس سے چاروں طرف کا اندھیرا چھٹ رہا ہو۔ لڑکی کی حالت کے مدنظر یہ سوچنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ کون ہے اور کس طرح اس ناقابل برداشت عذاب و عقوبت میں مبتلا ہوئی ہے۔ رستم نے فوراً جاکر لڑکی کی کیلوں سے بندھی ہوئی چوٹیوں کو کھول دیا، ہاتھ والی رسیاں بھی کھول دیں، اسے اٹھاکر پانی سے باہر نکالا اور آہستہ سے زمین پر لٹا دیا۔ پھر اس نے پاؤں سے زور کی ایک ٹھوکر مارکر پانی والے برتن کو الٹ دیا۔ اسی وقت اچانک غار میں دو آدمی جانے کہاں سے نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک تو پستہ قد تھا، پیٹھ ابھری ہوئی، ٹانگیں ٹیڑھی میڑھی اور بدن

بالوں سے ڈھکا ہوا- دوسرا تھا کوئی ستر سال کا ایک بوڑھا جس کے منھ پر داڑھی مونچھوں کے نام پر صرف بارہ بال تھے اور ناک اتنی لمبی تھی کہ اس کے عصا سے جسے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا، سبقت لیتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی-

پہلا آدمی اس زیر زمین سلطنت کا سب سے بڑا ڈاکو تھا اور دوسرا تھا مولوی کے بھیس میں اس ڈاکو کا ایک شریک کار- وہ ملک میں ادھر ادھر گھوم پھرکر شکار تلاش کیا کرتا تھا اور کوئی شکار نظر آتے ھی اس کی خبر ڈاکو کو دیتا تھا- اس لڑکی کو بھی ڈاکو اسی مولوی کی مدد سے اٹھا لایا تھا- وہ لڑکی کو اپنی بیوی بنانا چاھتا تھا لیکن لڑکی نے صاف انکار کر دیا تھا- ناقابل برداشت اذیتیں سہہ کر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو ڈاکو اس کی جان لینے پر تل گیا تھا- اب مولوی ڈاکو کے ساتھ اس غرض سے آیا تھا کہ لڑکی کو راضی کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی جائے- اچانک رستم پر نگاہ پڑی تو ڈاکو اور مولوی دونوں نے قدرے تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ڈاکو نے ایک زور کا قہقہہ مارکر کہا:

"ارے یہ کون ھے جس نے میرے قہر کی پروا نہ کرکے اس کی حمایت کرنے کی ٹھانی ھے؟"

رستم بےخوف کھڑا ڈاکو کی طرف دیکھ رہا تھا-

"ارے او بچے! کون ھے تو؟" ڈاکو نے بڑے رعب سے رستم سے پوچھا- "مرنے سے پہلے ذرا اپنا نام تو بتا دے-"

یہ کہہ کر ڈاکو رستم کی طرف بڑھا- اس طرح جیسے کسی چھوٹے سے ناسمجھ سے بچے کے ساتھ کھیلنا چاھتا ہو- اس نے رستم کے کان کی طرف اپنا ھاتھ بڑھایا ھی تھا کہ بہت ھی زور کا ایک مکا اس کے سینے پر لگا اور وہ تین قلابازیاں کھاکر زمین پر چت جا گرا- مریل سا مولوی بھی اس کے بھاری بھرکم جسم تلے دب گیا- اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے تو اس نے مولوی کو پیس ھی ڈالا- بالآخر وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور تلوار کھینچ کر رستم کی طرف بڑھا- مارے غصے کے اس کا منھ ٹیڑھا ہوا جا رہا تھا- ادھر رستم بھی اس مٹی کے بھاری بھرکم برتن کو سر کے اوپر اٹھائے تیار کھڑا تھا- ڈاکو تلوار سے وار کرنے ھی والا تھا کہ رستم نے اس برتن کو ڈاکو کے سر پر دے مارا- وہ دھم سے زمین پر گر پڑا- رستم نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور اسی سے ملعون کا کام تمام کر دیا-

لڑکی نے اپنی لمبی لمبی پلکیں آهسته سے اٹھاکر آنکھیں کھولیں- پھر اس نے اپنے خشک ھونٹوں کو ھلکی سی جنبش دی- رستم نے فوراً چلو میں پانی لاکر لڑکی کے منھ سے لگایا- لڑکی نے دو تین گھونٹ پئے- پھر اس نے رستم کی طرف فکرمند نگاھوں سے دیکھتے ھوئے کہا:

"آپ کون ھیں؟ یہاں کیوں آئے ھیں؟ مجھے تو موت کی سزا سنائی گئی ھے- آپ بھاگ جائیے- ورنه آپ کی بھی خیر نہیں- اگر اسے معلوم ھو جائے که آپ مجھے بچانے آئے ھیں تو وہ آپ کو بھی مار ڈالے گا-"

لڑکی کے چہرے کو ٹکٹکی باندھکر دیکھتے ھوئے رستم نے کہا:

"آپ تو اب بچ گئی ھیں-"

"آپ مجھے کوئی قصه سنا رھے ھیں کیا؟" لڑکی نے بےحد متعجب ھوکر کہا- "بھلا یه کیسے ھو سکتا ھے؟ آج تک کوئی بھی آدمی ایک بار اس کے پنجے میں آکر اس سے نکل نہیں پایا ھے- وہ اتنا ظالم ھے که لوگوں میں خونخوار دیو کے نام سے مشہور ھے- سارے ملک میں شاید ھی کوئی ایسا آدمی ھو جس نے اس کا ظلم نه سہا ھو اور جو اس سے نه ڈرتا ھو- روتے ھوئے بچے بھی اس کا نام سنتے ھی چپ ھو جاتے ھیں- ایک ھزار سپاھی بھی مل‌کر اس کی برابری نہیں کر پاتے-"

لڑکی بےحد گھبرائی ھوئی تھی- اس نے جواب کے انتظار میں اپنی نازک انگلیوں سے رستم کے ھاتھوں کو دھیرے سے چھوا-

"ڈاکو سپاھیوں کو اسی تلوار کے زور سے بھگاتا تھا نا؟" رستم نے ڈاکو کے ھاتھ سے چھینی ھوئی تلوار دکھاتے ھوئے لڑکی سے پوچھا-

"یه آپ کے ھاتھ میں کیسے آ گئی؟" لڑکی نے اور زیادہ متعجب ھوکر پوچھا-

رستم نے لڑکی کو سہارا دےکے اٹھایا اور اس گڑھے کے پاس لے گیا جس کے اندر ڈاکو اور مولوی کی لاشیں پڑی ھوئی تھیں- لڑکی نے اطمینان کی گہری سانس لی اور دونوں ھاتھ اپنے سینے پر باندھکر اور اپنی لمبی پلکیں جھکاکر رستم کا شکریه ادا کرتے ھوئے کہا:

"آفتابی سرزمین کا پہلوان جگ جگ جئے!"

"یه آپ کو کیسے معلوم ھوا که میں آفتابی سرزمین کا باشنده ھوں؟ اور آپ خود کون ھیں؟" رستم نے پوچھا-

"میرا نام ہے تانگ‌گلی*" لڑکی نے جواب دیا۔ "صرف میں ہی نہیں، اس ملک کے تمام باشندے آپ کو جانتے ہیں۔ یہاں کے لوگ کتنے ہی برسوں سے آپ کے انتظار میں تھے۔ صرف آپ ہی اس قابل تھے کہ خونخوار دیو کو مارکر عوام کو اس کے ظلم و ستم سے نجات دلائیں۔ آپ کا نام رستم ہے۔ آپ ایک لکڑھارے ہیں اور لوگوں کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں مجھے میرے دادا نے بتائی ہیں۔ وہ اکثر مجھے آپ کے کارناموں کے قصے سنایا کرتے تھے۔ آئیے میرے ساتھ چلئے۔ میں ملک کے باشندوں سے آپ کا تعارف کراؤں۔ یہ تو میرا اولین فرض ہے۔"

وہ دونوں شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ چلتے چلتے لڑکی نے رستم کو اپنے ملک کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔

صبح ہوتے ہوتے وہ ایک میدان میں پہنچے جہاں خاصی بڑی بھیڑ جمع تھی اور کہرام مچا ہوا تھا۔ یقیناً ان لوگوں کو کسی بڑی مصیبت نے آن گھیرا تھا۔ بہت سے لوگ رو رہے تھے۔ کچھ تو سینہ‌کوبی کرتے اور اپنے کپڑے پھاڑتے ہوئے اپنے سر زمین سے ٹکرا رہے تھے۔ جو زیادہ صبر و تحمل والے اور زیادہ ہمتی تھے وہ لوگوں کو تسلیاں دے رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک ٹیلے کے اوپر کوئی چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک بھیڑ کھڑی تھی۔ دونوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کچھ مرد اور عورتیں چیختے چلاتے اور روتے ہوئے اس لڑکے کی طرف لپک رہے تھے لیکن لوگ راستہ روک لیتے اور ان کو جانے نہیں دیتے تھے۔

رستم کو یہ سب دیکھ‌کر سخت حیرت ہوئی اور اس نے لڑکی سے پوچھا:

"تانگ‌گلی! مجھے بتاؤ تو سہی، اس سب میں کیا راز ہے؟"

تانگ‌گلی نے رستم کی طرف دیکھ‌کر روتے ہوئے جواب دیا:

"کاش میں پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی اور لوگوں کی یہ ساری مصیبتیں نہ دیکھتی! دو سال سے یہ سب کچھ روز کا معمول بنا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیا روز کا معمول بنا ہے؟" رستم نے بات کو نہ سمجھ‌کر پھر سوال کیا۔

لڑکی بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاکر بتانے لگی:

"کئی سال ہوئے ہمارے علاقے میں کہیں سے اچانک ایک اژدہا آ دھمکا۔ وہ

---

*تانگ گلی کا اردو میں مطلب ہے سویرے کا پھول۔ اڈیٹر۔

مویشیوں کا صفایا کرنے لگا— کتنے ہی لوگوں کو اجاڑ دیا، کنگال بناکے چھوڑ دیا— لوگ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکے۔ سامنے جو ٹیلا ہے نا اسی کے پیچھے رہتا ہے وہ اژدھا— ایک مرتبہ تو وہ سیدھے شہر کی طرف بڑھا— سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ اگر وہ شہر میں آ جاتا تو کتنے ہی آدمیوں کو کھا جاتا۔ اس مصیبت سے بچنے کا شہروالوں کو یہ طریقہ سوجھا کہ انہوں نے اس ٹیلے پر ایک لڑکے اور ایک بھیڑ کو کھڑا کر دیا—

انہیں کھاکر اژدھا لوٹ گیا۔ اسی دن سے یہ روز کا معمول ہو گیا۔ شہر کے باشندے باری باری یہ قربانی دیتے ہیں— جس کے کوئی اولاد ہے وہ اس کی قربانی دیتا ہے اور جس کے کوئی بیٹا یا بیٹی نہیں وہ کوئی بھیڑ کھڑی کر دیتا ہے— پچھلے سال انہی دنوں میری چھوٹی بہن کی قربانی دی گئی تھی— آج تو شاید کسی امیر یا رئیس کا بیٹا اژدھا کی نذر کیا جا رہا ہے— جبھی تو اتنے سارے لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں—"

دفعتاً ہجوم میں ہلچل شروع ہو گئی— لوگ زور زور سے رونے، کراہنے اور اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاکر خدا سے رحم کی التجا کرنے لگے—

"ہائے— ہائے! اژدھا لڑکے کے نزدیک آ گیا ہے" لرزتی ہوئی آواز میں تانگ گلی نے کہا اور بےہوش ہوکر گر پڑی—

رستم نے دیکھا کہ ایک کالا کلوٹا عجوبہ لڑکے کی طرف آہستہ آہستہ رینگتا ہوا بڑھ رہا ہے— بھیڑ نے اژدھا کی آہٹ پاکر بھاگنے کی کوشش کی— لڑکے نے "ماں!" کہہ کر ایک دلدوز چیخ ماری اور بھاگنا چاہا— لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تھے اور کہیں بھاگ نہیں سکتے تھے— رستم ٹیلے کی طرف دوڑ پڑا— اتنے میں اژدھا اپنی لمبی زبان نکال کر اپنے شکاروں کو اپنی طرف کھینچنے لگا— لڑکا اور بھیڑ دونوں اپنے آپ ہی دھیرے دھیرے اژدھے کی طرف چل پڑے جب لڑکا اژدھے کے منہ کے بالکل قریب آ گیا تو اچانک اژدھے کے سر پر زوروں کی ایک ضرب لگی— اژدھا شدت درد سے بلبلا اٹھا اور ایک دہشتناک پھنکار کے ساتھ پیچھے پلٹنے ہی والا تھا کہ رستم اس کی گردن پر چڑھ بیٹھا اور تلوار سے اس کی گردن اڑا دی—

وہ لڑکا جو اژدھے کا لقمہ بننےوالا تھا رستم سے لپٹ گیا۔ لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا— آج کا دن ان کے لئے ایک عظیم جشن کا دن تھا— اونچے قد کا ایک سفیدریش بوڑھا ہجوم سے نکل آیا اور اس نے خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے رستم سے مخاطب ہوکر کہا:

"اے بہادر! تم نے ہم کو اتنی بڑی مصیبت سے نجات دلائی، ہمارے غم و اندوہ کو دور کیا، ہمارے آنسو پونچھ دئے۔ ہم کس منھ سے تمہارا شکریہ ادا کریں! بتاؤ تو سہی، تم کون ہو؟"

اتنے میں تانگ گلی ہوش میں آکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سفید داڑھی والے آدمی کی نظر لڑکی پر پڑی تو اس نے آگے بڑھکر اس کو سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے کہا:

"تانگ گلی! میری پیاری بیٹی! تم زندہ ہو؟ تم کو کس نے موت کے منھ سے بچایا اور اندھیرے غار سے نکال لایا؟"

"جس نے آپ سب کو نجات دلائی ہے اسی نے مجھ کو بھی ظلمت سے بچایا ہے" لڑکی نے جواب دیا۔ "وہ نجات دلانےوالا ہے آفتابی سرزمین کا بہادر رستم لکڑھارا جس کے آپ خود گن گاتے رہے ہیں۔ لیجئے وہ آپ کے سامنے کھڑا ہے۔"

سارے لوگ رستم کے اعزاز میں نعرے بلند کرتے ہوئے شہر کی طرف چل پڑے۔ سارے شہر میں کئی دنوں تک خوشیاں منائی گئیں۔

رستم نے کچھ دن انہی لوگوں کے ساتھ بڑی خوشی سے گزارے لیکن پھر اس کے چہرے پر اداسی کے بادل چھانے لگے۔ اسے اپنے بوڑھے باپ اور دوستوں کی یاد ستانے لگی۔ بالآخر ایک دن اس نے تانگ گلی کے باپ کے پاس جاکر اس کو اپنا سارا حال سنا دیا۔ پھر یہ بتاکر کہ مجھ کو اپنے وطن کی یاد بہت ستا رہی ہے اس نے بزرگ سے پوچھا:

"کیا اس کی کوئی صورت ہے کہ میں اپنے وطن واپس جا سکوں؟"

بزرگ نے دیر تک سوچتے رہنے کے بعد رستم کے اداس چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"میرے بہادر بیٹے! جب سے یہ دنیا آباد ہوئی ہے کوئی آفتابی سرزمین تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ لیکن اپنے بزرگوں سے ہم نے سنا ہے کہ ہمارے شہر سے بہت دور ایک پہاڑ ہے، جو "چالیس پہاڑ" کہلاتا ہے اور اسی پہاڑ پر سے ایک راستہ آفتابی سرزمین کی طرف جاتا ہے۔ مگر اس راستے کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ سننے میں آیا ہے کہ وقتاً فوقتاً ہزاروں آدمی اس پہاڑ کی طرف جاتے رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی اس تک نہیں پہنچ پایا ہے۔ وہ سب کے سب راستے ہی میں مر کھپ

گئے ہیں- وہ راستہ بہت ہی پرخطر ہے- طرح طرح کے خونخوار جانوروں سے بھرا ہوا ہے- وہ کوہستان "چالیس پہاڑ" یوں ہی نہیں کہلاتا ہے- "چالیس پہاڑ" ایک کے اوپر ایک اس طرح کھڑے ہیں جیسے چالیس بلند و بالا اور بالکل ہموار اور چکنی دیواریں ایک دوسری پر کھڑی کر دی گئی ہوں- ان میں سے ہر ایک ہزار گز اونچا ہے- اے بہادر! بہتر تو یہی ہے کہ تم وطن جانے کا اپنا ارادہ ترک کر دو، ہمارے ساتھ رہو اور ہمارے سردار بن جاؤ-"

رستم نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھکر بڑے ادب سے کہا:

"میرے نیک‌دل اور شریف سرپرست! آپ اس دنیا کے خطرات اور حادثات سے مجھ کو بچائے رکھنا چاہتے ہیں-لیکن آخر آفتابی سرزمین میں میرے عزیز اور میرے دوست احباب رہ گئے ہیں جو ہمیشہ میرے ساتھ رہے ہیں، میری پرورش کی، مجھے پروان چڑھایا ہے- اب میرے بغیر ان سب پر کیا بیت رہی ہوگی- ان کے بغیر میں کبھی چین سے نہیں رہ سکتا- دراصل ان سے جدا ہوکر میں زندہ ہی نہیں رہ سکتا-"

رستم کی یہ باتیں سن‌کر بزرگ کو راضی ہونا ہی پڑا-

اگلے دن شہر کے باشندوں نے رستم کو رخصت کیا- شہر کے سردار اس بزرگ نے رستم کی پیشانی کو چوما اور اسے ایک کمان پانچ گز لمبے ایک تیر سمیت پیش کرتے ہوئے کہا:

"یہ تیر کمان ہماری ایک نشانی کے طور پر قبول کرو- یہ تمہیں ہماری یاد دلاتے رہیں اور راستے میں بلاؤں اور آفتوں سے تم کو بچائے رکھیں-"

رستم نے اپنے ہاتھ ہلاتے ہوئے شہر اور شہروالوں کو الوداع کہا اور دورافتادہ پہاڑوں کی طرف چل پڑا- وہ بہت دنوں تک برابر چلتا رہا- بیابانوں اور صحراؤں کو طے کیا، چھوٹے موٹے پہاڑوں اور ٹیلوں پر سے گزرا، دریاؤں کو پار کیا اور بالآخر ایک دن "چالیس پہاڑ" تک پہنچ گیا- اس نے نظریں اٹھاکر پہاڑ کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں خود بخود ایک خوف سا جاگ اٹھا- وہ پہاڑ سچ مچ ہی ناقابل تسخیر معلوم ہوتا تھا- بےحد اونچی بالکل سیدھی چکنی چٹانیں ایک کے اوپر ایک کھڑی تھیں- تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان پر کہاں سے اور کس کس طرح چڑھا جائے- رستم بالکل حیران وپریشان کھڑا تھا کہ اچانک ایک طرف سے دھاڑنے کی آواز سنائی دی- گھڑی بھر بعد ایک شیرنی نمودار ہوئی جو اپنا منہ کھولے پتھروں کو ادھر ادھر پھینکتی سیدھی رستم کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی- رستم جھٹ سے

اٹھ کھڑا ہوا اور شیرنی پر نشانہ سادھ کر تیر پھینکنے ہی والا تھا کہ شیرنی اس کا ارادہ بھانپ کر ٹھہر گئی اور اس نے سر جھکا کر رستم سے کہا:

"اے بھلے آدمی! میری مدد کرو۔ میرے بچوں کو موت سے بچاؤ۔"

رستم شیرنی کے پاس آیا اور اس کی ایال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"اے جانوروں کی ملکہ! تم مجھ سے کیا مدد چاہتی ہو۔ بتاؤ، میں تیار ہوں۔"

شیرنی نے سر کے اشارے سے کہا کہ میرے پیچھے آؤ اور مڑ کر پیچھے کی طرف دوڑ پڑی۔ شیرنی کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہوا رستم تھوڑی دیر میں ایک غار پر پہنچا۔ دیکھا تو غار کے دہانے پر ایک بچھو کھڑا تھا جو کسی بیل جتنا بڑا تھا۔ وہ شیرنی کے دو بچوں کو جو غار کے اندر تھے ڈنک مارنے پر تلا ہوا تھا۔ رستم نے تیر کمان کو سنبھالتے ہوئے بچھو پر تیر پھینکا۔ تیر بچھو کے ٹھیک سر پر لگا۔ اور وہ گر پڑا۔ رستم نے جھپٹ کر اپنی تلوار سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ شیرنی کے بچے جو غار کے ایک کونے میں دبکے ڈر کے مارے تھرتھر کانپ رہے تھے فوراً دوڑتے ہوئے باہر آئے اور اپنی ماں سے لپٹ گئے۔ شیرنی نے جھک کر رستم کا شکریہ ادا کیا۔ رستم طویل مسافت کی تکلیفوں سے بالکل تھک گیا تھا چنانچہ وہ وہیں غار کے سامنے لیٹ گیا اور لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔ شیرنی اپنے دونوں بچوں کو پہلوان کے پاس چھوڑ کر خود کھانے دانے کا بندوبست کرنے کے لئے غار کے اندر چلی گئی۔ اتنے میں ایک بھیڑ کو دانتوں میں دبائے ہوئے شیر بھی آ گیا۔ رستم کو دیکھتے ہی اس کو غصہ آ گیا۔ وہ بھیڑ کو زمین پر چھوڑ کر رستم پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ اس کے بچے اس کے گلے سے لپٹ کر کہنے لگے:

"اس انسان کو نقصان نہ پہنچائیے۔ اس نے ہماری جانیں بچا لی ہیں۔"

شیر اپنے بچوں کی بات سن کر سخت متعجب کھڑا تھا کہ اندر سے شیرنی نکل آئی۔ اس نے سارا قصہ اپنے شوہر کو سنا دیا اور بچھو کے زمین پر پڑے ہوئے ٹکڑے بھی دکھا دئے۔

دن ڈھلتے رستم کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ متعدد شیر اس کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ شاید اس کے جاگنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان شیروں میں سے ایک خاص طور پر نمایاں تھا۔ اس کی ایال سب سے گھنی اور سب سے لمبی تھی اور وہ ایک ذرا اونچی سی جگہ پر بیٹھا تھا۔ رستم فوراً سمجھ گیا کہ یہ اس علاقے کے شیروں کا سردار ہے۔ وہ فوراً اٹھ کر سردار کے پاس گیا اور اسے جھک کر

سلام کیا— شیروں کے سردار نے اپنے آگے کے دونوں پنجے رستم کے کندھوں پر رکھ دئے اور کہنے لگا:

"تم نے اس درندے کو مار ڈالا ھے جس نے کتنے ھی برسوں سے ھم میں دھشت پھیلا رکھی تھی— تم نے ھمیں کو نہیں، ھماری آئندہ نسلوں کو بھی مٹنے سے بچا لیا ھے— اب بتاؤ پہلوان، ھم تمہاری کون سی خواھش پوری کریں؟"

رستم نے ادب سے جھک کر جواب دیا:

"میری تو یہ خواھش ھے کہ میں اپنے وطن پہنچ جاؤں اور اپنے عزیزوں کا دیدار کر سکوں—"

"وہ لوگ کہاں ھیں؟" شیروں کے سردار نے پوچھا—

"وہ آفتابی سرزمین میں ایک پہاڑی جنگل کے اندر رھتے ھیں" رستم نے جواب دیا— یہ سن کر شیر اپنی زبان میں آپس میں کچھ باتیں کرنے لگے— وہ رہ رہ کر اپنے سردار سے رجوع کرتے تھے— ادھر رستم بڑی بیتابی سے ان کے جواب کا انتظار کر رھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد شیروں کا سردار اپنا سر اونچا اٹھاکر بڑے زور سے دھاڑ اٹھا جیسے بادل زور سے گرج اٹھے ھوں— اسی وقت جانے کہاں سے ایک شیر آ موجود ھوا جو مقابلتاً چھوٹا سا تھا لیکن اس کی ٹانگیں غیرمعمولی طور پر موٹی موٹی تھیں— آکر وہ سردار کے سامنے جھک گیا— شیروں کے سردار نے اس سے کہا:

"تم اس نوجوان کو پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا دینا اور اس کو راستہ بتا دینا— لوٹتے ھوئے وھاں سے کوئی چیز لیتے آنا جو اس بات کا ثبوت ھو کہ تم نے اس کو صحیح سلامت پہنچا دیا ھے—"

اس بونے شیر نے دوبارہ جھک کر سردار کو سلام کیا اور رستم کے پاس آکر کھڑا ھو گیا— شیروں کے سردار نے رستم سے کہا:

"سنو بہادر! تمہارا یہ سفر بہت ھی خطرناک ھوگا— یہ شیر تم کو ایک غار کے اندر سے لے جائے گا جس کی کوئی انتہا نہیں ھے اور جس میں ظلمت ھی ظلمت ھے— یہ تم سے جیسا کرنے کو کہے تمہیں چون و چرا کئے بغیر ویسا ھی کرنا ھوگا— کسی قسم کی ضد، اپنی مرضی پر اصرار یا سرکشی کی کوئی گنجائش نہ ھوگی— ورنہ بہت ممکن ھے کہ بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے— اور دوسری بات یہ ھے کہ آفتابی زمین پر قدم رکھتے ھی تم وھاں کی کوئی چیز اس شیر کے ذریعے ھمیں بھیج دینا تاکہ ھمیں تمہارے متعلق کوئی فکروپریشانی کی گنجائش نہ رھے۔"

سردار کی نصیحتیں اچھی طرح ذہن‌نشیں کرکے رستم بونے شیر پر سوار ہو گیا اور وہ چل پڑا۔ باقی سب شیر بھی ان کے ساتھ چلے۔ سب اکٹھا اس غار کے دہانے پر پہنچے جس کا ذکر سردار نے کیا تھا۔ یہاں پر انہوں نے رستم سے الگ ہوتے ہوئے روایتی رخصتی رقص کیا۔ اس کے بعد بونا شیر رستم کو اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے غار کے اندر آیا اور بلا کسی جنبش کے بت بن‌کر کھڑا ہو گیا۔ پل بھر اس طرح کھڑے رہنے کے بعد وہ دفعتاً دوڑ پڑا اور بےتحاشا دوڑتا چلا گیا۔ رہ رہ‌کر وہ دھاڑنے لگتا تھا اور اس کے جواب میں چاروں طرف سے کچھ آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ رستم کو یہ جاننے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ یہ آوازیں کس کی ہیں اور اس نے شیر سے پوچھا:

"اے جنگلی جانوروں کے بادشاہ! یہ عجیب و غریب آوازیں کس کی ہیں؟ ذرا بتاؤ تو سہی۔"

"اے بہادر! ایسے سوال کرنے کا یہ وقت نہیں ہے" شیر نے کہا۔ "میری گزارش ہے کہ تم چپ رہو۔ ورنہ ہم دونوں ہی کی خیر نہیں۔"

شیر غار کے گھپ اندھیرے میں تیر کی طرح اڑتا چلا جا رہا تھا اور چاروں طرف سے طرح طرح کی عجیب و غریب آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ کسی قسم کے نامانوس پرندوں کی آوازیں نہ جانے کون سی مخلوقات کے کراہنے کی آوازیں جو شدیدترین اذیتیں برداشت کر رہی‌ہوں، عیش وعشرت میں غرق عاصیوں، گناہ‌گاروں کے بےطرح شور مچاتے ہوئے پاگلوں کی طرح گانے ناچنے کی آوازیں، کرنایوں کی گڑگڑاہٹ اور نقارے پیٹنے کی آوازیں، گانےوالی لڑکیوں کی میٹھی اور سریلی آوازیں، غار کے گنبد کو لرزا دینےوالے بادلوں کی گرج اور گڑگڑاہٹ۔ گو ان تمام آوازوں سے رستم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے پھر بھی وہ راز پانے سے متعلق اپنے اشتیاق کو دبا نہیں پا رہا تھا۔ چنانچہ اس نے شیر سے پھر سوال کیا:

"اے جانوروں کے بادشاہ! ہمارے ارد گرد یہ کون سی مخلوقات ہیں جو ناقابل برداشت اذیتیں سہہ‌کر رو اور کراہ رہی ہیں اور جو رنگ رلیاں منا رہی ہیں؟"

شیر نے منت کرتے ہوئے کہا:

"اے بہادر! اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے واسطے، اپنے عزیزوں اور دوستوں کی زندگیوں کے واسطے چپ رہو!"

رستم سمجھ گیا کہ شیر کی بات ماننا ہی مناسب ہے۔ وہ دم بخود ہوکر غار کے

اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا لیکن وہاں اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اور شیر تھا کہ تیر کی طرح اڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ آخر اس نے اس ڈر سے کہ کہیں گر نہ جائے شیر کی ایال کو اور زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ان کا سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ دفعتاً شیر نے حکم دیا:

"اپنی آنکھیں بند کر لو اور جب تک میں کھولنے کو نہ کہوں بند ہی کئے رہنا۔ یاد رکھو، اگر تم نے ذرا سی بھی حکم عدولی کی تو اس کا نتیجہ بہت برا ہوگا اور اس کے لئے اپنے اور میرے دوستوں کے سامنے تمہی کو جواب‌دہ ہونا پڑے گا۔"

رستم نے آنکھیں بند کرکے شیر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ شیر اور بھی تیزی سے بھاگنے لگا۔ وہ بھاگتا جاتا تھا اور اس زور سے گرج رہا تھا کہ رستم کانپ کانپ اٹھتا تھا۔ ذہنی تناؤ اور ڈر کے مارے رستم کے کپڑے پسینے سے تر بتر ہو گئے۔ نہ جانے کتنی دیر تک شیر بجلی کی سی تیزی سے بھاگتا رہا اور پھر وہ ایک‌دم رک گیا اور حکم دیا کہ اتر جاؤ۔ رستم آنکھیں بند کئے کئے شیر کی پیٹھ پر سے اترا۔ شیر نے کہا: آنکھیں کھول دو۔" رستم نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہے، فضا رنگ برنگے پھولوں، ہرے بھرے درختوں اور نرم اور ملائم گھاس کی بھینی بھینی خوشبو سے بھری ہوئی ہے، جا بجا چشموں کا صاف و شفاف پانی دھیمی آوازیں پیدا کرتا ہوا بہہ رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں کی ہر چیز کسی مالی کے ہاتھوں کی رہین منت ہے۔

رستم یہ سب دیکھ‌کر دنگ رہ گیا اور اس نے شیر سے سوال کیا:

"کیا ان شاداب باغوں اور چمن‌زاروں میں کوئی انسان بھی رہتا ہے؟"

شیر شاید اتنا تھک گیا تھا کہ رستم کے سوال کا جواب تک نہیں دے سکتا تھا۔ وہ نزدیک کے ایک چشمے کے پاس جاکر اس کے پانی میں نہایا اور پھر سے پہلے کی طرح چست اور ہشاش بشاش نظر آنے لگا۔ تب اس نے رستم کی طرف دیکھ‌کر کہا:

"لو اب سنو بہادر! میں اب سارا راز تم پر کھولے دیتا ہوں۔ رونے کراہنے، گانے بجانے وغیرہ کی جو آوازیں تم سنتے رہے ہو وہ سب آفتابی سرزمین کے باشندوں کی آوازیں تھیں۔ وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب کوئی روتا کراہتا ہے تو دوسرا اس سے لطف‌اندوز ہوکر گاتا ناچتا ہے۔ آفتابی سرزمین کے لوگ ایک دوسرے سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ اور جب میں نے تم سے کہا تھا کہ آنکھیں بند کر لو تب ہم ایسی جگھوں سے گزر رہے تھے جہاں تمہیں تمہارے عزیزوں اور احباب کی روحیں نظر آ

سکتی تھیں— یہ ضروری تھا کہ ان کی روحوں پر تمہاری نظر نہ پڑے— ورنہ اس کا نتیجہ ان لوگوں کے حق میں بہت برا ہوتا— پھر تم نے پوچھا کہ ان باغات اور چمن‌زاروں میں کوئی انسان رہتا ہے کہ نہیں— لو اب میں تمہارے اس سوال کا بھی جواب دیتا ہوں— جس انسان نے یہاں پہلے پہل قدم رکھا ہے وہ تمہی ہو— میرے بزرگ ان مقامات کی دیکھ بھال کرتے آئے تھے— اور اب یہاں کی دیکھ بھال میں کرتا ہوں— آج کی نسل کے شیروں میں اکیلا میں ہی ہوں جس کی ان مقامات تک پہنچ ہے— مگر وہ دن بھی آئے گا جب یہاں کا سچا مالک یہاں نمودار ہوگا— تب اس پہاڑ کی تمام ڈھلانیں اور گھاٹیاں سرشار و شاداب باغ اور گلشن نظر آنے لگیں گی—"

"لیکن یہاں کا سچا مالک کون ہے اور وہ کب آئے گا؟" رستم نے پوچھا—

"یہ بتانا مشکل ہے" شیر نے جواب دیا۔ "ہمارے بزرگوں سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں بس اتنا ہی کہا گیا ہے کہ وہ تب ہی آئے گا جب سورج اپنی شعاعوں سے یہاں کے اندھیرے کو دور کرے گا— اچھا بہادر! اب آگے تم اکیلے چلے جانا— میں لوٹ جاؤں گا اور ہاں، تمہیں یاد ہی ہوگا کہ ہمارے بخیر و عافیت پہنچنے کے ثبوت کے طور پر مجھے آفتابی سرزمین کی کوئی چیز ساتھ لے جانی ہوگی—"

شیر رستم کو چٹان کے کنارے پر لے گیا۔ وہاں کہیں اوپر سے کچھ موٹی موٹی سی جڑیں لٹک رہی تھیں— ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیر نے رستم سے کہا:

"تم ان جڑوں کو پکڑ لینا اور ان کے سہارے اوپر چڑھ جانا— وہاں تمہیں ایک سوراخ نظر آئے گا— وہیں سے آفتابی سرزمین شروع ہوتی ہے— تم اسی سوراخ کے اندر سے مٹی کا ڈھیلا لے‌کر نیچے پھینک دینا— اس کو میں لے جاکر اپنے سردار کو دکھاؤں گا—"

شیر کی یہ باتیں سن‌کر رستم کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی— اسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے عزیزوں اور یار و احباب کے پاس پہنچ گیا ہو اور ان سے گلے مل رہا ہو— لیکن اسے یہ فکر ہو رہی تھی کہ اوپر لٹکنے والی ان جڑوں کو آخر پکڑے تو کیسے پکڑے کیونکہ وہ بہت فاصلے پر تھیں— رستم کو حیران و پریشان دیکھ‌کر شیر نے اس سے کہا:

"پہلوان! آؤ، میرے اوپر سوار ہو جاؤ— میں ایک بار اور تمہاری خدمت کر دوں—"

رستم جھٹ سے شیر پر سوار ہو گیا— شیر چٹان کے کنارے کنارے تھوڑا سا

پیچھے ہٹ گیا اور پھر دوڑتے ہوئے آکر اوپر اچھلا۔ اسی وقت رستم نے ان جڑوں میں سے ایک کو پکڑ لیا۔ وہ اس جڑ کے سہارے چڑھتا ہوا اوپر سوراخ تک پہنچ گیا۔ اس نے وہاں سے مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھایا اور اسے اپنے رومال میں لپیٹ کر نیچے شیر کے پاس پھینک دیا۔ پھر ہاتھ ہلاکر شیر کو الوداع کہا اور سوراخ کے اندر کہیں اوپر کی طرف چلنے لگا۔ جب پو پھٹنے لگی تو پہلوان اوپر آفتابی سرزمین پر صنوبر کے درختوں کے جنگل میں کھڑا تھا جہاں اس کا گھر تھا اور جہاں اس کے عزیز و اقارب رہتے تھے۔ یہاں کی ہر چیز اس کی جانی پہچانی اور اس کے لئے بےحد عزیز تھی۔ رستم نے اس درخت کو بھی فوراً پہچان لیا جس کے تنے سے پیٹھ لگاکر کبھی اس کا باپ بیٹھا تھا۔ یہ اس دن کی بات تھی جب وہ اور اس کا باپ دونوں اس جنگل میں پہلے پہل آئے تھے۔ مگر رستم کو اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ جس جڑ کو پکڑکر وہ اپنے وطن کی سرزمین تک پہنچ گیا ہے وہ اسی صنوبر کے درخت کی جڑ ہے۔ وہ جنگل کے اندر اپنے ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر میں سامنے مٹی کے اس چبوترے پر جہاں کبھی وہ خود بیٹھا کرتا تھا، ریچھنی اپنے بیٹے کو ساتھ لئے اداس سی بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ رستم کو دیکھتے ہی ریچھنی اٹھ کھڑی ہوئی اور مارے خوشی کے زور زور سے چنگھاڑتی ہوئی آکر اس سے بغلگیر ہوگئی۔ پھر اس نے آنسو بہاتے ہوئے رستم کو بتایا:

"تم سے جدا ہوئے ابھی تین دن بھی نہیں گزر پائے تھے کہ شہر کا حاکم اپنے بہت سارے سپاہیوں کو لئے پھر آ دھمکا۔ انہوں نے ہمارے جھونپڑوں میں آگ لگا دی اور ہمارے لوگوں کو باندھکر لے گئے۔ اب میں نے چرواہوں سے سنا ہے کہ آج عوام‌الناس کے سامنے ان سب کو پھانسی پر چڑھایا جائےگا۔"

شام کے قریب رستم اور ریچھنی دونوں شہر آ پہنچے۔ لمبا چوڑا میدان لوگوں سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگ رو رہے تھے۔ بہت سے لوگ انتہائی بےبسی اور مایوسی کے عالم میں خوف و ہراس بھری نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ قیمتی کپڑوں میں ملبوس گھڑسواروں کو اس سب کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ وہ بڑی شان سے اپنے گھوڑوں کو ادھر ادھر دوڑاتے ہجوم کو پھانسیوں کے سامنے سے پرے ہٹاتے پھر رہے تھے۔ بہت سے ایسے بھی لوگ تھے جو سائبان‌والی گھوڑاگاڑیوں پر بڑے اطمینان اور لاپروائی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ تماشا دیکھنے اور پھانسی پر چڑھائے جانےوالوں کی تکلیفوں سے حظ اٹھانے کی غرض سے آئے تھے۔ پھانسی کے تختے

کی بائیں طرف لوہے کے کئی کٹھرے رکھے تھے جن میں ان لوگوں کے بچے بند تھے جنھوں نے حکام سے سرکشی کی تھی یا جو ظلم و تشدد سے تنگ آکر اپنے گھروں کو چھوڑکر بھاگ گئے تھے۔ کٹھروں میں بند سبھی بچے نیم‌عریاں تھے اور ان کے دبلے پتلے بدن چلچلاتی دھوپ سے سیاہ پڑ گئے تھے۔ وہ سب بھوک اور پیاس کے مارے زندہ درگور نظر آتے تھے۔ ان نوعمر قیدیوں میں ایک لڑکی نمایاں تھی۔ وہ تھی زھرہ، صدیق موچی کی حسین و جمیل لڑکی جو خودداری اور استقلال کا مظاھرہ کر رہی تھی۔

دفعتاً کرنائے گڑگڑا اٹھے اور سپاھیوں اور کلھاڑ سنبھالے جلادوں کے گھیرے میں باغی اسیر آتے دکھائی دئے۔ ان کے آگے آگے رستم کا باپ چلا آ رہا تھا۔ ان چالیس قیدیوں کو جنھیں موت کے گھاٹ اتارا جانےوالا تھا، لاکر پھانسیوں کے نیچے کھڑا کر دیا گیا۔ کٹھروں میں بند بچے پھانسیوں کے نیچے کھڑے اپنے باپوں اور بھائیوں کو پہچان‌کر اپنے ھاتھ آسمان کی طرف اٹھا اٹھاکر رونے اور فریاد کرنے لگے۔ کچھ بچے جو اتنے بےحال ہو چکے تھے کہ کھڑے بھی نہیں ہو پاتے تھے، لوہے کی سلاخوں میں سے اپنے ھاتھ بڑھاکر چلا رہے تھے: "اباجان! ہم کو بچائیے!" یہیں میدان میں حاکم شہر انتہائی بےپروائی اور غرور کا مجسمہ بنا کھڑا تھا۔ سلطنت کے سربراوردہ امیر و رئیس، فوجی دستوں کے سردار اور دیگر ممتاز لوگ ظالم و جابر حاکم کے ارد گرد کھڑے تھے۔

سلیم بائے نے جو ایک شاندار سیاہ گھوڑے پر سوار تھا، باغیوں کے قتل سے متعلق حاکم شہر کا فرمان‌عالی ھجوم کو پڑھ‌کر سنایا۔ کرنائے اور زیادہ زور سے گڑگڑا اٹھے۔ جلادوں نے پھانسی کے پھندے قیدیوں کی گردنوں میں ڈال دئے۔ سلیم بائے نے ابھی شروع ہونےوالے پرلطف تماشے کے تصور سے خوش ہوکر، اپنی چاندی کی ناس‌دانی نکالی اور اس میں سے تھوڑی نسوار اپنے دائیں ھاتھ کی ھتھیلی پر رکھ‌کے اسے منھ میں زبان کے نیچے دبانے ھی والا تھا کہ اچانک کسی کے مضبوط ھاتھوں نے اس کو گھوڑے پر سے کھینچ‌کر زمین پر دے مارا۔ سپاھی ان ھاتھوں کی طرف لپکے اور ان کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ انھیں کو مارنے پیٹنے اور پکڑ پکڑکر پرے پھینکنے لگے۔ ظالموں میں کہرام مچ گیا۔ انھوں نے بھاگ نکلنے کی ٹھانی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ سب موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ اور یہ سارا کام تھا دو ھی جانداروں کا - رستم اور ریچھنی کا۔ اچانک لوگوں میں سے کوئی پکار اٹھا:

"جس نے یہ سارا کارنامہ کر دکھایا وہ رستم ھی ہو سکتا ہے۔"

اب چاروں طرف سے لوگ پکارنے لگے: "رستم پھلوان زندہ ھے! رستم پھلوان زندہ ھے!"

تھوڑی دیر بعد دونوں پھلوان اور وہ سب لوگ جنھیں انھوں نے موت کے پنجے سے چھڑا لیا تھا بڑے جوش و خروش کے عالم میں وھاں سے چلے گئے۔ شہر کے چوک میں حاکم شہر، سلیم بائے اور دیگر ظالموں، بیسیوں جلادوں اور بہت سارے سپاھیوں کی لاشیں نیز کٹھروں اور دارورسن کے ٹکڑے بکھرے رہ گئے۔

نجات پائے ھوئے لوگ اپنے بچوں کو گود میں اٹھائے خوش خوش صنوبر کے جنگل کی طرف چلے جا رہے تھے۔ ان کے آگے آگے رستم اور اس کا باپ جا رہے تھے۔ جب وہ اپنے ڈیرے پر پہنچ گئے تو صدیق موچی اپنی بیٹی کو ساتھ لئے رستم کے پاس آیا اور کہا:

"آپ کو یاد ھے، ایک دفعہ میں آپ کو ایک قصہ سنا رہا تھا کہ اتنے میں ان نام‌نہاد پندرہ عورتوں میں سے ایک آ گئی اور آپ کو اٹھا لے گئی تھی۔"

"ھاں، ھاں، کیوں نہیں۔ مجھے خوب یاد ھے۔ مجھے ھمیشہ یہی افسوس رہا ھے کہ میں آپ کے اس قصے کو آخر تک نہیں سن سکا۔"

صدیق موچی نے اپنی بیٹی کی طرف کن‌انکھیوں سے دیکھا۔ لڑکی شاید کچھ بھانپ گئی اور اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ صدیق موچی نے رستم سے کہا:

"یہ رھی میری بیٹی زھرہ۔ یہ وھی لڑکی ھے جو ظالموں کے سارے ظلم و تشدد کو برداشت کرتی ھوئی اپنے بہادر محبوب کا انتظار کرتی رھی ھے۔"

رستم نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی کے گلابی چہرے کو دیکھ‌کر دفعتاً اس کے دل میں ایک عجیب سا، بالکل نامانوس سا جذبہ کروٹیں لینے لگا۔ زبان نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ کچھ سوچتا ھوا چپ رہ گیا۔ صدیق موچی اس طرح اس کا منہ تک رہا تھا جیسے اس کے جواب کا منتظر ھو۔ بالآخر رستم نے اس سے پوچھا:

"اس کا پھلوان کون ھے؟ وہ کہاں ھے؟"

قریب ھی رستم کا باپ کھڑا یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ اس پر شاید سارا راز عیاں تھا۔ دونوں بوڑھوں نے ایک دوسرے کی طرف پرمعنی نگاھوں سے دیکھا اور پھر صدیق موچی نے رستم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ھوئے کہا:

"آپ یہ جاننا چاھتے ھیں کہ اس کا پھلوان کون ھے؟ تو لیجئے میں آپ کو بتاتا ھوں۔ یہ پھلوان وھی ھے جس نے سوال کیا ھے کہ وہ کون ھے۔"

رستم نے متعجب ہوکر اپنے باپ کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے سر کے اشارے سے صدیق موچی کی بات کی تصدیق کر دی۔

پو پھٹی۔ رات کی سیاہ چادر دنیا پر سے اٹھ گئی۔ صبح کی جان‌گداز ہوا کے جھونکوں سے صنوبر کے درخت ایک میٹھے سے آہنگ میں سرسرانے لگے۔ وہ جیسے اس بات سے خوش ہو رہے تھے کہ ان کے عزیز انسان ان کی گود میں لوٹ آئے ہیں۔ جنگل کتنے ہی دنوں کی اداس خاموشی کے بعد ایک بار پھر لوگوں کے ہنسنے بولنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ آفتابی سرزمین کے بہادر رستم کے ہاتھوں ظلم و تشدد سے نجات پاکر لوگ آزادانہ اور پرمسرت زندگی بسر کرنے لگے۔

# تین جھوٹ کے چالیس جھوٹ

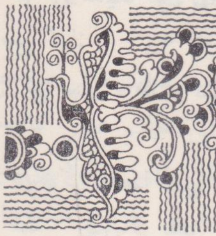

کوئی کہتا ہے کہ تھا اور کوئی کہتا ہے نہیں تھا۔ کہنےوالے کہتے ہیں کہ بھیڑیا بکاول* تھا، لومڑی یساول** تھی، قاز کرنائےنواز تھا، بطخ سرنائےنواز تھی، کوا نامی چور تھا، گوریا چغل‌خور تھی اور کسی زمانے میں کسی جگہ ایک بادشاہ رہتا تھا۔ اس کے ایک جوان بیٹی تھی۔ بہت سے ملکوں سے شہزادے اور وزیرزادے اس سے شادی کرنے آتے لیکن شہزادی اُن میں سے کسی کو بھی پسند نہ کرتی۔ ایک دن بادشاہ نے بیٹی کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا:

---

* بکاول — روایتی ازبیک کہانیوں میں استعمال ہونےوالا لفظ جس کا اردو میں مطلب ہے باورچی۔ اڈیٹر۔

** یساول — دربار میں رہنےوالے اور سفر میں بادشاہ کا ساتھ دینے اور اس کا تحفظ کرنےوالے گھڑسوار۔ اڈیٹر۔

3—1805

"میری پیاری بیٹی! میری آنکھوں کا نور! میرے دل کا سرور! میں سب بادشاہوں کو اطلاع دے چکا ہوں کہ میری بیٹی کے لئے بر چاہئے۔ اب تک کتنے بہادر جوان آ چکے ہیں مگر تم نے ان سب کو ٹھکرا دیا ہے۔ اس کی آخر وجہ کیا ہے؟ تم چاہتی کیا ہو؟"

شہزادی نے جواب دیا:

"اباجان! میں اس آدمی سے شادی کروں‌گی جو تین جھوٹ بولے اور ہر جھوٹ میں چالیس جھوٹ ہوں اور اس روانی سے بولے کہ دل کو موہ لے۔"

بادشاہ نے ہر طرف اپنے ڈھنڈورچیوں کو بھیجا جو اعلان کرتے پھرے:

"بادشاہ اس آدمی سے اپنی بیٹی کی شادی کرے‌گا جو تین جھوٹ بولے اور ہر جھوٹ میں چالیس جھوٹ ہوں۔"

ہر طرف سے شادی کے امیدوار آنے اور دربار میں حاضر ہوکر اپنے گڑھے ہوئے جھوٹے قصے سنانے لگے۔ بادشاہ نے اپنے ملک کے تمام دانشمندوں کو اپنے دربار میں جمع کیا اور ان سے کہا:

"اگر کوئی سچ مچ جھوٹ بولے تو تم لوگ کہنا کہ یہ جھوٹ ہے اور کوئی سچ بولے تو کہنا کہ سچ ہے۔ لیکن اگر تم لوگوں نے جھوٹ کو سچ، اور سچ کو جھوٹ بتایا تو تمہارے سر تن سے جدا کرواکے تمہاری ساری جائیداد لٹوا دوں‌گا۔"

مقابلہ شروع ہوا۔ بادشاہ کا داماد بننے کا ارادہ رکھنے‌والے سب باری باری اپنا جھوٹ سنانے لگے۔ ہر دفعہ جب کوئی اپنا جھوٹ سنا چکتا تو بادشاہ اپنے دانشمندوں سے پوچھتا:

"یہ جھوٹ ہے یا سچ؟"

اور ہر دفعہ دانشمند لوگ جواب دیتے:

"بادشاہ عالم! دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔"

کتنے ہی بادشاہ اور بادشاہ زادے آئے اور اپنا سا منہ لے‌کر لوٹ گئے۔

اسی شہر میں ایک غریب نوجوان رہتا تھا جو پہاڑی جنگلوں سے لکڑیاں اکٹھا کرکے لاتا اور ان کو بیچ‌کر اپنا پیٹ پالتا تھا۔ ایک دفعہ وہ لکڑیاں اکٹھا کرنے پہاڑ پر جا رہا تھا کہ اچانک بادشاہ کے ڈھنڈورچیوں کو یہ اعلان کرتے سنا کہ جو کوئی تین جھوٹ بولے‌گا، جن میں سے ہر ایک میں چالیس جھوٹ ہوں‌گے وہی شہزادی کا خاوند بنے‌گا۔

"آھا– ھا– ھا! یہ رھی بات! چلو جھوٹ بولے دیتے ھیں" اس نوجوان نے اپنے آپ سے کہا اور شاھی دربار کی راہ لی– وہ محل کے دروازے پر پہنچا تو چوکیدار اس پر پل پڑے اور اس کو دھتکارنے لگے:

"ارے تو حقیر، ناچیز گداگر! گلے سڑے بھکاری! تو یہاں کہاں سے آ گیا؟ چل! ھٹ یہاں سے! اپنا راستہ ناپ!"

نوجوان نے پہریداروں سے کہا:

"مجھے بادشاہ سے کچھ عرض کرنا ھے–"

"ارے تو گداگر بادشاہ سے کیا خاک عرض کرے گا! چل، چل! دور ھو جا یہاں سے!"

نوجوان نے دونوں ھاتھ باندھکر کہا:

"مجھے بادشاہ سے یہ عرض کرنا ھے کہ میرے مالک کے پاس دو سو بھیڑیں ھیں جن کو وہ بادشاہ کی نذر کرنا چاھتا ھے–"

یہ سنتے ھی پہریداروں میں سے ایک دوڑکر بادشاہ کے پاس گیا اور کہا:

"شہنشاہ عالم! کوئی حقیر و فقیر آدمی آیا ھے– کہتا ھے کہ میرے مالک کے پاس دو سو بھیڑیں ھیں جن کو وہ بادشاہ کی نذر کرنا چاھتا ھے–"

بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو یہاں لے آؤ– نوجوان کو بادشاہ کے سامنے حاضر کیا گیا– بادشاہ نے پوچھا:

"اے حقیر بندے! کہاں ھیں تیری بھیڑیں؟"

غریب نوجوان نے کہنا شروع کیا:

"بادشاہ اعظم! اجازت پاؤں تو عرض کروں– میں ایک غریب اور ناتواں یتیم ھوں– میں اپنے ماں باپ کی اکیلی اولاد تھا– میرے بھائی سب کے سب مر گئے اور ھم صرف تین بھائی زندہ رہ گئے– ھم تینوں بھائیوں نے نہ کبھی ایک دوسرے کو دیکھا اور نہ ھی ایک دوسرے کو جانتے تھے– اچانک ھماری ملاقات ھو گئی اور ھم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا– دیکھتا کیا ھوں کہ ھم میں سے ایک کا چغا بغیر گریباں کا ھے، دوسرے کا بغیر آستینوں کا اور تیسرے کا بغیر دامن کا– جیساکہ کہتے ھیں، "اندھا اندھے کو اندھیرے میں پہچانے،" ھم آپس میں مل گئے، ایک دوسرے سے گھل مل گئے اور مل کر چلے– بغیر راستے پر پاؤں رکھے اور بغیر راستے سے باھر آئے ھم چلتے گئے– ایک جگہ اچانک کیا دیکھتے ھیں کہ زمین پر تین سکے پڑے ھیں– ان میں

سے دو بالکل گھسے پٹے ہیں اور تیسرے پر مہر غائب ہے۔ جس سکے پر مہر نہیں تھی اس کو ہم نے اٹھا لیا اور آگے چلے۔ چلتے گئے، چلتے گئے، بہت دور نکل گئے۔ پھر چلتے گئے، چلتے گئے اور ایک نشیب میں اتر گئے۔ دیکھا، نالے میں چارے میں کام آنےوالی تین چھوٹی مچھلیاں پڑی ہیں۔ دو تو بالکل بےجان ہیں اور تیسری مری ہوئی ہے۔ ہم نے مری ہوئی چھوٹی مچھلی کو اٹھاکر اس چغے کے دامن میں رکھا جس میں دامن تھا ہی نہیں اور آگے چل نکلے۔ چلتے چلتے ایک جگہ پہنچ کر ہم نے دیکھا، سامنے تین مکان کھڑے ہیں۔ ان میں سے دو اوپر سے کھلے ہوئے ہیں اور تیسرا بغیر دیواروں کا ہے۔ جو مکان بغیر دیواروں کا تھا ہم اس کے اندر گئے۔ وہاں تین دیگ پڑے تھے۔ دو تو چھلنی جیسے تھے اور تیسرے کا پیندا غائب تھا۔ ہم نے مری ہوئی ننھی مچھلی کو اس دیگ میں ڈالا جس میں پیندا نہیں تھا اور پھر ادھر ادھر لکڑیاں تلاش کرنے لگے۔ لیکن لکڑی وکڑی کچھ نہ ملی۔ چنانچہ ہم بغیر آگ جلائے اسے پکانے لگے۔ ہم نے خوب ڈٹ کر پکایا۔ ہڈیاں تو خوب پک گئیں لیکن گوشت کچا کا کچا رہ گیا۔ ہم نے ڈٹ کر گوشت کھایا۔ ہمارے پیٹ بھر گئے۔ اتنے پھول گئے کہ جب ہم نے باہر نکلنا چاہا تو دروازے سے نہ نکل سکے۔ دیوار میں ایک درار مل گئی۔ اس سے ہوکر ہم باہر آئے اور آگے چل پڑے۔ راستے پر ہم چلتے گئے، چلتے گئے اور ایک لق و دق صحرا میں پہنچے۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ سامنے گھاس کے اندر خرگوش کا ایک بچہ چھپا بیٹھا ہے۔ وہاں ایک درخت تھا۔ اس کی ایک شاخ سے ہم نے بغیر کاٹے ایک ڈنڈا بنا لیا اور یہ ڈنڈا خرگوش کے بچے کو کھینچ کر مارا۔ وہ تین قلابازیاں کھاکر گر پڑا۔ ہم نے اس کو پکڑ لیا اور کاٹا تو اس میں چھے من گوشت اور اتنی ہی چربی نکلی۔ گوشت کو ہم نے پکایا نہ سکھایا، وہیں بیٹھکر کھا لیا۔ لیکن پیٹ نہیں بھرا، ہم بھوکے کے بھوکے رہ گئے۔ میرے دونوں بھائی مجھ پر ناراض ہو گئے اور روٹھکر چلے گئے۔ میں خوش ہوا کہ ساری چربی میری ہو گئی۔ میں نے لانگ بوٹ جیسے چمڑے کے پاتابے اتارے اور ان پر چربی کی مالش کرنے لگا۔ ساری چربی چمڑے کا ایک ہی پاتابہ کھا گیا اور دوسرا بغیر مالش کے رہ گیا۔ میں بہت تھک گیا تھا، پڑکر سو گیا۔ اچانک شور اور دھکم دھکا کی آواز سنائی دی اور میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میرے دونوں پاتابے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ میں نے دونوں کے منہ پر ایک ایک گھونسا مارا اور پھر پڑکر سو گیا۔ آدھی رات کے وقت سردی سے میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میرا چغا جس کو اوڑھکر میں سویا تھا غائب ہے۔ پتہ

چلا کہ میرے اس پاتابے نے جس پر چربی کی مالش کی ہوئی تھی میرے اوپر سے چغے کو کھینچ کر اپنے آپ کو اس میں لپیٹ لیا ہے اور سو گیا ہے اور وہ پاتابہ جس پر مالش نہیں ہوئی تھی روٹھ کر چلا گیا ہے۔ میں نے مالش کئے ہوئے پاتابے کو جگایا، اس کو اپنے پاؤں میں ڈالا، چغے کو پہن کر اوپر سے پٹکا باندھا، چغے کے دامن کو جو تھا ہی نہیں، اٹھاکر کمر میں ٹھونس لیا اور اپنے گھر کو چلا۔ جب میں گھر سے گیا تھا تو وہاں میری ماں اور ایک مرغا دونوں رہ گئے تھے۔ اب واپس آکر دیکھتا ہوں کہ وہاں نہ ماں ہیں اور نہ ہی مرغا۔ اچانک اپنے پاؤں کی طرف دیکھا تو پتہ چلا کہ میرا جو ایک پاتابہ رہ گیا تھا وہ بھی غائب ہو چکا ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ سوچا، یہ کیا مصیبت ہے؟ ان کو اب کہاں تلاش کروں؟ فریاد لے کر آپ کی بارگاہ میں آیا۔ دروازے پر آپ کے نوکر کھڑے تھے، انہوں نے مجھے اندر نہیں آنے دیا۔"

اتنا کہہ کر غریب نوجوان نے اپنا سر جھکا لیا اور چپ ہو گیا۔

اس کی باتیں سن کر بادشاہ کو بڑا تعجب ہوا اور اس نے اپنے دانشمندوں کی طرف دیکھا۔ دانشمند لوگ سب اٹھ کھڑے ہوئے، جھک جھک کر آداب بجا لائے اور ایک زبان ہوکر کہا:

"شہنشاہ عالم! اس کتیا کے پلے نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ ہے۔ سراسر جھوٹ۔ اپنے مالک کی بھیجی ہوئی بھیڑوں کے بارے میں بھی یہ شاید یہی کہے گا کہ وہ گم ہو گئی ہیں۔"

بادشاہ دفعتاً نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے گرج اٹھا:

"کہاں ہیں بھیڑیں، بتا۔"

"بادشاہ اعظم! اجازت پاؤں تو عرض کروں" نوجوان نے کہنا شروع کیا۔ "جب آپ کے نوکروں نے مجھے اندر نہ آنے دیا تو میں بہت اداس ہو گیا اور اپنی ماں، مرغے اور چربی سے مالش کئے ہوئے پاتابے کی تلاش میں چل پڑا۔ چلتے چلتے ایک گاؤں میں پہنچا۔ دیر تک لوگوں سے پوچھ تاچھ کرتا ڈھونڈتا پھرا۔ آخر کسی طرح مرغا مل گیا۔ وہ ایک زمیندار کے کھیت میں ہل چلا رہا تھا۔ ہم دونوں نے سلام علیک کیا اور گلے ملے۔ معلوم ہوا کہ چھے مہینے تک برابر محنت کرکے مرغے نے بوریاں سینے کی ایک سوئی کمائی ہے اور اس کو بھی مالک اپنے پاس رکھے ہوئے ہے۔ میں نے لڑ جھگڑ کر اس سے وہ سوئی حاصل کر لی۔ پھر میں نے مرغے سے کہا: "چلو، گھر چلیں۔" اس نے کہا: "نہیں، میں ابھی نہیں چلوں گا۔ میں چھے مہینوں کے لئے بھرتی ہوا ہوں۔

تین مہینے گزر چکے ھیں اور تین مہینے باقی ھیں۔ مدت پوری ھو جائے گی تو میں اپنی اجرت لے کر خود گھر آ جاؤں گا۔"

میں نے سوئی کو لے لیا اور مرغے کو وھیں چھوڑکر گھر روانہ ھو گیا۔ واپس آکر کیا دیکھتا ھوں کہ میرا مکان غائب ھے۔ میں اتنا اداس ھوا، اتنا اداس ھوا کہ کیا بتاؤں۔ اپنی بوڑھی ماں اور مالش کئے ھوئے پاتابے کی تلاش میں نکل گیا۔ ایک ٹیلے پر چڑھ‌کر دیکھا تو وہ کہیں دکھائی نہ دئے۔ ایک پہاڑی پر چڑھ‌کر چاروں طرف دیکھا تو نظر نہ آئے۔ مایوس ھوکر نیچے اتر آیا۔ میرے پاس جو سوئی تھی اس کو میں نے زمین میں گاڑ دیا اور اس پر چڑھ‌کر ادھر ادھر نظر دوڑائی تو کیا دیکھتا ھوں کہ میری بوڑھی ماں سیردریا کے کنارے پر بیٹھی کپڑے دھو رھی ھیں۔ میں نے سوئی اٹھا لی اور چل پڑا۔ کتنے ھی ٹیلوں اور پہاڑیوں پر سے گزرکر بالآخر اپنی ماں کے پاس پہنچا۔ معلوم ھوا کہ جب میں گم ھو گیا تھا تو میری ماں ایک امیر آدمی کے ھاں نوکری کرنے لگی تھیں۔ میں نے ماں سے کہا: "چلئے، گھر چلیں۔" ماں نے کہا: "نہیں، میں ابھی گھر نہیں چلوں گی۔ اپنی اجرت وصول کرکے آؤں گی۔ میں نے تین سال تک نوکری کرکے تین مہینوں کی روٹی کمائی ھے۔ اب تین مہینے اور باقی رہ گئے ھیں۔ یہ مدت پوری کرکے میں خود ھی گھر آ جاؤں گی۔ تم اکیلے چلے جاؤ۔"

میں نے اپنے ماتھے پر ایک چپت ماری، اپنے چغے کے دامن کو جو تھا ھی نہیں، پٹکے میں ٹھونس لیا اور واپس چل پڑا۔ تھوڑی دور پہنچا تو دیکھا کہ دریا کا پانی پھیل گیا ھے اور دریا پر جو پل تھا اس کو بہاکر لے گیا ھے۔ چلچلاتی دھوپ پھیلی ھوئی تھی۔ مجھے بڑی پیاس لگی تھی۔ پانی پینے گیا تو دیکھا کہ دریا کا پانی جم گیا ھے۔ میں نے برف کو توڑنا چاھا لیکن پتھریلی زمین پر کوئی پتھر نہیں ملا جس سے میں برف کو توڑ سکتا۔ لاچار ھوکر میں نے اپنے سر سے برف کو توڑا۔ گڑھے میں اپنا سر ڈال‌کر خوب ڈٹ‌کر پانی پیا اور پھر آگے چل پڑا۔ چلتے چلتے مجھے اچانک اپنی سوئی یاد آ گئی۔ میں واپس دریا کے کنارے گیا۔ جاکر دیکھتا ھوں کہ سوئی وھاں نہیں ھے۔ میں بہت اداس ھو گیا کہ میرے پاس لے دے کے یہی ایک چیز تھی، اب وہ بھی مجھ سے چھن گئی۔ اداس اور پریشان میں اپنی ماں کے پاس واپس گیا۔ تب تک ان کی نوکری کی مدت پوری ھو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے مالک سے کہا کہ میری مدت پوری ھو گئی ھے۔ میری اجرت دے دو، میں چلتی ھوں۔ مالک ان پر چیخنے چلانے لگا: "ایں! تجھے اب اجرت بھی دینی پڑے گی؟" یہ کہہ‌کر اس نے میری

ماں کے زور سے ایک مکا جو مارا تو بیچاری نے وهیں گر کر دم توڑ دیا– "هائے! یه کیا مصیبت بھری زندگی هے!" میں نے بہت اداس هوکر سوچا اور اپنی فریاد لےکر آپ کی بارگاہ میں آیا– لیکن آپ کے نوکروں نے مجھے اندر نہیں آنے دیا–"

اتنا کہہ کر نوجوان نے اپنی گردن جھکا لی اور خاموش هو گیا–

بادشاہ کو اور زیادہ تعجب هوا اور اس نے پھر اپنے دانشمندوں کی طرف دیکھا– دانشمندوں میں سے ایک جو سب سے زیادہ دانشمند تھا، کھڑا هو گیا اور زمین تک جھک کر کہا:

"شہنشاہ عالم! اس کتیا کے پلے کی باتوں پر یقین نه کیجئے گا– اس ذلیل کی ایک ایک بات جھوٹ هے– سفید جھوٹ– آپ اس سے بھیڑوں کا تقاضا کیجئے– یه شاید کہے گا که وہ چوری هو گئیں–"

"بادشاہ اعظم! آپ کی اجازت پاؤں تو کچھ عرض کروں" نوجوان نے پھر کہنا شروع کیا– "جب مجھ کو اندر نہیں جانے دیا گیا تو میں نے سوچا، چلو چل کر میں خود هی اس ظالم کی خبر لوں– یه سوچ کر میں واپس اس امیر آدمی کے پاس پہنچا جس نے میری ماں کو مار ڈالا تھا– پہنچتے هی میں چیخ کر کہنے لگا: "بڑھیا کی اجرت دے دو– تم نے اس کا خون کیا هے– اس کے خون کی قیمت ادا کرو" یه کہتے هوئے میں نے اس ظالم کو گریباں سے پکڑ لیا اور کھینچتا هوا باهر سڑک پر لے آیا– لوگ جمع هو گئے اور انهوں نے جھگڑا میرے حق میں طے کر دیا– اس ظالم نے مجھے ایک گدھا دیا– میں اس گدھے پر سوار هوکر اپنے گھر کو چلا– چلتا رها، چلتا رها اور ایک جگه میں نے دیکھا که سامنے سے اونٹوں اور گھوڑوں کے چالیس قافلے آ رهے هیں– قافلوں کے سردار نے پکار کر مجھ سے کہا: "اے گدھے والے! تمہارے گدھے کی پیٹھ کی کھال چھل گئی هے– نیچے اتر جاؤ– اس کی پیٹھ کا کپڑا ٹھیک کر دو–" میں فوراً گدھے پر سے اتر پڑا اور دیکھا که گدھے کی پیٹھ پر واقعی زخم پڑ گیا هے– میں نے اسی آدمی سے پکار کر پوچھا: "اے! اس کی دوا کیا هے؟" اس نے ایک اخروٹ میری طرف بڑھاتے هوئے کہا: "اس اخروٹ کو جلاکر اس کی راکھ گدھے کے زخم پر لگا دینا– ٹھیک هو جائے گا–"

میں نے اخروٹ کو جلاکر اس کی راکھ زخم پر لگائی اور پھر گدھے کی پیٹھ کو دوبارہ کپڑے سے ڈھانپنے کو هوا تو کیا دیکھتا هوں که گدھے کی پیٹھ پر اخروٹ کا ایک پودا اگ آیا هے– وہ پودا دیکھتے هی دیکھتے ایک بڑا سا درخت بن گیا– دیکھتے

ھی دیکھتے اس پر پھول لگے، پھر پھل آئے اور آنکھ جھپکتے میں وہ پھل پک کر تیار ہو گئے— اب کیا کیا جائے، میں نے سوچا— "اگر درخت پر چڑھکر اس کو ھلانے لگوں تو گدھے کی پیٹھ کو خراب کر ڈالوں گا— بہتر یہی ھے کہ اخروٹوں کو پتھر مارکر گراؤں"— یہ طے کرکے میں نے گدھے کو ایک ایسی جگہ لے جاکر کھڑا کر دیا جہاں پتھر وتھر کچھ نہیں تھا— میں نے آستینیں چڑھائیں اور پتھر اخروٹ کے درخت پر پھینکنے لگا— پھینکتا رھا، پھینکتا رھا لیکن نہ کوئی پھینکا ھوا پتھر نیچے گرا اور نہ ھی کوئی اخروٹ— پھر بھی میں مایوس نہ ھوا اور پتھر پھینکتا چلا گیا— بالآخر سارے پتھر ختم ھو گئے— اب مجھے خود اس کے اوپر چڑھنا پڑے گا، میں نے سوچا اور یہ سوچ کر درخت کے اوپر چڑھ گیا— کیا دیکھتا ھوں کہ وھاں ایک لمبا چوڑا باغ ھے اور اس کے سرے پر ایک نالا ھے جو ایک دلربا آھنگ میں گیت گاتا ھوا بہہ رھا ھے— "آھا—ھا ھا! تربوز اگانے کے لئے کیا اچھا باغ ھے!" میں نے خوش ھوکر سوچا اور فوراً ھی وھاں تربوز کے بیج بو دئے— دیکھتے ھی دیکھتے ایسے تربوز تیار ھو گئے کہ کیا کہنے— اتنے بڑے بڑے کہ کوئی دونوں ھاتھ پھیلاکر بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکتا— میں نے ایک تربوز توڑ لیا— نالے کے کنارے بیٹھ گیا اور ابھی چھری کے نوک کو تربوز میں گاڑا ھی تھا کہ تربوز تڑاخ سے پھٹ گیا اور چھری میرے ھاتھ سے چھوٹ کر اس کے اندر گر گئی— میں اس کو اٹھانے کے لئے جھکا تو خود بھی تربوز کے اندر گر گیا— میں بہت دیر تک وھاں اپنی چھری کی تلاش میں پھرتا رھا— دفعتاً مجھے ایک آدمی مل گیا— میں نے اس سے پوچھا: "صاحب! آپ نے راستے پر کہیں کوئی چھری تو نہیں دیکھی؟" "ارے آپ کو کسی چھوٹی سی چھری کی تلاش ھے؟" اس آدمی نے کہا— "یہاں ھم تو چالیس قافلے تھے اور ھر ایک قافلے میں چالیس اونٹ تھے— جانے وہ سب کہاں گم ھو گئے—"

"بادشاہ اعظم! اسی مصیبت کا قصہ سنانے کے لئے میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ھوا ھوں—"

اتنا کہہ کر غریب نوجوان نے اپنا سر جھکا لیا اور چپ ھو گیا—

بادشاہ سوچ میں پڑ گیا— اس کے دانشمندوں میں سے ایک اٹھ کھڑا ھوا اور بہت ھی جھک کر آداب بجا لانے کے بعد کہنے لگا:

"شہنشاہ عالم! اپنے خزانے سے دو چار سکے دے دلاکر اس کتے کے پلے کو چلتا کیجئے—"

شہزادی دروازے کے پیچھے کھڑی ساری باتیں سن رہی تھی۔ وہ فوراً اپنے باپ کے پاس آئی اور کہنے لگی:

"اس نے میری تینوں شرطیں پوری کر دی ہیں۔ غریب ہے تو کیا ہوا؟ میں اس کے ساتھ شادی کروں گی۔"

غریب نوجوان نے جھک کر بادشاہ کی تعظیم کی اور پھر کہا:

"بادشاہ اعظم! میں کتنے ہی سالوں تک پہاڑی چراگاہوں میں اپنے مالک کی بھیڑ بکریاں چراتا رہا ہوں۔ اس محنت کے عوض میں اسے مجھے دو سو بھیڑیں دینی تھیں۔ لیکن اس نے بھیڑیں مجھے نہیں دیں اور مجھ کو نکال دیا۔ از راہ کرم آپ اس آدمی سے میری دو سو بھیڑیں دلا دیجئے۔ میں ان کو شادی کے جہیز میں دوں گا۔"

بادشاہ نے بڑی دھوم دھام سے اس غریب نوجوان کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کردی۔

اس محفل میں ہم بھی شریک تھے۔ ہم نے خوب پلاؤ کھایا۔ پلاؤ کا روغن مونچھوں سے ٹپکا لیکن منہ میں نہ آیا۔

# زیاد باتر

بہت پرانے زمانے کی بات ہے، کسی جگہ سلطان نام کا ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے ایک بیٹی تھی۔ نام تھا قمرخان۔ وہ بہت ہی شرم حیا والی، عقلمند اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اس میں اور بھی بہت سے گن تھے۔ تیراندازی، نیزہ بازی اور تلوار چلانے میں عورتیں تو کیا، کوئی مرد بھی اس کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔

بادشاہ سلطان کو اپنی بیٹی، بیٹے سے بھی بڑھکر عزیز تھی۔ اور جو مرد قمرخان سے شادی کرنے کے لئے بےتاب تھے ان کی کوئی گنتی نہیں تھی۔ دور اور نزدیک کے ملکوں سے کتنے ہی شہزادے اور وزیرزادے اس سے شادی کرنے کی آرزو لےکر آتے

لیکن قمرخان کو ان میں سے کوئی پسند ھی نہیں آتا تھا— جب بھی کہیں سے پیغام آتا قمرخان کہہ دیتی کہ مجھے شادی نہیں کرنی ھے—

بادشاہ کے دربار میں ایک ماہر فن کاریگر تھا جو ھر ھنر میں یکتا تھا— اس کی بنائی ھوئی چیزیں بادشاہ کو بہت پسند آتی تھیں— چنانچہ اس نے اس بوڑھے کاریگر کو شاھی محل میں کام کرنےوالے تمام ھنرمندوں کا سردار مقرر کر دیا تھا—

اس بوڑھے کاریگر کے ایک بیٹا تھا جس کی عمر بیس سال کی ھو چکی تھی— وہ بہت خوبصورت اور سجیلا جوان ھونے کے ساتھ ساتھ بڑا ھوشیار اور جیالا بھی تھا— اس کا نام تھا زیاد باتر (زیاد پہلوان)— پہلوانوں میں اس کی بڑی عزت اور شہرت تھی—

بوڑھے کاریگر کو اپنے بیٹے کو ھنر سکھانے کی خواھش پیدا ھوئی— اس نے بیٹے کو اپنے پاس بلاکر اس سے کہا:

"بیٹے! اب تم ھنر سیکھو— آگے چل کر وہ تمہارے کام آئے گا—"

تھوڑے دنوں میں زیاد باتر نے اپنے باپ سے بہت سے ھنر سیکھ لئے— بوڑھا کاریگر اپنے بیٹے کی ذھانت اور ھوشیاری کو دیکھکر بہت خوش ھوتا تھا— لیکن اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا بیٹا محبت کی آگ میں جل رھا ھے— نوجوان راتوں کو سو نہیں پاتا تھا، بس آنسو بہاتا اور حسین شہزادی قمرخان کے خیال میں تڑپتا رھتا تھا—

ایک دن شہزادی قمرخان نے بوڑھے کاریگر سے فرمائش کی کہ وہ اس کے لئے ایک کمان بنا دے— کاریگر فوراً اس کام میں لگ گیا اور کچھ ھی دنوں میں اس نے وہ کمان تیار کر لی—

زیاد باتر بھی چوری چھپے ایک کمان بنانے میں لگا ھوا تھا— جب کمان بن کر تیار ھوئی تو نوجوان اسے اپنے باپ کو دکھایا— بیٹے کا ھنر دیکھکر بوڑھا کاریگر دنگ رہ گیا— بیٹے کی کمان خود اس کی کمان سے کہیں اچھی بنی تھی— اس کو ھاتھ میں لینے پر کوئی بھی اس کی خوبصورتی اور نزاکت کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا— اس پر ایک عشقیہ شعر کندہ کیا ھوا تھا—

بوڑھا کاریگر بہت خوش ھوا— اس نے بڑے پیار سے بیٹے کے ماتھے کو چوم لیا اور کہا:

"شاباش بیٹے! میں بہت خوش ھوں کہ تم میرے اوزاروں سے اس صفائی سے کام لینا سیکھ گئے ھو— اب تمہیں کبھی فاقہ نہیں کرنا پڑے گا—"

بوڑھے کاریگر نے خود جو کمان بنائی تھی اس کو اپنے پاس رکھ لیا اور جو کمان اس کے بیٹے نے بنائی تھی اسے شہزادی کو بھیج دیا۔ زیاد باتر کی بنائی ہوئی کمان شہزادی کو بہت پسند آئی۔ اسے اسی قسم کی کمان کی آرزو تھی۔ چنانچہ اس نے بوڑھے کاریگر کو بیش بہا انعام بھیجا۔

تھوڑے دنوں بعد بوڑھے کاریگر کا انتقال ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کی جگہ اس کے بیٹے زیاد باتر کو درباری کاریگروں کا سربراہ بنا دیا۔

ایک دن بادشاہ سلطان اپنی بیٹی کے کمرے میں آیا تو اس کی نظر دیوار سے لٹکی ہوئی ایک کمان پر پڑی جو خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ بادشاہ نے اس کمان کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی باریکیوں کو دیکھکر دنگ رہ گیا۔ اچانک اس کی نظر کمان پر کندہ کئے ہوئے شعر پر پڑی۔ اس کو پڑھا تو بادشاہ کے تیور چڑھ گئے۔ اس نے فوراً زیاد باتر کو بلوایا اور اس سے گرج کر پوچھا:

"کمان پر یہ شعر کس نے لکھا ہے؟"

"میں نے لکھا ہے" زیاد باتر نے جواب دیا۔

"اچھا!" بادشاہ نے آگ بگولہ ہوکر کہا۔ "کیا یہ کچھ کم تھا کہ میں نے تم کو سب کاریگروں کا سردار بنا دیا؟ اب تم میری بیٹی پر پیار محبت کے شعر بھی کہنے لگے؟"

اس نے جلاد کو بلاکر حکم دیا کہ اس کو قتل کر دو۔ لیکن ایک وزیر زیاد باتر کے اڑے آ گیا۔ اس کی سفارش پر بادشاہ نے نوجوان کی جان تو بخش دی لیکن اس کو شہر سے نکال دیا۔

زیاد باتر گھوڑے پر سوار ہوکر کسی دوردراز ملک کے لئے چل دیا۔ وہ بہت دنوں تک چلتا رہا۔ بیابانوں کو پار کیا، ٹیلوں اور پہاڑیوں پر سے گزرا اور ایک دن ایک اونچے پہاڑ تک پہنچا۔ دیکھا کہ چاروں طرف ہری ہری گھاس اگی ہوئی ہے، ہوا صاف و شفاف ہے، سارا ماحول اتنا روح افزا ہے کہ ہر ایک راہی کو آرام کی دعوت دیتا ہے۔ اتنے میں ایک بوڑھا چرواہا گھوڑوں کے ایک گلے کو چراتا ہوا نظر آیا۔ زیاد باتر اس کے پاس گیا، اس کو ادب سے سلام کیا اور گھوڑے سے اترکر آرام کرنے کے لئے ہری بھری گھاس پر بیٹھ گیا۔ بوڑھے نے یہ دیکھکر کہ نوجوان بہت تھکا ہوا ہے اپنے چمڑے کے تھیلے سے ایک پیالے میں قمیز (گھوڑی کا دودھ) انڈیل کر نوجوان کو دیا۔ وہ قمیز پی چکا تو بوڑھے نے اس سے پوچھا:

"کہاں سے آ رہے ہو، بیٹے؟"

زیاد باتر نے اپنی آپ بیتی بوڑھے کو سنا دی۔ بوڑھے کو اس پر رحم آ گیا۔ اس نے پوچھا:

"اب کہاں جا رہے ہو؟"

"اب کہاں جانا ہے، بابا" زیاد باتر نے جواب دیا۔ "وہ راہی جو گھر سے بے گھر ہو گیا ہو، اپنے ملک سے نکال دیا گیا ہو، جا ہی کہاں سکتا ہے۔ بس یوں ہی چلا جا رہا ہوں جہاں سینگ سمائے۔"

"میں کتنے ہی سالوں سے یہاں پہاڑی لوگوں کے گھوڑوں کو چراتا ہوں" بوڑھے نے کہا۔ "میں نے اپنے باپ دادا سے یہی چرواہے کا کام سیکھا تھا۔ یہ زندگی تمہیں پسند ہو تو میرے ساتھ رہو۔ میرے بیٹے بن کر رہو۔"

بوڑھے کی یہ بات زیاد باتر کو بہت پسند آئی۔ اس نے خوش ہوکر کہا:

"بابا، آپ مجھ کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں اور پھر اپنا بیٹا بنانے کو بھی تیار ہیں تو میں بڑی خوشی سے آپ کے ساتھ رہوں گا۔"

اس طرح زیاد باتر بوڑھے چرواہے کے ساتھ رہ گیا اور گھوڑے چرانے لگا۔ اس نے پتھر پھینکنا اچھی طرح سیکھ لیا۔ جب گھوڑوں کے گلے پر درندے حملہ کرتے تو زیاد باتر اس طرح پتھر پھینکتا کہ وہ نشانے پر لگتے اور درندے بھاگ کھڑے ہوتے۔ اس نے بہت سے درندوں کو اس طرح مار بھی ڈالا۔ پہلے ہر سال خونخوار جانوروں سے گھوڑوں کو جانے کتنا نقصان ہوتا تھا۔ اب گھوڑے بڑے چین و آرام سے چرنے لگے زیاد باتر کی شہرت کوہستان پر دور دور تک پھیل گئی۔

زیاد باتر اپنے بوڑھے بابا کے ساتھ اپنے گھوڑے چراتا رہے اور اب ہم شہزادی قمرخان کا کچھ حال سنیں۔

---

شہزادی قمرخان کسی سے ذکر تو نہیں کرتی تھی کہ اسے زیاد باتر سے محبت ہے۔ لیکن اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ اگر شادی کروں گی تو صرف زیاد باتر سے۔ جس دن بادشاہ سلطان نے زیاد باتر کو شہر سے نکال دیا اسی دن سے قمرخان کی نظروں میں دنیا نے سیاہ چادر اوڑھ لی۔ وہ دن دن بھر زیاد باتر کے خیالوں میں ڈوبی رہتی اور ساری ساری رات روتے گزارتی تھی۔

اس نے بہت دنوں تک اپنا راز سینے میں چھپائے رکھا۔ اس کی چالیس کنیزیں تھیں۔ سب سے بڑی کنیز کا نام تھا ہمایوں۔ آخر ایک دن شہزادی قمرخان سے نہ رہا

گیا اور اس نے اپنی کنیز ہمایون کو اپنے دل کا حال سنا دیا- اپنا غم غلط کرنے کے لئے وہ اکثر شکار کھیلنے جانے لگی-

موسم بہار میں ایک دن قمرخان اپنے باپ سے اجازت لےکر اپنی کنیزوں کے ساتھ شکار کھیلنے نکلی- ان سب نے مردانہ لباس پہن رکھے تھے- گھوڑوں پر سوار وہ ایک جنگل میں پہنچیں- وہاں انہوں نے کئی پرندوں کو شکار کیا لیکن اس سے ان کا جی نہ بھرا اور وہ کوئی جانور تلاش کرنے لگیں- دور سے ایک پہاڑ دکھائی دیا- وہ اتنا اونچا تھا کہ جیسے آسمان کو چھو رہا ہو- قمرخان اپنی کنیزوں کے ساتھ گھوڑے کو دوڑاتی ہوئی اس پہاڑ تک پہنچی- اچانک ایک گھاٹی میں سے ایک بھیڑیا نکل آیا- قمرخان نے فوراً تیر مارکر اس کو ہلاک کر دیا- اس نے گھوڑے سے اترکر بھیڑیے کی کھال اتاری اور اپنی ایک کنیز کے ھاتھ میں تھما دی اور پھر سب گھوڑوں پر چڑھکر آگے چل پڑیں- چلتے چلتے وہ ایک جنگل میں پہنچیں- وہاں ایک ھرنی چرتی ہوئی نظر آئی- اس کے کانوں میں سونے کے حلقے تھے- سینگوں پر سونے کی مہریں لگی ہوئی تھیں اور اس کی گردن بیش‌قیمت ھاروں سے سجی ہوئی تھی- ھرنی نے قمرخان کا دل موہ لیا اور اس نے اسے زندہ پکڑنے کا فیصلہ کر لیا- کنیزیں ھاتھوں میں رسیاں لےکر ھرنی کو گھیرنے کی کوششیں کرنے لگیں- قمرخان نے اس پر پھندا پھینکا لیکن چوک گئی- اس نے تین دفعہ کوشش کی مگر ھرنی ھاتھ نہ آئی- کنیزوں کے سامنے اس کو اپنی ناکامی پر بڑی شرم آئی- وہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتی ہوئی ھرنی کا پیچھا کرتی رہی- اس کا گھوڑا تو ھوا سے باتیں کر رہا تھا لیکن پھر بھی ھرنی تک کسی طرح نہیں پہنچ پاتا تھا- قمرخان ھرنی کا پیچھا کرتی ہوئی اپنی کنیزوں سے بہت آگے نکل گئی- پھر ھرنی اور قمرخان کا گھوڑا دونوں کنیزوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے- دوڑتے دوڑتے ھرنی بھی تھک گئی اور قمرخان کا گھوڑا بھی بےحال ہو گیا- ھرنی ھانپتی ہوئی ایک غار کے اندر گھس گئی- شہزادی بہت خوش ہوئی کہ بس اب ھرنی ھاتھ آ گئی- یہ سوچ کر وہ بھی ھرنی کے پیچھے پیچھے غار کے اندر داخل ہوئی- لیکن اندر جاکر کیا دیکھتی ھے کہ غار میں دوسری طرف کو بھی راستہ ھے اور ھرنی اسی میں سے باہر نکل گئی ھے-

شہزادی پھر گھوڑے پر چڑھکر ھرنی کا پیچھا کرنے لگی- ھرنی کے پیچھے پیچھے گھوڑا دوڑاتے ہوئے وہ اس پہاڑ تک جا پہنچی جہاں زیاد باتر گھوڑے چرا رہا تھا- کسی شکاری کو ھرنی کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھکر زیاد باتر نے ھرنی پر زور سے

ایک پتھر پھینکا۔ پتھر نشانے پر لگا۔ ہرنی کی ایک سینگ ٹوٹ گئی اور وہ خود بھی گر پڑی۔ یہ دیکھکر شہزادی قمرخان کو غصہ آ گیا۔ اس نے اپنی تلوار غلاف سے کھینچ لی اور گرج کر زیاد باتر سے کہا:

"ابے چرواہے! گستاخ کہیں کے! یہ تم نے کیا کر ڈالا۔ میں مارنا چاہتی تو اس کو کبھی کی مار چکی ہوتی۔ میں تو اس کو زندہ پکڑنا چاہتی تھی۔ تو کون ہوتا ہے دوسروں کی ہرنی پر پتھر پھینکنے والا؟"

یہ کہتے ہوئے قمرخان چرواہے پر تلوار سے وار کرنے ہی والی تھی کہ اچانک ایک چٹان کے پیچھے سے ایک ہیبت‌ناک شیر نکل آیا۔ قمرخان کا گھوڑا گھبراکر پیچھے ہٹ گیا۔

قمرخان گھوڑے پر سے گر پڑی اور تلوار سے اس کا ایک ہاتھ بری طرح زخمی ہو گیا۔

ادھر زیاد باتر نے شیر کو دیکھ لیا اور اس پر ایک پتھر کھینچ کر مارا۔ شیر شہزادی پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ پتھر اس کے سر پر جا لگا اور وہ وہیں گرکے ٹھنڈا ہو گیا۔

زیاد باتر دوڑکر شکاری کے پاس آیا۔ دیکھا کہ ایک نقاب‌پوش نوجوان زخمی ہوکر بےہوش ہو گیا ہے۔ اس نے فوراً اپنا کرتا اتارا اور اس کو پھاڑکر نوجوان کے زخمی ہاتھ پر اس کی پٹی باندھ دی۔

"اس نوجوان کی جان بچانا چاہئے" زیاد باتر نے سوچا۔ "اگر یہ بیکار میں مر گیا تو کتنی افسوس‌ناک بات ہوگی۔"

وہ جاکر پانی لے آیا اور نوجوان کے منھ پر چھینٹے مارے لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

"نقاب ہٹاکر اس کو پانی پلانا چاہئے" زیاد باتر نے سوچا اور اس نے شکاری کے چہرے سے نقاب اتار لیا۔ نقاب کے نیچے دبے ہوئے کالے کالے گھنگھریالے بال بکھر گئے۔ زیاد باتر نے دیکھا کہ اس کے سامنے اس کی محبوبہ قمرخان پڑی ہوئی ہے۔ اس کو اتنی خوشی اور ساتھ ہی ساتھ اتنا دکھ ہوا کہ وہ بےہوش ہوتے ہوتے رہ گیا۔

"میری جان! ذرا اپنی آنکھیں کھولو۔ ذرا اٹھ کھڑی ہو" اس نے پیار بھرے لہجے میں قمرخان سے کہا۔ "تم اپنی تلوار سے مجھ کو مار ڈالنا چاہتی تھیں۔ لو مار ڈالو۔ لیکن اس طرح بےہوش و حواس نہ پڑی رہو۔ اپنی آنکھیں کھول دو۔"

زیاد باتر قمرخان کے پاس بیٹھا ہوا کچھ دیر تک اسی طرح کی باتیں کرتا رہا، اس کی منتیں کرتا رہا۔ بالآخر قمرخان کو ہوش آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ وہی چرواہا اس کے پاس بیٹھا ہوا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اس نے چرواہے کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تو اپنے محبوب کو پہچان گئی۔ پہچانتے ہی دوبارہ بےہوش ہو گئی۔

اتنے میں قمرخان کی کنیزیں ایک ایک کرکے پہنچنے لگیں۔ ہمایون نے شہزادی کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا اور روتی ہوئی اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے اس کے زخم پر مرہم لگا دیا تب کہیں جاکر شہزادی ہوش میں آئی اور آنکھیں کھول دیں۔ کنیزیں اصرار کرنے لگیں کہ جلد سے جلد واپس محل چلا جائے۔ لیکن قمرخان نے کہا:

"جب تک میرا ہاتھ ٹھیک نہیں ہو جاتا میں واپس نہ جاؤں‌گی۔"

اس جگہ ایک چشمہ تھا جس کے کنارے پر دو سایہ‌دار درخت اگے ہوئے تھے۔ کنیزوں نے شہزادی کو لے جاکر ان درختوں کے سائے میں لٹا دیا۔ زیاد باتر بھی جاکر پاس کھڑا ہو گیا۔ قمرخان پڑی پڑی سوچ رہی تھی کہ زیاد باتر مجھ کو پہچان گیا ہے یا نہیں۔ اس نے چالاکی سے زیاد باتر سے پوچھا:

"تم یہاں کتنے عرصے سے چرواہے کا کام کر رہے ہو؟"

زیاد باتر نے دل ہی دل میں سوچا، مجھے مار ڈالنا ہو تو مار ڈالے۔ میری بلا سے میں سچی بات ہی کہوں‌گا۔ یہ سوچ کر اس نے کہا:

"بس اسی دن سے میں یہ کام کر رہا ہوں جس دن آپ کے والد نے مجھے دیس نکالا دے دیا تھا۔"

قمرخان اس سے معافی مانگتے ہوئے کہا:

"یہ میرا ہی قصور ہے۔ میرا فرض تھا کہ میں والد صاحب سے کہہ‌کر ان کو اس بات پر راضی کر لیتی کہ وہ آپ کو شہر سے نہ نکالیں۔"

قمرخان کی یہ بات سن‌کر زیاد باتر بہت خوش ہوا اور اپنے منہ بولے باپ کو بلانے چلا گیا۔

"عزیز مہمانوں کی اچھی طرح خاطر تواضع کرنا چاہئے" بوڑھے چرواہے نے کہا۔ یہ کہہ‌کر وہ فوراً نزدیک کے ایک گاؤں جاکر وہاں سے ایک بڑا سا دیگ لے آیا۔ پھر فوراً پانچ بھیڑوں کو ذبح کرکے پلاؤ تیار کیا۔ مہمانوں کو پلاؤ کھلایا اور قمیز پلایا۔

اس کے بعد پندرہ دن گزر گئے۔ شہزادی قمرخان کا زخم کافی بھر چلا تھا۔

ان کو یہیں چھوڑکر اب آئیے، ذرا بادشاہ سلامت کا حال سنئے۔

ایک دن بادشاہ سلامت نے اپنے ایک سردار کو بلاکر اس سے کہا:

"پورا ایک مہینہ ہو گیا، شہزادی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ تم چلے جاؤ۔ اس کو تلاش کرکے فوراً محل میں لے آؤ۔"

یہ سردار بہت دنوں سے شہزادی سے شادی کرنے کا آرزومند تھا۔ اس لئے وہ جی جان سے بادشاہ کی خدمت کر رہا تھا۔ بادشاہ کا حکم پاکر وہ بےحد خوش ہوا اور اسی وقت چند بہادر جوانوں کو ساتھ لےکر اور ایک مشک شراب کی اپنے گھوڑے کے تھیلے میں ڈال کر شہزادی کی تلاش میں نکل گیا۔

وہ سردار اپنے آدمیوں کے ساتھ پانچ دن تک شہزادی کو ڈھونڈتا رہا اور بالآخر اس کو ڈھونڈ لیا۔ اس نے دیکھا کہ شہزادی ایک درخت تلے بیٹھی زیاد باتر سے گفتگو میں مشغول ہے۔ یہ دیکھکر وہ جل گیا۔ لیکن شہزادی کو ناراض کرنے کی اسے جرأت نہ ہوئی۔ گھوڑے سے اترکر شہزادی کے پاس گیا جھک کر سلام کیا اور بڑے ادب سے کہا:

"بادشاہ سلطان آپ کی کوئی خبر نہ پاکر بڑے پریشان ہیں اور انہوں نے مجھے آپ کو تلاش کرنے بھیجا ہے۔"

سردار اور اس کے آدمیوں کو بٹھاکر ان کی خاطرمدارات کی گئی۔ سردار نے اپنے تھیلے سے شراب کی مشک نکالی۔ لڑکیاں پیالوں میں شراب بھر بھرکر دینے لگیں۔ سردار نے شراب کے دو پیالے پی لئے تو اس کا سر چکرانے لگا۔ آنکھیں لال ہو گئیں، رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ وہ ہر طرح کی باتیں کرکے زیاد باتر کو تنگ کرنے لگا۔ زیاد باتر بھی ویسے ہی جواب دینے لگا۔

"ارے تو مجھ سے اب حجت بھی کرنے لگا؟" غرور کے پتلے گرم خون سردار نے چیخ کر کہا اور پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور زیاد باتر کے ایک گھونسا مار دیا۔ زیاد باتر یہ توہین نہ سہہ سکا اور اس نے بھی سردار کے ایک گھونسا رسید کیا۔ سردار کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ وہ گر پڑا اور دم توڑ دیا۔ اس میں خون حد سے زیادہ تھا۔

سردار کے جوان زیاد باتر پر ٹوٹ پڑے— ہاتھاپائی ہونے لگی— زیاد باتر نے ان سب کو ٹھکانے لگا دیا—

جب یہ سب ہو چکا تو زیاد باتر نے قمرخان سے کہا:

"اب میرا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے— آؤ، ہم کسی دوسرے ملک چلے جائیں—"

قمرخان راضی ہو گئی— اس نے اپنی کنیزوں کو واپس بھیج دیا اور ان سے تاکید کی:

"اگر اباجان پوچھیں تو کہنا کہ قمرخان کسی دوسرے ملک کو چلی گئی ہے—"

کنیزوں نے روتے دھوتے محل کی راہ لی— زیاد باتر اور قمرخان دونوں بوڑھے چرواہے کو الوداع کہہ کر اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ایک طرف کو چل پڑے—

وہ تھوڑی دور چلتے، کچھ دیر شکار کھیلتے اور پھر آگے چل پڑتے— اس طرح وہ کئی دن تک چلتے رہے اور شہر ہرات پہنچے— ان دنوں ہرات میں بادشاہ حسین مرزا حکومت کرتا تھا—

زیاد باتر اور قمرخان دونوں جاکر ایک کارواں سرائے میں اترے— زیاد باتر ایک لوہار کی دکان میں کام کرنے لگا— کچھ دن بعد ان دونوں نے شادی کر لی—

ایک دن ایک امیر آدمی زیاد باتر کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا:

"تم لوگ کارواں سرائے میں کیوں رہو— میں نے اپنے محلے میں تم لوگوں کے لئے ایک مکان ٹھیک کر لیا ہے— چلو، وہیں چل کر رہو—"

زیاد باتر تیار ہو گیا— جاکر دیکھا تو مکان اس کو پسند آیا— اس نے اپنی کمائی میں سے تھوڑی رقم جمع کر رکھی تھی، قیمت ادا کرکے مکان لے لیا اور میاں بیوی دونوں اس مکان میں منتقل ہو گئے—

اس امیر آدمی کے ایک نوکر تھا جو پہلے ڈاکو رہ چکا تھا— امیر آدمی نے ایک دن اس کو بلاکر کہا:

"تم آج رات کہیں باہر نہ جانا— تمہارے لئے ایک کام ہے—"

آدھی رات کے وقت وہ امیر آدمی اس نوکر کو ساتھ لےکر زیاد باتر کے دروازے پر پہنچا— اس نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جب زیاد باتر سو جائے تو اندر جاکر اس کو مار ڈالا جائے اور اس کی بیوی کو اٹھا لایا جائے—

زیاد باتر سو گیا تھا لیکن قمرخان جاگ رہی تھی— قدموں کی آہٹ سن کر اس

4—1805

نے شوہر کو جگایا۔ زیاد باتر بستر سے اٹھکر دروازے کے پاس گیا اور اس کی دراروں میں سے جھانکا تو دیکھا کہ باہر دو آدمی کھڑے ہیں۔ اس نے واپس آکر تکیے کے نیچے سے اپنی چھری اٹھا لی اور پھر دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی وہ ڈاکو سے گتھم گتھا ہو گیا۔ ادھر قمرخان دوڑکر آئی اور امیر کے منہ پر اس زور سے ایک گھونسا مارا کہ اس کا منہ فوراً سوج گیا۔ ادھر زیاد باتر نے ڈاکو کا کام تمام کیا اور ادھر قمرخان امیر کو زمین پر گراکر اس کا گلہ گھونٹنے لگی۔ امیر گڑگڑا رہا تھا کہ مجھ پر رحم کرو، مجھے چھوڑ دو۔ قمرخان سوچتی تھی کہ اس کو جان سے مار ڈالنا ہی اچھا ہے۔

لیکن زیاد باتر نے کہا:

"اچھا چھوڑو۔ اس غنڈے بدمعاش کو چھوڑے دیتے ہیں۔ جا، جلدی یہاں سے دفع ہو جا اور پھر کبھی ایسی شرارت نہ کرنا۔"

امیر بھاگتا ہوا اپنے گھر آ گیا جہاں اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں جاکر بادشاہ سے اس کی شکایت کروں۔

اگلے دن صبح کو اس نے اپنے پھولے ہوئے گال پر کپڑا باندھ لیا اور بادشاہ کے دربار میں جا پہنچا۔ بادشاہ حسین مرزا اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور درباری لوگ اس کے دونوں طرف صف باندھے کھڑے تھے۔ وہ امیر آدمی فریاد کرنے لگا:

"بادشاہ عالم! کچھ دن ہوئے ہمارے شہر میں کہیں باہر سے ایک آدمی آیا تھا۔ کون سا آدمی ہے، کہاں سے آیا ہے، اس کا کسی کو کچھ پتہ نہیں۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ یہ سوچ کر کہ یہ شریف آدمی ہوں گے، میں نے اپنا ایک مکان سستے داموں پر ان کے ہاتھ بیچ کر اس میں ان کو بسا دیا۔ مگر ان کمینوں نے مار مارکر میرا کچومر نکال دیا۔ حضور! آپ ان آوارہ بدمعاش لوگوں کو سزا دیجئے اور ان کو شہر سے نکلوا دیجئے۔" بادشاہ کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا اور اس نے کہا:

"ایسے لوگوں کو شہر سے نکال دینا کم ہے۔ ان کو قتل کر دینا چاھئے۔"

بادشاہ کے سپاہی گئے اور زیاد باتر اور قمرخان کو پکڑکر بادشاہ کے پاس لے آئے۔ بادشاہ نے قمرخان کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر اس نے بڑے رعب سے زیاد باتر سے پوچھا:

"تم اس حسینہ کو کہاں سے لے آئے؟ ضرور کہیں سے اغوا کر لائے ہوگے۔"

"یہ بات خود اس سے پوچھئے" زیاد باتر نے جواب دیا۔

"حسینه کو چھوڑکر تم خود شہر سے نکل جاؤ" بادشاہ نے زیاد باتر سے کہا۔
جب زیاد باتر اس پر تیار نہ ہوا تو بادشاہ نے جلاد کو بلاکر حکم دیا کہ لے جاکر اس کو قتل کر دو۔

سپاہی زیاد باتر کی مشکیں کس‌کر اس کو قتل کرنے کے لئے لے چلے۔ لیکن محل سے باہر نکلنے پر زیاد باتر نے ایک بار زور لگایا تو رسی ٹوٹ گئی اور وہ سپاہیوں کو مارکر بھاگتا ہوا اس لوہار کے گھر آیا جس کے ہاں کام کرتا تھا۔ اس نے سارا قصہ سنایا تو لوہار نے اس سے کہا:

"یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک غار ہے۔ تم اس غار میں جاکر چھپ جاؤ۔ میں شہر جاکر لوگوں سے سب حال معلوم کروں‌گا اور آکر تمہیں بتا دوں‌گا۔"

زیاد باتر نے ایسا ہی کیا۔ اب ذرا قمرخان کا حال سنئے۔

بادشاہ نے پہلے تو قمرخان سے نرمی سے باتیں کیں۔ اس کو لالچ دلایا اور کہا:
"میں تم کو سونے چاندی سے لاد دوں‌گا۔ جتنی دولت تمہارے پاس ہوگی اتنی دنیا کی کسی شہزادی کے پاس نہیں ہوگی۔ تم میرے محل میں رہو۔ میری بیوی بن‌جاؤ۔"

لیکن قمرخان کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ تب بادشاہ نے اس کو جیل میں بند کر دیا۔ بادشاہ کے باغ میں ایک زنداں تھا جس کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ بادشاہ کے حکم پر قمرخان کو اسی زنداں میں ڈال دیا گیا۔

ادھر جب بادشاہ کو معلوم ہوا کہ زیاد باتر بھاگ گیا ہے تو اس نے حکم دیا کہ شہر کے سبھی دروازے بندکر دئے جائیں اور بھگوڑے کو پکڑکر لایا جائے۔ بادشاہ کے آدمیوں نے بہت تلاش کیا لیکن زیاد باتر کہیں نہیں ملا۔

جب رات ہوئی تو لوہار زیاد باتر کے پاس غار میں آیا۔ وہ دونوں بہت دیر تک اس بات پر غور کرتے رہے کہ کیا کیا جائے۔ آخر لوہار نے رائے دی:
"بادشاہ حسین کا نوائی نام کا ایک وزیر ہے۔ تم اس کے پاس چلے جاؤ اور اس کو سارا حال سنا دو۔ وہ بہت منصف مزاج آدمی ہے۔ تمہای ضرور کوئی مدد کرے‌گا۔"

زیاد باتر آدھی رات کے وقت غار سے نکل‌کر وزیر نوائی کے دروازے پر پہنچا اور دستک دی۔ اندر سے آواز آئی: "کون ہے؟"

زیاد باتر نے کہا:

"میں بہت دور سے آیا ہوں- مجھے ایک معاملے میں حضرت نوائی کی صلاح لینا ضروری ہے-"

علی‌شیر نوائی عام طور پر آدھی رات اور کبھی کبھی تو صبح تک بیٹھے شعر کہا کرتے تھے- آج بھی وہ ابھی جاگ رہے تھے- شاید روز کی طرح کوئی غزل لکھ رہے تھے- نوکر نے آکر خبر دی:

"حضور! وہاں دروازے پر کوئی نوجوان کھڑا ہے- کہتا ہے کہ بہت دور سے آیا ہے- کسی معاملے میں آپ کی صلاح لینا چاہتا ہے-"

نوائی نے کہا کہ اس کو آنے دو-

زیاد باتر نوائی کے کمرے میں آیا اور ادب سے جھک‌کر سلام کیا- نوائی نے بیٹھنے کے لئے کہا- وہ بیٹھ گیا اور وزیر نوائی کو سارا قصہ کہہ سنایا- نوائی نے اس کو تسلی دی:

"فکر مت کرو- بادشاہ قمرخان کو قتل نہیں کروائے‌گا- کل میں جاکر اس کا حال معلوم کروں‌گا اور تمہیں خبر کرا دوں‌گا-"

اگلے دن صبح ہی وزیر نوائی محل میں پہنچے اور شاہی باغ میں ٹہلنے لگے- مالی نے آکر ان کو سلام کیا اور تازہ پھولوں کا ایک گلدستہ بناکر پیش کیا- نوائی کو معلوم تھا کہ بادشاہ نے اپنے باغ میں خفیہ زنداں بنوا رکھا ہے اور مالی، باغ اور زنداں دونوں کی رکھوالی کرتا ہے- لیکن اس سب کا کسی کو علم نہیں ہے- چنانچہ وزیر نوائی نے مالی سے پوچھا:

"کہتے ہیں کہ کوئی حسینہ زنداں میں پڑی ہوئی ہے- اس کا تمہیں کوئی پتہ ہے؟"

"جی ہاں- پتہ ہے حضور- خود بادشاہ ہی نے اس کو زندان میں ڈلوا دیا ہے-"

علی‌شیر نوائی اپنے گھر واپس آئے اور اپنے ایک آدمی کے ذریعے زیاد باتر کو خبر کرا دی کہ قمرخان صحیح سلامت ہے- اس کے بعد انہوں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ زنداں تک ایک سرنگ کھودی جائے-

تین دنوں کے اندر یہ سرنگ تیار ہو گئی- اسی سرنگ کے راستے قمرخان کو شاہی زنداں سے نکال‌کر نوائی کے گھر لایا گیا- نوائی زیاد باتر کو بلا لائے اور اس سے کہا:

"تم میاں بیوی دونوں آرام سے میرے گھر میں رہو۔ یہاں کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔"

میاں بیوی دونوں وزیر نوائی کے گھر تین سال تک رہے۔ قمرخان کے هاں بیٹا پیدا هوا اور وہ چلنے بھی لگا۔ ایک دن نوائی باغ سے گزر رہے تھے کہ دیکھا کہ بچہ نالی کے پاس بیٹھا پانی سے کھیل رہا ہے۔ انہوں نے بچے کو گود میں اٹھا لیا، ایک پھول توڑکر اس کے هاتھ میں دیا اور اس کو اٹھائے هوئے زیاد باتر کے کمرے کے دروازے پر آئے۔ اچانک زیاد باتر کے یہ الفاظ ان کے کانوں میں پڑے:

"قمرخان! پیاری! روؤ نہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ پیاری ماں کی یاد تمہیں ستا رہی ہے، تم ان کے دیدار کے لئے ترستی ہو مگر کیا کیا جائے۔ صبر سے کام لو۔ اپنے آپ کو یوں ھلکان نہ کرو۔ مجھے بھی اپنا وطن بہت یاد آتا ہے۔ مگر ہم بیچارے کریں تو کیا کریں؟"

یہ بات سن‌کر نوائی اندر کمرے میں گئے۔ قمرخان نے فوراً اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور اٹھکر نوائی کو سلام کیا۔ نوائی نے کہا:

"بیٹی! تم پریشان نہ ہو۔ ایک مہینہ اور گزرنے دو۔ تب پھر میں خود تم کو تمہارے وطن پہنچا دوں‌گا اور سب باتیں تمہارے باپ کو سمجھا دوں‌گا۔"

ایک مہینہ گزر گیا۔ ان کے آدمیوں نے سفر پر نکلنے سے ایک ہفتہ پہلے زیاد باتر اور قمرخان کو خفیہ طور پر لے جاکر پہاڑ میں ایک جگہ چھپا دیا۔ تیاری مکمل ہونے پر نوائی سفر پر نکلے اور راستے میں پہاڑ پر جاکر ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے لیا۔

کئی دنوں تک چل‌کر اور ایک لمبا راستہ طے کرکے وزیر نوائی اور ان کے ساتھی قمرخان کے ملک میں پہنچ گئے۔ نوائی کی آمد کی اطلاع پاکر بادشاہ سلطان نے اپنے لوگوں کو ان کے استقبال کے لئے بھیجا۔

بادشاہ سلطان، وزیر نوائی سے بڑے تپاک سے ملا اور ان کی خوب خاطرداری کی۔ نوائی اس کے هاں کئی دن تک مہمان رہے۔ ایک دن انہوں نے بادشاہ سلطان سے کہا:

"حضرت عالی! میں آپ کے دربار میں اس لئے آیا ہوں کہ دو گنہگاروں کی طرف سے آپ سے معافی مانگوں۔ اگر آپ نے ان کو معاف کر دیا تو میں کچھ دن اور آپ کے یہاں مہمان بن‌کے رہوں‌گا ورنہ آج ہی واپس چلا جاؤں‌گا۔"

بادشاہ سلطان نے فوراً جواب دیا:

"حضور! جب آپ کہتے ہیں تو میں ان کو معاف کئے دیتا ہوں، چاہے انہوں نے میرے باپ ہی کا قتل کیا ہو— کہئے، وہ کون لوگ ہیں؟"

علی‌شیر نوائی نے زیاد باتر اور قمرخان دونوں کو بلوایا— شہزادی قمرخان آتے ہی اپنے باپ کے سینے سے لگ گئی— مارے خوشی کے بادشاہ بےہوش ہو گیا— جب اس کو ہوش میں لایا گیا تو اس نے روتے ہوئے اپنی بیٹی سے پوچھا:

"بیٹی! تم اتنے دنوں تک کہاں رہیں؟"

اس وقت زیاد باتر بادشاہ کے پاس آیا— اس کو دیکھتے ہی بادشاہ آگ بگولہ ہو گیا اور اس کو قتل کروانا چاہا— لیکن وزیر نوائی نے اس کو اس کا وعدہ یاد دلا دیا اور اس کو لاچار ہوکر ایک ادنی چرواہے کو اپنا داماد مان لینا پڑا—

نوائی بادشاہ سلطان کے یہاں کچھ دن اور رہے اور پھر ہرات اپنے گھر لوٹ گئے— زیاد باتر اور قمرخان دونوں جیتے جی نوائی کو محبت اور عقیدت سے یاد کرتے رہے—

جب نوائی اپنے ملک چلے گئے اور زیاد باتر بیوی اور بچے کے ساتھ شاہی محل میں رہ گیا تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک آدمی کو بھیج‌کر اس بوڑھے چرواہے کو اپنے پاس بلا لیا جس کے ساتھ مل‌کر وہ پہاڑ پر گھوڑے چرایا کرتا تھا اور جس نے اس کو اپنا بیٹا بنایا تھا— زیاد باتر نے ایک سایہ‌دار باغ میں اپنے منہ بولے باپ کے رہنے کا انتظام کر دیا— اس طرح یہ لوگ سب بڑے آرام سے زندگی بسر کرنے لگے—

زیاد باتر کو عام لوگوں سے بہت محبت تھی— وہ غریب اور ننگے بھوکے لوگوں کی ہمیشہ جی کھول‌کر مدد کرتا رہا—

# گُلی

کہتے ھیں کہ کسی زمانے میں سمرقند سے ہرات تک کے سارے علاقے پر بادشاہ حسین بائقرا حکومت کرتا تھا اور مشہور و معروف شاعر اور عالم علی‌شیر نوائی اس کے وزیر تھے- کہنے‌والے یہ بھی کہتے ھیں کہ بادشاہ اور وزیر دونوں بچپن ھی سے دوستی و رفاقت کے مضبوط رشتے میں بندھے ہوئے تھے- بادشاہ حسین وزیر علی‌شیر سے ملے اور ان سے باتیں کئے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا تھا- ملک و قوم اور تخت و تاج سے متعلق کوئی بھی مسئلہ وزیر علی‌شیر کے صلاح و مشورہ کے بغیر حل نہیں ہو سکتا تھا-

ایک دن بادشاہ حسین بائقرا اپنے درباریوں کے ساتھ شکار کھیلنے گیا- وزیر علی‌شیر کسی بہانے بادشاہ کے ہمراہ جانے کے شرف سے چھٹی پا گئے- وہ گھوڑے پر سوار ھوکر اکیلے شہر کے ایک دورافتادہ علاقے کی طرف روانہ ھو گئے- وزیر باثروت کی اس خلوت‌پسندی کی دو وجوہ تھیں- ایک تو انہیں شکار جیسی ظالمانہ اور خون‌ریز تفریح سے نفرت تھی اور دوسرے، وہ ایک انجان حسینہ کے تیرنظر کا نشانہ بن چکے تھے- آج چالیس دنوں سے اس محبت کی آگ ان کے سینے کے اندر برابر جل رھی تھی اور وہ اپنا آرام و سکون کھو بیٹھے تھے-

واقعہ یوں ہوا تھا کہ موسم بہار میں ایک دن علی‌شیر ایک سنسان گلی سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک شور سا سن‌کر ان کی نظریں آپ ھی آپ اوپر اٹھ گئیں- اوپر دیوار پر سے دو کالی غزالی آنکھیں جھانک رھی تھیں- حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اس کی پرچھائیں معلوم ھوتا تھا- اس کے سامنے چاند کا سارا جلوہ ایسا تھا جیسے چاندی کے کسی نئے، چمک دمک‌والے برتن کے آگے تانبے کا کوئی پرانا سا زنگ آلود برتن پڑا ھوا ھو-

اس بے‌مثال جلوۂ حسن کا نظارہ علی‌شیر پل بھر ھی کر پائے- وہ چہرۂ تابناک اس طرح آنکھوں سے اوجھل ھو گیا جیسے وہ پانی کے آئینے میں کسی کا عکس تھا جو ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے سے گھبراکر پلک جھپکتے میں غائب ھو گیا تھا۔

علی‌شیر اس دن تو اپنا دھڑکتا ہوا دل لے‌کر وہاں سے چلے آئے۔ مگر اگلے دن وہ جیسے اتفاقاً ٹھیک اسی وقت اسی گلی سے گزرے - یہ سلسلہ برابر چلتا رہا۔ مگر افسوں‌گر آنکھوں‌والی اس حسینہ کو دوبارہ دیکھنا انہیں نصیب نہیں ہوا۔ اپنے وفادار نوکروں کے ذریعے ان کو اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ وہ حسینہ ابو صالح نام کے ایک جلاہے کی بیٹی ہے اور اس کا نام ہے گلی۔ گلی! کتنی مہک تھی اس نام میں!

خوب سوچ بچار کرنے کے بعد بالآخر ایک دن علی‌شیر نے اس جلاہے کے گھر جانے اور اس سے کھل‌کر بات کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے شکار پر جاتے ہوئے بادشاہ اور درباریوں سے کسی طرح دامن چھڑایا اور شہر کے اس دورافتادہ محلے کی طرف جہاں اس جلاہے کا گھر تھا، روانہ ہو گئے۔

ابو صالح جلاہے کے گھر پہنچ‌کر انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی نے پوچھا:

"کون ہے؟"

علی‌شیر نے جواب دیا:

"ایک پردیسی۔"

اندر سے پھر آواز آئی:

"تمہیں کیا چاہئے پردیسی؟"

"محترم ابو صالح گھر پر ہیں کیا؟" علی‌شیر نے پوچھا۔

دروازہ کھلا اور خود ابو صالح اندر سے نکل آیا۔ وزیر باثروت کو دیکھ‌کر بیچارہ جلاھا گھبرا گیا۔ کیونکہ اس پرانے زمانے میں حکمرانوں کا کسی کے دروازے پر آ دھمکنا کوئی اچھی بات نہیں ہوتا تھا۔ یہ صرف کسی نہ کسی مصیبت کا باعث ہوتا تھا۔ لیکن علی‌شیر نے بڑی خاکساری سے ہاتھ سینے پر رکھ‌کر سلام کیا اور اندر جانے کی اجازت مانگی۔ بوکھلائے ہوئے اور کانپتے ہوئے جلاہے نے وزیر علی‌شیر کو اندر لے جاکر ادب سے بٹھایا۔ وہ دونوں بڑی دیر تک بیٹھے مزاج‌پرسی کرتے رہے۔ کوئی دوسری بات ان کے منہ سے نہ نکل سکی۔ بالآخر علی‌شیر اٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ‌کر ادب سے سر جھکایا اور کہا:

"جلاہوں کے ماہر فن استاد عزیز و مکرم ابو صالح! مجھ ناچیز کو اجازت دیجئے کہ میں آپ کا بیٹا بنوں۔"

حیرت سے ابو صالح قوت‌گویائی کھو بیٹھا۔ وہ خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ علی‌شیر نوائی جیسا وزیرعالی مرتبت جس کے سہارے تخت‌شاھی کھڑا ھے، اس کی بیٹی سے شادی کرنے کی خواھش ظاھر کرےگا، اس کی بیٹی چاھے جتنی بھی خوبصورت ھو۔ خوشی سے اس کا دل بیلوں اچھل رھا تھا۔ اس نے بڑے ادب سے جھک کر کہا:

"جناب عالی! ھم لوگوں کی کیا جانیں اور کیا جسم سب آپ کے ھاتھ میں ھیں۔ میرے لئے اس سے زیادہ اور کون سی عزت اور خوشی کی بات ھو سکتی ھے کہ آپ نے مجھ جیسے ایک ناچیز جلاھے کی بیٹی کی طرف توجہ فرمائی ھے۔"

"لیکن اس بارے میں خود لڑکی کی کیا رائے ھوگی؟" علی‌شیر نے پوچھا۔

"ایک بیٹی کا تو یہی فرض ھے کہ اپنے باپ کی بات مانے" ابو صالح نے فوراً جواب دیا۔

"پرانے رسم و رواج اور شریعت کے قوانین سے تو میں بخوبی واقف ھوں" علی‌شیر نے کہا۔ "لیکن ان کے علاوہ دلوں کے بھی اپنے رواج اور قوانین ھوتے ھیں۔ دل کے معاملے میں زبردستی موت سے بھی بری ھوتی ھے۔ اگر آپ کی بیٹی راضی نہ ھوئی تو میں سر جھکاکر چپ‌چاپ چلا جاؤں‌گا۔"

ابو صالح دوڑا ھوا زنانخانے میں گیا اور اپنی بیٹی سے کہا:

"بیٹی! تمھاری قسمت کا ستارہ اس طرح چمک اٹھا ھے کہ اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ تم محلوں میں جاکر رھوگی۔ خود وزیر علی‌شیر تمھارے لئے اپنا پیغام لےکر آئے ھیں۔ میں تو ھاں‌کر چکا ھوں۔ لیکن خدا کی شان، وہ کہتے ھیں کہ لڑکی بھی راضی ھو جائے۔ تم جلدی ھاں کر دو۔ کہیں وہ اپنا ارادہ نہ بدل دیں۔ ان کے تیور چڑھنے کی دیر ھے کہ ھمارا سارا خاندان ھی مٹ کر رہ جائےگا۔"

گای نے ایک ھلکی سی مسکراھٹ کے ساتھ کہا:

"اپنے ماں باپ کی بات ماننا میرا فرض ھے۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میری بیٹی آپ کی باندی ھے۔"

بوڑھا جلاھا خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ واپس آکر علی‌شیر سے کہا:

"میں ھمیشہ سچ کہتا تھا کہ میری بیٹی بڑی سمجھدار ھے۔ اس نے ھاں کر دی ھے۔"

علی‌شیر نے اسی دن ابو صالح کے گھر باقاعدہ طور پر شادی کا پیغام بھیج دیا۔

علی‌شیر ایک انوکھے قسم کے آدمی تھے— انہوں نے لڑکی کے دل کی بات خود معلوم کرنے کا فیصلہ کیا— اسی غرض سے وہ ابو صالح کے گھر روز آنے جانے لگے— علی‌شیر اور گلی دونوں ساتھ ساتھ چمن میں ٹہلتے، علی‌شیر گلی کو اپنی تازہ غزلیں سناتے جو گلی ہی سے منسوب ہوتیں— گلی دف کی تان پر اپنی سریلی آواز میں علی‌شیر کو گیت سناتی— ایسا لگتا تھا کہ ان دو جوان دلوں کی خوشی و انبساط کی کوئی انتہا نہ ہوگی—

شادی کا دن قریب آ گیا تھا— علی‌شیر گلی کے باپ کو جہیز* کے طور پر دس ہزار اشرفیاں بھی ادا کر چکے تھے— بس شادی کی رسوم کی ادائیگی باقی تھی— ایک دن جب علی‌شیر اپنی محبوبہ کے گھر میں تھے بادشاہ حسین بائقرا نے اپنے درباریوں سے کہا:

"ہمارے دوست علی‌شیر آج نہ جانے کیوں دکھائی نہیں دے رہے ہیں—"

بادشاہ کے چھوٹے وزیر مجیدالدین نے فوراً بادشاہ کے پاس آکر کہا:

"آپ اجازت دیں تو عرض کروں— آج چالیس اور چالیس دن اور ہوئے ہیں کہ آپ کی ہدایت کے مطابق ہمارے خفیہ لوگ آپ کے وزیر علی‌شیر پر برابر نگاہ رکھتے چلے آ رہے ہیں—"

"اور کیا معلوم کیا ہے ہمارے خفیہ لوگوں نے؟" بادشاہ نے پوچھا—

وزیر مجیدالدین نے جواب دیا:

"جہان پناہ! آپ کی رعایا کے خیالات اور ارادے بلور کی طرح صاف اور پاک ہونے چاہئیں— لیکن علی‌شیر آپ کو دھوکا دے رہے ہیں—"

"کیا کہا؟ دھوکا دے رہے ہیں؟ ان کی یہ جرأت؟" بادشاہ نے غصے میں آکر کہا—

"بالکل سچ کہتا ہوں، حضور!" مجیدالدین نے کہا— "وہ آپ سے کہتے ہیں کہ روز رات کے وقت تازہ غزلیں کہنے میں لگے رہتے ہیں— لیکن اصل میں وہ ایک عدیم‌المثال حسینہ کی صحبت کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں— جہان پناہ! انہوں نے ایک عمدہ‌ترین ہیرے کو جو آپ کے تاج کی زینت بننے کے لائق ہے آپ سے چھپا رکھا ہے— اس لڑکی کا نام ہے گلی اور وہ ایک جلاہے ابو صالح کی بیٹی ہے—"

---

* ازبیکستان میں جہیز لڑکے‌والے لڑکی‌والوں کو دیتے ہیں — اڈیٹر—

علی‌شیر دربار میں آئے تو بادشاہ حسین نے ان سے مخاطب ہوکر کہا:
"علی‌شیر! ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے-"
"لڑکی حسین ہے؟" علی‌شیر نے پوچھا- "کیا وہ کسی اچھے خاندان کی بیٹی ہے؟"
"جی ہاں، وہ بڑی حسین ہے اور باپ بھی ایک شریف آدمی ہے" بادشاہ نے جواب دیا-
"تب تو میری مبارکباد قبول فرمائیے" علی‌شیر نے کہا-
بادشاہ حسین نے اپنے درباریوں کو مخاطب کرکے ایک عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا:
"آپ لوگوں نے سنا؟ ہمارے بڑے وزیر ہمارے شادی کرنے کے ارادے کو معقول بتا رہے ہیں- اب ہماری خواہش ہے کہ ہمارے دوست اور ہمارے بڑے وزیر ہونے کے ناطے علی‌شیر ہی لڑکی والوں کے ہاں ہماری طرف سے شادی کا پیغام لےکر جائیں-"
پھر اس نے علی‌شیر سے کہا: "میرے دوست! آپ سوغات لےکر جلدی سے لڑکی‌والوں کے گھر چلے جائیں-"
کسی بات کا شبہہ کئے بغیر علی‌شیر نے جھک‌کر بادشاہ کی تعظیم کی اور پھر کہا:
"بادشاہ کی طرف سے شادی کا پیغام لےکر جانے سے زیادہ عزت کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی- لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے حضور کا پیغام کس کے ہاں پہنچانا ہوگا؟"
"جلاہے ابو صالح کے ہاں" بادشاہ نے جواب دیا-
یہ سن‌کر علی‌شیر سناٹے میں آ گئے- لیکن اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے انہوں نے کہا:
"میں حضرت عالی کا یہ حکم بجا لانے سے معذور ہوں-"
بادشاہ حسین آگ بگولہ ہو گیا- اس نے گرج‌کر کہا:
"اچھا! تو پھر یہ بات سچ ہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے اپنے اعمال کو مجھ سے چھپائے رکھا ہے- جائیے- جاکر میرا پیغام لڑکی‌والوں تک پہنچائیے- ورنہ مجھ سے رحم و کرم کی امید نہ رکھئے-"
علی‌شیر کی محبت نہایت سچی اور پکی تھی- وہ ٹس سے مس نہ ہوئے- انہوں نے پھر بادشاہ کی تعظیم کی اور کہا:

"یہ کتنی غیرفطری بات ہوگی کہ کوئی دولہا اپنی دلہن کے گھر کسی دوسرے شخص کا پیغام لےکر جائے، وہ دوسرا شخص خود بادشاہ سلامت ہی کیوں نہ ہو—"

بادشاہ حسین نے غصے میں آکر اسی وقت علی‌شیر کو سمرقند سے نکال باہر کرنے کے فرمان عالی پر مہر لگا دی اور شادی کا پیغام لے جانے کا کام اس نے چھوٹے وزیر مجیدالدین کے سپرد کیا۔

دربار سے نکل‌کر علی‌شیر اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور اسے سرپٹ دوڑاتے، مصیبت کا پیغام لئے ہوئے ابو صالح کے گھر پہنچے۔ چمن میں چاروں طرف خوشبو بکھیرتے ہوئے پھولوں کے درمیان انہوں نے رو روکے گلی کو بتایا کہ کس طرح ان کی محبت کا سفینہ ڈوبا جا رہا ہے— یہ منحوس خبر سن‌کر گلی نے انتہائی درد بھرے اور متین لہجے میں کہا:

"میں مر جاؤں‌گی لیکن بادشاہ حسین کی بیوی نہ بنوں‌گی—"

علی‌شیر اور گلی میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ وزیر مجیدالدین بادشاہ کی سوغات لئے بلائے ناگہانی بن‌کر آ دھمکا۔ ابو صالح نے مہمان عالی مرتبت کو کمرے میں لے جاکر ادب سے بٹھا دیا۔ پھر اس کو وہیں چھوڑکر خود باہر آیا اور گردن جھکاکے علی‌شیر کی طرف دیکھے بغیر کہا:

"میں نے سوچا تھا کہ وزیر میرا داماد بنےگا— لیکن اب تقدیر کا یہ تقاضا ہے کہ میں بادشاہ کا خسر بنوں—"

تب گلی نے دوبارہ وہی الفاظ ادا کئے جو اس نے ابھی ابھی علی‌شیر سے کہے تھے:

"میں مر جاؤں‌گی لیکن بادشاہ حسین کی بیوی نہ بنوں‌گی۔"

"بادشاہ تمہارے انکار کو کبھی برداشت نہ کرےگا" ابو صالح نے کہا۔ "نہ میں رہوں‌گا اور نہ ہی میرا خاندان۔ بادشاہ سب کو مٹاکر رکھ دےگا۔"

ابو صالح نے رو روکر گلی کی منتیں کیں کہ ہم پر رحم کرو— لیکن گلی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ تب لاچار ابو صالح وزیر مجیدالدین کے پاس گیا اور اس کے قدموں میں گرکر روتے ہوئے اس سے کہا:

"لڑکی کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں ہیں— اس وقت تو اس نے انکار کر دیا ہے— لیکن میں آپ کے پاؤں پکڑتا ہوں، آپ از راہ کرم بادشاہ سلامت سے اس کا ذکر نہ کیجئےگا— مجھے یقین ہے کہ وہ راضی ہو جائےگی، سمجھ جائےگی کہ وزیر کی بیوی بننے سے بادشاہ کی باندی بننا ہزار گنا بہتر ہے—"

وزیر مجیدالدین چلا گیا لیکن جواب کے لئے شام کی نماز کے بعد پھر آنے کو کہہ گیا– جاتے ہوئے اونچی آواز میں اس نے یہ بھی کہہ دیا:

"قسم ھے، اگر چھوکری نے اپنی مرضی سے ہاں نہ کی تو اس کو بال پکڑکر گھسیٹتے ہوئے لے جایا جائے گا–"

گلی کمرے میں چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد شراب کے دو پیالے لئے واپس آئی– ایک پیالہ علی‌شیر کو دے‌کر اس نے کہا:

"جدائی سے موت اچھی ھے– اگر میری قسمت میں بادشاہ کے ھاتھوں کا کھلونا بننا ھی لکھا ھے تو میں سوچتی ہوں کہ اس پیالے کی شراب مجھے اس ظالم قسمت سے چھٹکارا دلا دےگی–"

جب تک علی‌شیر ھاتھ پکڑکر اس کو روکتے، اس نے پیالہ خالی کر دیا۔

"اس میں کہیں زہر تو نہیں تھا؟" علی‌شیر نے گھبراکر پوچھا–

گلی نے چپ‌چاپ اثبات میں سر ھلا دیا– شراب میں بہت آھستہ اثر کرنےوالا زہر ملا ہوا تھا۔ علی‌شیر نے بھی کچھ کہے بغیر اپنا پیالہ خالی کر دیا۔ پھر اس نے کہا:

"اپنی گلی کے بغیر میرے لئے زندگی حرام ھے–"

محبوب اور محبوبہ دونوں کے لب ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے–

شام کی نماز کے بعد وزیر مجیدالدین آ موجود ہوا۔ اس ڈر سے کہ کہیں ظالم وزیر اپنی دھمکی پر عمل نہ کر بیٹھے، گلی نے اپنے باپ سے کہا:

"میں راضی ہوں– لیکن میری ایک شرط ھے– شادی چالیس دنوں کے بعد ہونا چاھئے–"

بادشاہ حسین نے حکم دیا کہ شادی کی تیاریاں شروع کی جائیں۔ اس نے ابو صالح کے گھر میں سونے اور جواھرات کا ایک ڈھیر سا لگوا دیا– علی‌شیر کو دیس نکالا دینے کا حکم منسوخ کر دیا گیا–

شادی کا دن آ پہنچا– جس وقت محل شاھی میں شادی کی دھوم دھام مچی ہوئی تھی اس وقت علی‌شیر ایک اجنبی قلندر کا بھیس بدل‌کر محل میں آیا اور اپنی محبوبہ کو الوداع کہنے کے لئے حرم شاھی میں داخل ہو گیا– گلی کا بہت ھی برا حال تھا– وہ شدیدترین بخار کی آگ میں جل رہی تھی– لیکن وہ پہلے کی طرح بیحد حسین تھی–

اس کی آنکھوں کی پرتپش چمک ستاروں کی ٹھنڈی جھلملاہٹ کا مذاق اڑاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"میں بادشاہ کی بیوی نہیں بنوں گی۔ زہر اپنا اثر کر رہا ہے اور میری موت کی گھڑی بہت قریب آ گئی ہے" گلی نے کہا۔

"میری جان!" علی‌شیر نے انتہائی مایوسی کے عالم میں کہا۔ "تمہارے ہاتھوں سے میں نے بھی تو پیا تھا۔ لیکن مجھ پر تو اس کا کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا۔"

تب گلی نے اقرار کیا:

"جب سے یہ دنیا آباد ہوئی ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی پیار کرنے‌والی لڑکی نے اپنے محبوب کی جان لی ہو۔ میری جان! تمہارے پیالے میں خالص شراب تھی۔"

"ہائے! کتنا بدنصیب ہوں میں!" علی‌شیر نے بہت ہی دکھی ہوکر کہا۔ "آخر تم نے مجھ پر یہ ظلم کیوں کیا؟"

"میں نے ایسا اس لئے کیا کہ تم مجھ کو ہمیشہ یاد رکھو" گلی نے جواب دیا۔

اتنے میں اچانک بادشاہ حسین غصے میں بھرا ہوا کمرے میں آ دھمکا۔ اس کے نوکروں میں سے کسی نے جاکر اس کو اطلاع دی تھی کہ علی‌شیر آپ کے حرم میں بیٹھا ہے۔ بادشاہ کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ اس نے آتے ہی گرج کر کہا:

"جس نے میرے حرم میں پاؤں رکھا ہے وہ مر جائے گا۔"

"خاموش رہئے۔ اس کی نیند خراب نہ کیجئے" علی‌شیر نے گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سرکار! آئیے یہاں سے چلے چلیں۔ اس کے چین میں خلل نہ پڑے۔"

بادشاہ حسین نے گلی کی طرف دیکھا۔ وہ بےجان پڑی ہوئی تھی۔ بادشاہ کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کے گر پڑی اور وہ اپنا سر جھکائے ہوئے چپ‌چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔ علی‌شیر نے تلوار اٹھا لی اور ساتھ کے کمرے میں بادشاہ کے پاس آکر کہا:

"اب میری بس یہی خواہش ہے کہ میری زندگی کا چراغ گل ہو جائے۔ یہ لیجئے اپنی تلوار اور میری گردن کاٹ دیجئے۔"

کہتے ہیں کہ بادشاہ حسین نے علی‌شیر کی گردن نہیں کاٹی۔ اس کے برعکس اس کو گلے سے لگا لیا اور اس سے معافی مانگنے لگا۔ اس نے قسم کھائی کہ جیتے جی علی‌شیر کا دوست بن کر رہے گا۔

دانشمند علی‌شیر اس کے بعد بھی سلطنت کے بڑے وزیر بنے رہے۔ پہلے کی طرح

اب بھی امور سلطنت سے متعلق تمام اہم‌ترین مسئلے علی‌شیر کے صلاح و مشورے سے حل ہوتے رہے- لیکن لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بادشاہ حسین بائقرا نے مرتے دم تک اپنے دل میں علی‌شیر کے لئے عداوت بسائے رکھی- کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ لوگ اکثر و بیشتر انہیں کے دشمن بن جاتے ہیں جن کی انہوں نے خود ہی برائی کی ہو- بزدل اور ظالم حسین بائقرا کو یہ خدشہ بھی رہتا تھا کہ مبادا علی‌شیر کبھی مجھ سے انتقام لے بیٹھے-

بادشاہ حسین بائقرا اور وزیر علی‌شیر کے درمیان دوستی اور رفاقت کا خاتمہ ہو گیا- اسی وجہ سے علی‌شیر کو جانے کتنی ہی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں-

اور علی‌شیر کے دل میں اپنی جان سے عزیز گلی کے لئے جو محبت تھی اس کو وہ مرتے دم تک نبھاتے رہے- یہی وجہ تھی کہ پھر کوئی لڑکی کبھی بھی ان کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکی چاہے وہ اپنے حسن و رعنائی سے سورج، چاند اور آسمان کے تمام ستاروں کی چمک دمک کو ہی کیوں نہ ماند کرتی رہی ہو-

# بے وقوف بادشاہ

بہت دنوں پہلے کی بات ہے، کسی جگہ ایک غریب آدمی ایک ٹوٹے پھوٹے بوسیدہ مکان میں رہتا تھا- وہ مکان اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ ایک دن اچانک زمین پر آ رہا- اس غریب آدمی کو ایک نیا مکان بنوانے کی فکر لاحق ہوئی- بال بچوں کا پیٹ کاٹ‌کر اور لوگوں سے قرض لےکر اس نے ایک نیا مکان بنوانا شروع کیا- دیواریں کھڑی ہو گئیں- دروازہ بن گیا- لیکن چھت پاٹنے کے لئے غریب کے پاس پیسہ نہ بچا- چنانچہ اس نے چھت کی جگہ ٹاٹ بچھاکر اس کے اوپر مٹی ڈال دی اور اپنے بیوی بچوں سمیت نئے مکان میں آکر رہنے لگا- اس نے سوچا کہ برسات شروع ہونے تک چھت ٹھیک کرلوں‌گا-

اس محلے میں ایک چور رہتا تھا۔ غریب آدمی کا نیا مکان دیکھ کر اس نے سوچا کہ یہ شاید دولتمند ہو گیا ہے۔ اس کے یہاں شاید اچھا خاصا مال ہاتھ لگ جائے۔ چنانچہ ایک دن رات کے وقت جب سب پڑے سو رہے تھے وہ چور اس غریب آدمی کے مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ لیکن چھت پر ابھی ایک ہی دو قدم چلا تھا کہ ٹاٹ پھٹ گیا اور وہ دھم سے نیچے کمرے میں سوئے ہوئے مالک مکان کے اوپر گر پڑا۔ مالک مکان هڑبڑاکر اٹھ بیٹھا اور چور کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن کمرے کے اندر سخت اندھیرا چھایا ہوا تھا جس کا سہارا لےکر چور بھاگ نکلا۔

چور بھاگ تو گیا لیکن پھر اس کو مالک مکان پر بڑا غصہ آیا کہ اس نے ایسی نقلی چھت کیوں بنائی۔ چنانچہ اگلے ہی دن وہ فریاد لےکر بادشاہ کے پاس پہنچا اور اس سے کہا:

"اے دانشمند بادشاہ! میں نے ایک گھر میں چوری کرنا چاہی اور مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ لیکن چھت کی جگہ ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ میں نیچے گر گیا اور میری ٹانگیں ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئیں۔ از راہ کرم آپ اس مالک مکان کو سزا دیں۔"

بادشاہ نے مالک مکان کو پکڑ بلوایا اور اس سے پوچھا:

"کیا یہ سچ ہے کہ یہ آدمی کل رات تمہاری چھت ٹوٹ جانے سے نیچے گر پڑا تھا؟"

"جی ہاں، حضور، بالکل سچ ہے" مالک مکان نے جواب دیا۔ "وہ تو کہئے کہ یہ آدمی میرے اوپر گرا۔ نہیں تو اس کی ٹانگیں ضرور ٹوٹ جاتیں۔"

"اگر یہ سچ ہے تو ہم تم کو موت کی سزا سناتے ہیں" بادشاہ نے کہا اور اس نے جلادوں کو بلاکر حکم دیا کہ اس کو پھانسی پر چڑھا دو۔

غریب مالک مکان بادشاہ کے قدموں میں گر پڑا اور کہا:

"بادشاہ عالم! مجھ کو کیوں پھانسی دی جائے۔ آخر سزا تو چور کو دی جانی چاہئے۔"

"چپ ہو جاؤ!" بادشاہ گرجا۔ "تمہیں مجھ کو نصیحت کرنے کی جرأت؟"

غریب مالک مکان نے دیکھا کہ اس طرح بادشاہ سے انصاف کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس نے بادشاہ سے کہا:

"بادشاہ عالم! میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ ٹاٹ تو راج مزدور نے بچھایا ہے۔ قصور اسی کا ہے۔ اسی نے خراب ٹاٹ بچھا دئے ہیں۔"

تب بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو رہا کر دیا جائے اور راج مزدور کو پھانسی پر چڑھایا جائے۔

بادشاہ کے سپاہی فوراً جاکر راج مزدور کو پکڑ لائے۔ جب اس کو پھانسی کے نیچے کھڑا کر دیا گیا تو اس نے کہا کہ مجھے بادشاہ سے کچھ عرض کرنا ھے۔ بادشاہ نے اجازت دی تو اس نے کہا:

"بادشاہ عالم! میرا کوئی قصور نہیں ھے۔ سارا قصور اس آدمی کا ھے جس نے وہ ٹاٹ بنائے ھیں۔ اگر اس نے ٹاٹ پکے اور مضبوط بنائے ھوتے تو ان پر کوئی بھی چلتا وہ نہ پھٹتے۔"

بادشاہ کے حکم پر راج مزدور کو بھی چھوڑ دیا گیا اور ٹاٹ بنانےوالے کو پکڑکر لایا گیا۔ اسے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو بادشاہ نے اس سے پوچھا:

"کیا ٹاٹ تم نے ھی بنائے تھے؟"

"جی ھاں، حضور، میں نے ھی بنائے تھے" اس آدمی نے جواب دیا۔

"تب تو سارا قصور تمھارا ھے" بادشاہ نے گرج کر کہا اور اس نے اسے پھانسی پر چڑھانے کا حکم دے دیا۔

"بادشاہ سلامت! میں آپ سے ایک بات عرض کرنا چاھتا ھوں" ٹاٹ بنانےوالے نے کہا۔ "بات یہ ھے کہ میرے بنائے ھوئے ٹاٹ ھمیشہ بڑے پکے ھوتے تھے۔ لیکن جس وقت میں یہ ٹاٹ بنا رہا تھا اسی وقت میرے ایک پڑوسی نے جس کو کبوتر اڑانے کا شوق ھے، اپنے کبوتر اڑا دئے۔ وہ آسمان میں اڑتے پھر رھے تھے، قلابازیاں کھا رھے تھے۔ میں ان کا تماشا دیکھنے لگا۔ اس کا اثر میرے کام پر پڑا اور میں نے ٹاٹ چھدرے اور کمزور بنا دئے۔ قصور میرا نہیں بلکہ اسی کبوترباز کا ھے۔"

اب بادشاہ کے حکم پر ٹاٹ بنانےوالے کو چھوڑکر کبوترباز کو پکڑکر لایا گیا۔ پھانسی کی سزا سن‌کر کبوترباز نے بادشاہ سے کہا:

"جہان پناہ! یہ ٹھیک ھے کہ مجھے کبوتر اڑاکر ان کا تماشا دیکھنے کا شوق ھے۔ لیکن اس میں کیا برائی ھے؟ اگر آپ مجھ کو قتل کروا دیں گے تو اس سے کسی کا بھلا نہیں ھوگا۔ کسی بےگناہ کی جان لینے سے یہ کہیں بہتر ھے کہ آپ چور ھی کو قتل کرا دیں۔ تب لوگ زیادہ چین اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگیں گے۔"

"ھاں، ٹھیک ھے" بادشاہ نے کہا۔ "سارا قصور چور ھی کا ھے" اور اس نے حکم دیا:

5—1805

"چور کو پکڑ کر لایا جائے اور اس کو پھانسی پر چڑھایا جائے۔"

جلاد فوراً چور کو پکڑ کر لائے اور اس کو پھانسی کے نیچے کھڑا کر دیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس کا قد ضرورت سے زیادہ اونچا ہے۔ اس کے پاؤں کسی طرح زمین سے اوپر نہیں اٹھ رہے تھے۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے جھنجھلاکر کہا:

"احمق کہیں کے! یہ چھوٹی سی بات بھی مجھ ہی سے پوچھتے ہو۔ چور کا قد ذرا سا دراز ہے تو تم کسی ایسے آدمی کو کیوں نہیں پکڑ لاتے جس کا قد تھوڑا سا نیچا ہو؟ اتنی موٹی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟"

جلاد دوڑے ہوئے نزدیک کے چوراہے پر گئے۔ ایک چھوٹے قد کا آدمی آٹے کا ایک بورا پیٹھ پر اٹھائے جاتا ہوا نظر آیا۔ جلادوں نے فوراً اس کو پکڑ لیا اور لاکر پھانسی کے نیچے کھڑا کر دیا۔ وہ چھوٹا آدمی چیخ چلا رہا تھا اور جلادوں سے پوچھ رہا تھا کہ میرا قصور کیا ہے؟ مجھے کیوں پھانسی پر چڑھاتے ہو؟ اتنے میں خود بادشاہ بھی تماشا دیکھنے ادھر آ گیا۔ وہ آدمی بادشاہ سے گڑگڑاکر کہنے لگا:

"میرے مالک! میں ایک غریب آدمی ہوں۔ پہاڑ سے لکڑیاں لاکر بیچتا ہوں اور لوگوں کا سامان ڈھوتا ہوں۔ اس طرح اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ آخر میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ کس بات کے لئے آپ مجھ کو پھانسی دینا چاہتے ہیں؟"

بادشاہ نے حقارت سے کہا:

"ارے احمق! مجھے اس کا کیا پتہ کہ تمہارا کوئی قصور ہے یا نہیں ہے۔ بس کسی آدمی کو پھانسی پر چڑھانا ہے۔ میں ایک چور کو پھانسی پر چڑھوانا چاہتا تھا لیکن معلوم ہوا کہ اس کا قد ذرا اونچا ہے اور اس کے پاؤں زمین سے اوپر نہیں اٹھ پاتے۔ اور تمہارا قد بالکل مناسب ہے۔"

چھوٹے قدوالے آدمی نے گڑگڑاکر کہا:

"بادشاہ عالم! قصور کیا ہے لمبے قد کے چور نے اور آپ پھانسی پر چڑھاتے ہیں چھوٹے قد کے ایک بےگناہ، بےقصور غریب آدمی کو۔ یہ بھی کوئی انصاف ہے؟ چور ضرورت سے زیادہ لمبا ہے تو آپ اس کے پاؤں کے نیچے ایک گڑھا کھدوا دیجئے اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کی بات بادشاہ کو پسند آئی۔ اس نے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا۔ جلاد دوبارہ چور کو پکڑ لائے۔ انھوں نے اس کو پھانسی کے نیچے کھڑا کرکے گلے میں پھندا ڈال دیا اور اس کے پاؤں کے نیچے گڑھا کھودنے لگے۔ اور چور تھا کہ برابر کہے جا رہا تھا:

"جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔"

بادشاہ کو بڑا تعجب ہوا اور اس نے پوچھا:

"ابے تو مرنے کے لئے کیوں اتنا بے تاب ہو رہا ہے؟"

"بادشاہ عالم!" چور نے جواب دیا۔ "ابھی ابھی جنت کا بادشاہ مر گیا ہے۔ اس نے مرتے وقت یہ وصیت کی ہے کہ جو سب سے پہلے جنت میں وارد ہو اس کو میری جگہ بادشاہ بنایا جائے۔ وہاں بادشاہ کا تخت ابھی خالی ہے۔ اگر جلد سے جلد قتل کر دیا جاؤں تو ممکن ہے کہ میں سب سے پہلے جنت پہنچ جاؤں اور شاہی تخت پر بیٹھ جاؤں۔"

بادشاہ کے دل میں لالچ اور حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ بھلا جنت کا بادشاہ بننا چھوٹی بات ہے؟ چنانچہ اس نے فوراً جلادوں کو حکم دیا:

"چور کو رہا کر دو اور مجھے پھانسی پر چڑھاؤ۔"

بادشاہ کے حکم کی تعمیل ہونی ہی چاہئے تھی۔ چنانچہ بےوقوف بادشاہ خود سولی پر چڑھا دیا گیا۔

واسلام قصہ تمام۔

# "مار میرے ڈنڈے!..."

قدیم زمانے کی بات ہے، کسی جگہ ایک بوڑھا شکاری اپنی بڑھیا کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے جال لگایا تو اس میں ایک سارس پھنس گیا۔ بوڑھا دوڑکر آیا اور سارس کو جال سے نکالنے ہی والا تھا کہ سارس آدمیوں کی طرح بول پڑا:

"بڑے میاں! تم مجھ کو چھوڑ دو۔ میں سارسوں کا سردار ہوں۔ تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں تمہاری ہر خواہش پوری کر دوں گا۔ وہ دور جو پہاڑ نظر آتا ہے نا اس کے پیچھے میرا گھر ہے۔ جس سے بھی پوچھوگے وہ میرا مکان بتا دے گا۔"

بوڑھے شکاری نے سارس کو آزاد کر دیا۔

اگلے دن بوڑھا انعام حاصل کرنے کے لئے سارس کے گھر روانہ ہوا۔ وہ چلتا رہا، چلتا رہا، ایک لمبا راستہ طے کیا، بیابانوں سے گزرا، پہاڑوں پر چڑھا، ندیوں اور نالوں کو پار کیا، راستے میں سات دن گزارے اور سات راتیں۔ بالآخر ایک مقام پر پہنچا جہاں ایک چرواہا بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ بوڑھے نے اس سے پوچھا:

"اے میاں چرواہے! یہ سب بھیڑ بکریاں کس کی ہیں؟"

"یہ سب سارس کے ہیں" اس آدمی نے جواب دیا۔

بوڑھا آگے چل پڑا۔ ایک جگہ پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک آدمی بہت سارے گھوڑے چرا رہا ہے۔ اس نے اس آدمی سے پوچھا:

"بھائی، یہ گھوڑے کس کے ہیں؟"

"یہ سب سارس کے ہیں" اس آدمی نے جواب دیا۔

"بھائی، تم مجھے ایک بات بتاؤ تو سہی" بوڑھے نے کہا۔ "سارس نے مجھے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے کون سا انعام مانگوں۔"

گھوڑوں کے چرواہے نے مشورہ دیا:

"سارس کے پاس ایک دیگچی ہے۔ اس کا نام ہے "ابل دیگچی"۔ مطلب ہے، جب تم اس سے کہوگے کہ "ابل دیگچی!" تو وہ فوراً ابلنے لگےگی اور اس میں سے سونے کی اشرفیاں گرنے لگیں گی۔"

بوڑھا آگے چلا۔ وہ رکے بغیر چلتا رہا، ایک لمبا راستہ طے کیا اور بالآخر اسے سارس کا مکان دکھائی دیا۔ بوڑھا ڈیوڑھی پار کرکے اندر آ گیا اور جھک کر سارس سے کہا:

"السلام علیکم!"

"واعلیکم السلام! اگر تم نے سلام نہ کیا ہوتا تو میں تم کو کچا ہی کھا جاتا" سارس نے کہا اور پھر اس نے پوچھا: "انعام لینے آئے ہو کیا؟ بولو کیا مانگتے ہو؟ مانگ لو۔"

"میں نے سنا ہے کہ تمہارے پاس ایک "ابل دیگچی" ہے بوڑھے نے کہا۔ "تم مجھے وہی دیگچی دے دو۔"

سارس سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا:

"بڑے میاں! وہ دیگچی تمہارے کس کام کی؟ میں تمہیں سونے سے بھری ایک تھالی دے دیتا ہوں۔"

لیکن بوڑھا راضی نہ ہوا تو سارس نے لاچار ہوکر وہی "ابل دیگچی" اسے دے دی۔ بوڑھا اسے لےکر واپس اپنے گھر چل دیا۔ وہ چلتا گیا، کہیں رکے بغیر چلتا چلا گیا۔ بہت لمبا راستہ طے کیا اور بالآخر اس مقام پر پہنچا جہاں اس کی جان پہچان کا ایک آدمی رہتا تھا۔ بوڑھا آرام کرنے کے لئے اس آدمی کے گھر گیا اور سلام علیک کرنے کے بعد اس آدمی سے کہا:

"میں بہت تھک گیا ہوں۔ تھوڑی دیر سو لوں۔ تم میری اس دیگچی پر نگاہ رکھنا۔ لیکن دیکھو، کہیں "ابل دیگچی!" نہ کہہ بیٹھنا۔"

جونہی بوڑھا سو گیا مالک مکان نے دیگچی سے کہا: "ابل میری دیگچی!" بس پھر کیا تھا، دیگچی سونے کی اشرفیاں اگلنے لگی۔ اس آدمی نے فوراً اشرفیاں جمع کر لیں۔ پھر اس نے جادو کی وہ دیگچی اندر لے جاکر چھپا دی اور اس کی جگہ بالکل اسی قسم کی ایک دوسری دیگچی لاکر رکھ دی۔

بوڑھا سوکر اٹھا تو مالک مکان کا شکریہ ادا کیا اور دیگچی کو اٹھاکر آگے چل پڑا۔ وہ جانے پہچانے راستے پر چلتا گیا اور بہت لمبا راستہ طے کرکے بالآخر اپنے گھر آ پہنچا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی بڑھیا کو اپنے پاس بلاکر کہا:

"بیگم! جلدی سے چادر بچھاؤ اور سونے کی اشرفیاں جمع کر لو۔"

بڑھیا نے فوراً ایک چادر لاکر فرش پر بچھا دی۔ بوڑھے نے اپنی لائی ہوئی دیگچی اس چادر پر رکھ دی اور پھر اپنے گلے کی پوری طاقت سے چیخ کر کہا:

"ابل میری دیگچی!"

مگر دیگچی میں نہ کوئی ابال آیا نہ کوئی اشرفی نکل‌کے باہر گری۔ بوڑھے نے دوبارہ چیخ‌کر کہا:

"ابل میری دیگچی!"

لیکن پھر وہی بات۔ غصے سے لال پیلا ہوکر بوڑھا چیخ پڑا:

"لعنت ہو سارس پر! بدمعاش نے مجھے دھوکا دے دیا ہے۔ کل ہی پھر چلا جاؤں‌گا اس کے پاس اور اس سے کوئی دوسری چیز وصول کر لاؤں‌گا۔"

اگلے دن پو پھٹتے ہی بوڑھا پھر سارس کے پاس چل دیا۔ وہ دن رات برابر چلتا

رہا، بہت لمبا راستہ طے کیا اور بالآخر اس چرواھے کے پاس پہنچ گیا جو گھوڑے چرا رہا تھا– بوڑھے نے اس سے سلام علیک کیا اور کہا:

"بھائی! سارس نے تو مجھے دھوکا دے دیا– جادو کی دیگچی کی جگہ کوئی دوسری دیگچی دے دی ھے– تم مجھے بتاؤ تو سہی، اب میں اس سے کون سی چیز مانگوں؟"

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد چرواھے نے کہا:

"سارس کے پاس جادو کا ایک دسترخوان ھے– اس کا نام ھے "کھل دسترخوان"– تم جب کہوگے "کھل میرے دسترخوان!" تو اس پر فوراً ھی طرح طرح کی کھانے کی چیزیں چن جائیں گی–"

بوڑھا چرواھے کے پاس سے چل‌کر سارس کے گھر پہنچا– ڈیوڑھی پار کرکے اندر گیا اور جھک‌کر سارس سے کہا:

"السلام علیکم!"

"واعلیکم السلام!" سارس نے جواب دیا– "اگر تم نے سلام نہ کیا ہوتا تو میں تمھیں کچا ھی کھا جاتا– پھر کیوں آ گئے؟ میں نے کل تمھیں "ابل دیگچی" تو دے دی تھی– کیا اس سے بھی تمھارا جی نہیں بھرا؟"

بوڑھے نے سارا حال بیان کیا اور کہا:

"تم نے مجھے دھوکا دیا ھے– "ابل دیگچی" کے بدلے کوئی عام قسم کی دیگچی دے دی ھے– اب میں تم سے ایک دوسری چیز مانگنے آیا ھوں– تمھارے پاس جو "کھل دسترخوان" ھے وھی اب مجھے دے دو–"

سارس نے بوڑھے کو "کھل دسترخوان" دے دیا– اس کو لےکر بوڑھا واپس اپنے گھر چل دیا– وہ چلتے چلتے، طویل مسافت کے بعد اس جگہ پہنچا جہاں اس کے واقف‌کار کا گھر تھا– بوڑھا گھر کے اندر گیا اور مالک مکان سے سلام علیک کرنے کے بعد اس سے کہا:

"میں بہت تھک گیا ھوں– تھوڑی دیر سو لوں– تم ذرا میرے اس دسترخوان پر نگاہ رکھنا– لیکن دیکھو، کہیں "کھل میرے دسترخوان!" نہ کہہ بیٹھنا–"

یہ کہہ‌کر اس نے دسترخوان ایک طرف رکھ دیا اور لیٹ‌کر سو گیا– جونہی وہ سو گیا اور خراٹے لینے لگا، مالک مکان نے دسترخوان سے مخاطب ہوکر کہا: "کھل میرے دسترخوان!"

یہ کہنا تھا کہ دسترخوان کھل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انواع و اقسام کے کھانوں سے بھر گیا۔ اس آدمی نے فوراً دسترخوان کو تمام چیزوں سمیت اٹھاکر اندر چھپا دیا اور بالکل اسی قسم کا ایک دوسرا دسترخوان لاکر اس کی جگہ رکھ دیا۔ بوڑھا جب سوکر اٹھا تو اسی نقلی دسترخوان کو اٹھاکر آگے چل دیا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے اپنی بیوی کو بلاکر اس سے کہا:

"بیگم! اب میں تمہیں ایسی ایسی چیزیں دکھاؤں گا کہ مزا آ جائے گا۔ بتاؤ تو سہی، کیا کھانا چاہتی ہو؟ پلک جھپکتے میں سب تیار ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا لایا ہوا دسترخوان نکال کر فرش پر رکھ دیا اور چیخ کر کہا:

"کھل میرے دسترخوان!"

لیکن نہ دسترخوان کھلا اور نہ ہی اس پر کھانے کی کوئی چیز سامنے آئی۔ بوڑھے نے دوبارہ زور سے کہا:

"کھل میرے دسترخوان!"

پھر وہی بات۔ بوڑھے نے مایوس ہوکر سوچا کہ بدمعاش سارس نے پھر مجھے چکمہ دیا ہے۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی بوڑھا پھر سارس کے پاس روانہ ہوا۔ وہ چلتا گیا، آگے بڑھتا گیا اور بہت لمبا راستہ طے کرکے گھوڑے چرانےوالے چرواہے کے پاس پہنچا۔ سلام علیک کرنے کے بعد اس نے چرواہے سے کہا:

"بھائی چرواہے! سارس نے مجھے پھر الو بنایا ہے۔ "کھل دسترخوان" کے بدلے کوئی معمولی قسم کا دسترخوان مجھے سونپ دیا ہے۔ بتاؤ تو سہی، اب کی میں اس سے کون سی چیز مانگوں؟"

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دشمن بہت ہیں" چرواہے نے کہا۔ "سارس کے پاس جادو کا ایک ڈنڈا ہے جو آپ ہی آپ مار پیٹ کرتا ہے۔ تم اس سے بس کہہ دو، "مار میرے ڈنڈے" اور وہ مارنا پیٹنا شروع کر دے گا۔ جو بھی سامنے آئے گا اس کو پیٹ کر رکھ دے گا۔"

بوڑھا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سارس کے گھر پہنچا اور اندر جاکر کہا:

"السلام علیکم!"

"واعلیکم السلام!" سارس نے جواب دیا۔ "اگر تم نے سلام نہ کیا ہوتا تو میں

تم کو کچا ہی نگل جاتا۔ پھر کیوں آ گئے۔ "ابل دیگچی" لے گئے، "کھل دسترخوان" بھی لے گئے۔ اب اور کیا لینے آئے ہو؟"

"اس دفعہ بھی تم نے مجھے دھوکا دیا ہے" بوڑھے نے کہا۔ "جادو کے دسترخوان کے بدلے کوئی معمولی سا دسترخوان دے دیا ہے۔ لیکن اب تو میں سچی چیز لوں گا۔ تم مجھے وہ ڈنڈا دے دو جو خود بخود مار پیٹ کرتا ہے۔"

"اچھا تم وہ ڈنڈا لینا چاہتے ہو؟ تو لے جاؤ۔ اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے" سارس نے کہا اور اس نے وہ ڈنڈا بوڑھے کو دے دیا۔ چلتے چلتے وہ اپنے واقف کار کے گھر پہنچا۔ آرام کرنے لیٹا تو مالک مکان سے کہا:

"تم ذرا اس ڈنڈے پر نگاہ رکھنا۔ لیکن دیکھو، "مار میرے ڈنڈے!" نہ کہہ بیٹھنا۔"

لیکن بوڑھے کی آنکھ لگتے ہی مالک مکان نے ڈنڈے سے کہا: "مار میرے ڈنڈے!" بس پھر کیا تھا ڈنڈے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سب گھروالوں کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ چیخ پکار سن‌کر بوڑھا جاگ گیا اور اٹھ‌کر دوڑا ہوا آیا۔ گھر کے سب لوگ چیختے چلاتے اور آٹھ آٹھ آنسو روتے ہوئے بوڑھے کی منتیں کرنے لگے:

"ڈنڈے کو روک دو۔ تمہاری دیگچی اور تمہارا دسترخوان ہم ہی نے لیا تھا۔ دونوں چیزیں ابھی واپس کئے دیتے ہیں۔ تم بس ڈنڈے کو روک دو۔"

"رک جا ڈنڈے!" بوڑھے نے چیخ‌کر کہا اور ڈنڈے نے مارنا پیٹنا بند کر دیا۔ گھر کے مالکوں نے فوراً ساتھ کے کمرے سے جادو کی دیگچی اور جادو کا دسترخوان دونوں لاکر بوڑھے کے حوالے کر دئے۔ ان کو اٹھاکر بوڑھا اپنے گھر روانہ ہوا۔ چلتے چلتے اور بہت لمبا راستہ طے کرکے وہ بالآخر اپنے گھر پہنچ گیا۔ آتے ہی اس نے اپنی بیوی کو بلایا اور دیگچی کو فرش پر رکھتے ہوئے چیخ‌کر کہا:

"ابل میری دیگچی!" یہ کہنا تھا کہ دیگچی سے سونے کی اشرفیاں اس طرح ابلنے لگیں کہ بوڑھا بڑھیا دونوں مل‌کر ان کو سمیٹ نہیں پا رہے تھے۔ جب سب اشرفیاں سمیٹ لی گئیں تو بوڑھے نے دیگچی کو ایک طرف کر دیا اور دسترخوان کو کمرے کے بیچ میں فرش پر رکھ‌کر بلند آواز سے کہا:

"کھل میرے دسترخوان!"

دسترخوان کھل گیا اور میاں بیوی دونوں کیا دیکھتے ہیں کہ دسترخوان پر نہ کچھ کم اور نہ کچھ زیادہ، ستر قسم کی کھانے کی چیزیں چنی ہوئی ہیں۔ بوڑھے بڑھیا

دونوں نے اتنے اور ایسے کھانے زندگی بھر نہ کبھی دیکھے تھے اور نہ ھی کبھی سنے تھے— انھوں نے خوب کھایا پیا، خوب موج اڑائی—

جادو کی دیگچی اور جادو کے دسترخوان والی بات اس ملک کے بادشاہ کے کانوں تک پہنچی— بادشاہ نے فوراً اپنے وزیر کو بوڑھے کے گھر بھیجا— وزیر نے آکر بڑے رعب سے بوڑھے سے کہا:

"بحکم سرکار تمہارے پاس جو دیگچی اور دسترخوان ھیں ان کو ابھی دے دو—"

بوڑھے نے چیخ کر کہا: "مار میرے ڈنڈے!"

ڈنڈے نے فوراً وزیر کی پٹائی شروع کر دی اور وہ بڑی مشکل سے بھاگ نکلا—

اگلے دن خود بادشاہ سات ہزار سپاھیوں کے لشکر کے ساتھ بوڑھے کے دروازے پر آ گیا— اس نے اپنی فوج کو دروازے کے سامنے کھڑا کر دیا اور گرج کر بوڑھے کو پکارا:

"ابے او بوڑھے! اگر تیرے جسم میں اب بھی جان باقی ھے تو نکل آ میدان میں— ذرا طاقت آزمائی کر لیں—"

بوڑھے نے اپنا دروازہ کھول دیا اور پورے زور سے چیخ کر کہا:

"مار میرے ڈنڈے!"

بس پھر کیا تھا ڈنڈے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بادشاہ اور سپاھیوں کو مارنے پیٹنے لگا— آن کی آن میں ساری فوج تتر بتر ہو گئی— اب ڈنڈا خود بادشاہ سلامت تک پہنچ گیا اور اس کی اس طرح خبر لی کہ اس نے واویلا مچا دیا اور بوڑھے کی منتیں کرنے لگا:

"خدا کے واسطے اپنے ڈنڈے کو روکو— میری جان بچاؤ—"

بوڑھا اپنے دروازے کے پاس کھڑا مسکرا رھا تھا— اس نے بادشاہ سے کہا:

"اب کہو تو مل گیا نا مزہ؟ اب بھی شرارت کروگے؟ اب بھی دیکھوگے ٹیڑھی آنکھوں سے غریب کی دولت کو؟"

اس طرح بوڑھا شکاری اور اس کی بوڑھی بیوی دونوں اپنی مراد پا گئے—

# بُلبُلِ خوش نوا

پرانے زمانے کی بات ہے، کسی جگہ ایک بادشاہ تھا جو اپنی رعایا کو بہت ستاتا رہتا تھا۔ اس نے عوام کو لوٹ لوٹ کر سونے، چاندی اور لعل و جواہر کی اتنی دولت بٹور لی تھی کہ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس دولت کا کیا کرے۔ ایک دن اس نے اپنے ملک کے بہترین کاریگروں کو جمع کرکے ان کو حکم دیا:

"ایک دیوھیکل درخت بناؤ۔ اس کا تنا ھیرے کا، شاخیں لعل کی، پتیاں زمرد کی اور پھل موتیوں کے ھوں۔ اس کی پتیاں اتنی گھنی ھوں کہ سورج کی ایک کرن بھی ان کے بیچ سے نہ گزر پائے۔"

بادشاہ کی یہ ھدایت سن‌کر رعایا میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگ کہنے لگے کہ جب تک یہ درخت بن‌کر تیار ھوگا بادشاہ شاید ھم کو بالکل ننگا کر دےگا اور بھوکوں مار ڈالےگا۔ لیکن بادشاہ نے ناراضگی ظاھر کرنےوالوں کو سخت سزائیں دیں۔ کسی کی گردن کٹوا دی تو کسی کو زنداں میں ڈلوا دیا۔ اس طرح اس نے لوگوں کے منھ بند کر دئے۔

سات سال کے اندر وہ درخت بن‌کر تیار ھو گیا۔

بادشاہ نے اپنا پلنگ اس درخت کے نیچے رکھوا دیا اور راتوں کو وھیں سونے لگا۔ ایک دن صبح کو وہ بیدار ھوا تو اس نے اپنے دائیں گال پر سورج کی گرمی محسوس کی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتا ھے کہ درخت کی زمرد کی پتیوں سے نیلے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ رھا ھے اور اس چھوٹے سے سوراخ سے سورج کی ایک کرن اس کے گال پر پڑ رھی ھے۔ بادشاہ گرج اٹھا:

"ارے کوئی چور میرے درخت کی ایک پتی چرا لے گیا ھے۔ جو کوئی اس چور کو پکڑ لائےگا اس کو میں ایڑی سے چوٹی تک سونے سے لاد دوں‌گا۔"

بادشاہ کے دائیں ھاتھ کے وزیر نے صلاح دی:

"بادشاہ عالم! رات کو درخت کے ارد گرد چالیس پہریدار کھڑے کر دیجئے گا۔ وہ چور کو ضرور پکڑ لیں گے۔"

وزیر کی بات بادشاہ کو پسند آئی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ چالیس ہتھیاربند پہریدار درخت کی رکھوالی کرنے لگے لیکن آدھی رات کے وقت وہ سب کے سب کھڑے ہی کھڑے سو گئے۔ صبح کو بادشاہ کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ درخت کی پتیوں کے بیچ جو چھوٹی سی کھلی جگہ تھی وہ بڑھ کر دگنی ہو گئی ہے۔ بادشاہ کو اتنا غصہ آیا، اتنا غصہ آیا کہ اس کے سر کا ایک ایک بال سوئی کی مانند کھڑا ہو گیا۔

"جلاد!" اس نے گلا پھاڑ کر پکارا۔

کالے کپڑوں میں ملبوس چودہ جلاد کالے گدھوں کی طرح آ موجود ہوئے اور اپنی تلواریں ننگی کر کے ایک آواز میں کڑک کر پوچھا:

"کس کی موت آئی ہے؟ کس کا سر تن سے جدا کیا جائے؟"

"ان سب کو قتل کر دو!" بادشاہ نے پہریدار سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن دائیں ہاتھ کے وزیر نے کہا:

"بادشاہ عالم! اگر روز چالیس سپاہیوں کی گردنیں کٹنے لگیں تو تھوڑے ہی دنوں میں آپ کی فوج ہی ختم ہو جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ آپ ان سب کو زنداں میں ڈلوا دیں اور درخت کے آس پاس دوسرے پہریدار کھڑے کر دیں۔"

ایسا ہی کیا گیا۔ ان چالیس پہریداروں کو زنداں میں ڈال دیا گیا۔

بادشاہ کے تین جوان بیٹے تھے۔ سب سے بڑے بیٹے نے باپ سے کہا:

"اباجان! آپ اجازت دیں تو آج رات میں درخت کے پاس پہرہ دوں۔ میں چور کو ضرور پکڑ لوں گا۔"

بادشاہ راضی ہو گیا۔ رات شروع ہوئی تو سب سے بڑا شہزادہ پہرہ دینے لگا۔ آدھی رات تک تو وہ درخت کے پاس کھڑا پہرہ دیتا رہا لیکن پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح کو آنکھیں کھولتے ہی بادشاہ نے دیکھا کہ درخت کی پتیوں کے بیچ جو سوراخ تھا وہ کئی گنا بڑا ہو چکا ہے۔ اس نے فوراً ہی اپنے بڑے بیٹے کو موت کی سزا سنا دی۔

اب بادشاہ کے منجھلے بیٹے نے اپنے باپ سے کہا:

"اباجان! اب میں درخت کے پاس پہرہ دوں گا۔ اگر میں چور کو نہ پکڑ سکا تو بھائی جان کے ساتھ مجھے بھی قتل کروا دیجئے گا۔"

لیکن منجھلے شہزادے کو بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی— آدھی رات کے بعد اس پر بھی نیند غالب آ گئی— صبح ہوتے ہوتے پتیوں کے بیچ ایک اور خالی جگہ بن گئی جو کم و بیش تھالی جتنی بڑی تھی—

مارے غصے کے بادشاہ کی آنکھیں جیسے ماتھے پر چڑھ گئیں، بالکل اس بلی کی طرح جس کے حلق میں چربی کا کوئی بڑا سا ٹکڑا اٹک گیا ہو—

"جلاد!" بادشاہ نے پکارا—

لیکن اتنے میں سب سے چھوٹا شہزادہ بول اٹھا:

"اباجان! آپ اجازت دیں تو تیر کمان لےکر میں درخت کی حفاظت کروں— میں چور کو تیر چلاکر مار ڈالوں گا—"

بادشاہ نے اجازت دے دی— اندھیرا چھا گیا تو چھوٹا شہزادہ تیر کمان سنبھالے غور سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا درخت کے نیچے پہرہ دینے لگا— آدھی رات کے وقت اسے نیند آنے لگی تو اس نے چھری سے اپنی ایک انگلی تھوڑی سی کاٹ‌کر زخم پر نمک مرچ چھڑک دیا اور درد نے نیند کو کوسوں دور بھگا دیا— پو پھٹنے سے تھوڑا سا پہلے اچانک ایک عجیب و غریب قسم کا پرندہ کہیں سے اڑکر آیا اور درخت پر بیٹھ گیا— وہ چونچ سے لےکر پنجوں تک سارے کا سارا مختلف قسم کے ہیرے جواہرات کا تھا— درخت کی ایک ٹہنی پر بیٹھکر وہ پرندہ اس طرح چہچہانے لگا کہ زمین و آسمان گونج اٹھے— شہزادے کا بالکل جی نہیں چاہتا تھا کہ اس عدیم المثال مغنی کے تیر مارے لیکن اس نے جی کڑا کرکے اس پر تیر چلا ہی دیا— اس کے ہاتھ البتہ کانپ گئے اور تیر پرندے کو صرف چھوکر نکل گیا— اس کے بازو کا بس ایک پر اکھڑکر نیچے گر پڑا— پرندہ اڑ گیا— صبح کو بادشاہ بیدار ہوا تو چھوٹا شہزادہ ایک ہاتھ میں تیر کمان سنبھالے اور دوسرے ہاتھ میں پرندے کا وہ پر لئے اس کے پاس آیا اور کہا:

"یہ لیجئے اس پرندے کا پر جو روز رات کو ہمارے درخت کی پتیاں توڑکر لے جایا کرتا تھا— وہ ایک بلبل خوش‌نوا تھی— لیکن میں اس کو مار نہ سکا— اس کا نغمہ اتنا شیریں تھا کہ میرے ہاتھ لرز گئے اور میں اس کا ایک پر ہی گرا سکا—"

بادشاہ نے وہ پر ہاتھ میں لےکر دیکھا تو اس کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا— یہ ایک پر اس ساری دولت سے بھاری تھا جس کو بادشاہ ٹیکسوں کی شکل میں اپنے سارے ملک سے سات سالوں میں وصول کرتا تھا—

بادشاہ بہت خوش ہوا اور زنداں میں پڑے ہوئے سپاہیوں اور اپنے دونوں بیٹوں کو رہا کر دینے کا حکم دیا۔

اسی دن اس نے سارے شہر میں یہ اعلان کرا دیا:

"جو کوئی اس پرندے کو پکڑکر لائےگا وہ میرے ساتھ تخت پر بیٹھےگا اور میرے ساتھ سارے ملک پر حکومت کرےگا۔ لیکن پرندے کو کوئی بھی پکڑکر نہ لا سکا تو میں سارے شہر کو جلاکر راکھ کر دوںگا۔"

بادشاہ کے بڑے اور منجھلے بیٹوں نے اپنے ہاتھ سینوں پر رکھکر جھک کر بادشاہ کو سلام کیا اور کہا:

"اباجان! اجازت دیجئے تو یہ کام ہم انجام دیں۔"

بادشاہ راضی ہو گیا۔ دونوں شہزادوں نے تاجروں جیسے کپڑے پہن لئے اور گھوڑوں پر سوار ہوکر شہر سے نکل گئے۔

تین دن گزر گئے۔ سب سے چھوٹے شہزادے کو خیال آیا: "میرے دونوں بھائی تو اس پرندے کو پکڑنے سے رہے۔ اور ممکن ہے کہ اباجان غصے میں سچ مچ ہی سارے شہر کو مٹاکر رکھ دیں۔ مجھے بھی چلنا چاہئے۔" یہ سوچ‌کر وہ اپنے باپ کے پاس گیا اور کہا:

"اباجان! مجھے بھی موقع دیجئے کہ آپ کی خدمت کروں۔ میں بہت چاہتا ہوں کہ اس جادو کے پرندے کو پکڑکر لاؤں۔ میں تو چلا ہی جاؤںگا چاہے آپ اجازت دیں یا نہ دیں۔"

بادشاہ بالکل نہیں چاہتا تھا کہ چھوٹا شہزادہ بھی چلا جائے مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا تو مجبور ہوکر ہاں کرنا پڑی۔

چھوٹا شہزادہ سفر پر نکلا اور اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے ایک ہفتے میں اپنے بھائیوں کو جا لیا۔ اب تینوں ایک ساتھ چلنے لگے۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے تین طرف کو راستے جاتے تھے۔ جہاں سے یہ تینوں راستے شروع ہوتے تھے وہاں ایک ایک پتھر پڑا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک پتھر پر لکھا تھا: "جو اس راستے پر جائےگا وہ ضرور لوٹ‌کر آئےگا۔" دوسرے پتھر پر لکھا تھا: "جو اس راستے پر چلےگا اس کو خطرات کا سامنا کرنا پڑےگا" اور تیسرے پتھر پر لکھا تھا: "جو اس راستے پر چلےگا وہ لوٹ‌کر نہیں آئےگا۔"

بڑے بھائی نے پہلا راستہ اختیار کیا۔ منجھلا بھائی دوسرے راستے پر چلا اور

سب سے چھوٹے بھائی کے لئے تیسرا راستہ رہ گیا جس کے پتھر پر لکھا تھا کہ جو اس راستے پر چلے گا وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

تھوڑی دور چل کر منجھلے بھائی کو ڈر لگنے لگا اور وہ اپنا راستہ چھوڑ کر بڑے بھائی سے جا ملا۔ یہ دونوں چلتے چلتے ایک اجنبی شہر میں پہنچے، گھوڑوں سے اترے، ایک دکان سے ایک ایک پیالہ دہی لیا اور دھوپ میں بیٹھ کر کھانے لگے۔ کھا چکے تو وہیں بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کے بالوں میں کنگھی کرنے لگے۔ بالکل سامنے بادشاہ کا محل تھا۔

شہزادی اپنے کمرے سے نکل کر اوپر کے برآمدے میں آئی تو اس کی نظر ان دونوں بھائیوں پر پڑی۔ اس نے سوچا کہ یہ کتنے بدتمیز ہیں کہ میرے سامنے بیٹھے بالوں میں کنگھی کر رہے ہیں۔ وہ ایک سیب کھا رہی تھی۔ جھنجھلا کر اس نے وہ سیب ان بے حیاؤں پر پھینک دیا۔ سیب ٹھیک نشانے پر بیٹھا یعنی بڑے بھائی کے ٹھیک سر پر آ لگا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے بالاخانے میں ایک حسین لڑکی دکھائی دی۔

اس نے سوچا، معلوم ہوتا ہے کہ اس حسینہ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ یہ سوچ کر وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔

شام کو شہزادی کی ایک کنیز نے ان کے پاس آکر سخت لہجے میں کہا:

"تم لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ چلے کیوں نہیں جاتے؟"

بڑے بھائی نے جواب دیا:

"شہزادی کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ اس نے میرے لئے سیب کا ایک ٹکڑا پھینکا، مجھ سے ہنسی بولی۔ بھلا اب میں کیسے چلا جاؤں؟"

"جلدی سے یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ نہیں تو شہزادی غصے میں آکر تم لوگوں کی گردنیں کٹوا دے گی۔"

دونوں بھائی گھبرا کر فوراً وہاں سے کھسک گئے۔

وہ دونوں اسی شہر میں رہنے لگے۔ انہیں کوئی کام کرنا نہیں آتا تھا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا اسے انہوں نے کچھ ہی دنوں میں کھا پی کر ختم کر دیا۔ اب نوبت یہاں تک آ گئی کہ وہ راتوں کو سڑک پر سونے لگے۔ تب وہ لاچار ہو کر لوگوں کی چاکری کرنے لگے۔ بڑا بھائی ایک چائے خانے میں نوکر ہو گیا۔ اس کا کام گاہکوں کو چائے، کھانا وغیرہ لاکر دینا تھا۔ منجھلا بھائی ایک طعام خانے کے چولھے میں لکڑیاں ڈالنے کا کام کرنے لگا۔

اب ان کو یہیں چھوڑکر ذرا چھوٹے بھائی کا حال سنئے–

چھوٹا بھائی دن رات برابر چلتا رہا– دریاؤں کو پار کرتا، جھیلوں کو پیچھے چھوڑتا، صحراؤں سے گزرتا اور پہاڑوں کو پار کرتا ہوا برابر آگے بڑھتا رہا– اس کے پاس جو کھانا تھا وہ ختم ہو گیا– صرف ایک سوکھی روٹی باقی رہ گئی–

وہ چلتے چلتے بالآخر ایک چشمے تک پہنچا جس کے کنارے ایک بہت بڑا اور گھنا چنار کا درخت تھا– اس نے گھوڑے سے اترکر اس کو چنار کے تنے میں باندھ دیا– تھیلے میں جو سوکھی روٹی پڑی تھی اس کو نکالا اور چشمے کے پانی میں بھگوکر کھانے ھی والا تھا کہ دفعتاً دوری پر گرد و غبار کا ایک بادل سا نظر آیا– غور سے دیکھنے پر پته چلا که ایک بہت ھی بڑا لنگور سرپٹ دوڑتا ہوا اسی طرف آ رہا ہے– یه دیکھکر شہزاده ڈر گیا اور روٹی وھیں چھوڑکر درخت پر چڑھ گیا– لنگور دوڑتا ہوا آیا اور روٹی پر ٹوٹ پڑا– دیکھتے ھی دیکھتے اسے کھا گیا– پھر اپنا منھ پونچھا اور نظریں اٹھاکر انسانوں کی بولی میں شہزادے سے کہا:

"نیچے اتر آؤ–"

شہزادے نے سوچا که روٹی سے اس کا پیٹ نہیں بھرا ہے– مجھ کو بھی کھا جانا چاھتا ہے– یه سوچ کر وہ اور اوپر چڑھ گیا– لنگور بھی نیچے کی ایک شاخ پر چڑھ گیا اور شہزادے سے مخاطب ہوکر کہا:

"اے آدمی‌زاد! نیچے اتر آؤ– یہاں آدمی چلے تو پاؤں جلیں، پرنده اڑے تو پر جلیں– ایسی جگه تم کیسے آ گئے؟"

شہزاده درخت سے نیچے اتر آیا اور سارا قصه لنگور کو سنا دیا– آخر میں اس نے بہت اداس ہوکر کہا:

"اگر میں اس بلبل خوش‌نوا کو ڈھونڈ نه پایا تو میرے باپ سارے شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا دیں گے–"

"کہتے ھیں که جس نے تمہیں ایک بار روٹی کھلائی ہو اس کو چالیس بار جھک کر سلام کرو" لنگور نے کہا– "میں نے تمہاری روٹی نه کھائی ہوتی تو اچھا تھا– لیکن اب کھا چکا ہوں تو تمہارے احسان کا بدله چکانا ھی پڑے گا– چلو اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ– قسمت نے ساتھ دیا تو ہم تم دونوں اس پرندے کو ضرور ڈھونڈ لیں گے اور شہر کو تباہ ہونے سے بچا لیں گے–"

وہ دونوں گھوڑے پر سوار ہوکر چل پڑے۔ چلتے چلتے وہ ایک باغ تک پہنچے جو ایک اونچی دیوار سے گھرا ہوا تھا۔ دونوں گھوڑے سے اترے۔ لنگور نے شہزادے سے کہا:

"میں اس دیوار کے نیچے ایک سرنگ کھودوں گا۔ تم پانچ دن تک میرا انتظار کرنا۔ اگر میں اس مدت میں نہ لوٹا تو تم جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جانا۔"

یہ کہہ کر لنگور سرنگ کھودنے لگا۔ پانچ دن گزر گئے۔ چھٹے دن لنگور واپس آ گیا اور اس نے شہزادے سے کہا:

"میں نے اس پنجرے کے نیچے تک سرنگ کھود دی ہے جس میں سات پردوں کے اندر وہی بلبل خوش‌نوا بند ہے۔ تم سرنگ کے اس سرے تک پہنچ کر پہریداروں کے سو جانے کا انتظار کرنا۔ جب وہ سو جائیں تو تم پنجرے کو اٹھاکر واپس چلے آنا۔ مگر دیکھو، پنجرے پر پڑے ہوئے پردے کو نہ اٹھانا۔"

شہزادے نے لنگور کی باتیں خوب اچھی طرح ذہن‌نشیں کر لیں اور زمین‌دوز راستے پر چل دیا۔ منزل پر پہنچ کر وہ پہریداروں کے سونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب دسوں پہریدار سو گئے تو وہ ان کے پاس سے گزرکر پنجرے تک پہنچا اور اس کو اٹھا لیا۔ اچانک اس نے سوچا کہ پنجرے کے اندر کہیں کوئی دوسرا پرندہ نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی لنگور کی نصیحت بھول‌کر وہ پنجرے کا پردہ اٹھانے لگا۔ سب سے اوپر کا پردہ تھوڑا سا ہی اٹھایا تھا کہ دفعتاً بلبل خوش‌نوا اس زور سے چہچہا اٹھی کہ وہ بت بن‌کر کھڑا رہ گیا اور پنجرہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ‌کر زمین پر گر پڑا۔ پہریدار جاگ گئے۔ انہوں نے شہزادے کو پکڑ لیا اور لے جاکر بادشاہ کے پاس کھڑا کر دیا۔ بادشاہ نے فوراً جلادوں کو بلاکر حکم دیا: "اس کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک کاٹ ڈالو۔"

لیکن بادشاہ کے وزیر نے اس سے کہا:

"بادشاہ عالم، آپ اس نوجوان کو سزا دینے میں عجلت نہ کیجئے۔ آئیے، پہلے اس سے یہ پوچھ لیں کہ آخر اس کو اس پرندے کی کیا ضرورت تھی۔"

بادشاہ راضی ہو گیا۔ شہزادے نے اس سے سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس کے بعد وزیر نے بادشاہ سے کہا:

"اگر ہم نے ایک پرندے کی خاطر اس بہادر نوجوان کو قتل کر دیا تو دنیا میں ہماری رسوائی ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ آپ اس کو کوئی مشکل کام بتائیں۔"

وزیر کی بات بادشاہ کو پسند آئی اور اس نے شہزادے سے کہا:

"جس طرف سورج غروب ہوتا ہے تم اس طرف چلے جاؤ– گھوڑے پر نو مہینے چلنے کے بعد ایک شہر ملے گا– اس شہر کے بادشاہ کی بیٹی سونے کے ایک صندوق میں سوتی ہے– تم اس لڑکی کو لاکر مجھے دوگے تو میں تمہیں یہ بلبل خوش‌نوا دے دوں گا–"

شہزادہ لنگور کے پاس لوٹ آیا اور تمام باتیں بتا دیں–

وہ دونوں پھر گھوڑے پر سوار ہوکر چل پڑے– نو مہینے تک برابر چلتے رہے اور بالآخر ایک شہر کے نزدیک پہنچے– وہ شہر کے باہر ایک میدان میں رکے اور لنگور سرنگ کھودنے لگا– نو دنوں اور نو راتوں کے بعد وہ اپنا کام مکمل کرکے شہزادے کے پاس لوٹ آیا اور اس سے کہا:

"جس محل میں بادشاہ کی بیٹی رہتی ہے وہاں تک میں نے سرنگ بنا دی ہے– تم اس راستے سے جاکر محل میں داخل ہو جاؤ– پھر چالیس زینے چڑھکر اور چالیس کمروں سے گزرکر اوپر دالان میں آجانا– مہ‌لقا حسینہ وہیں چالیس کنیزوں کے گھیرے میں سونے کے ایک صندوق کے اوپر بیٹھی رہتی ہے– نیند آنے لگتی ہے تو وہ صندوق کا ڈھکنا کھول‌کر اس کے اندر لیٹ جاتی ہے– تم پہلے صندوق کے اندر دیکھ لینا کہ شہزادی کی آنکھیں بند ہیں یا کھلی ہوئی ہیں– آنکھیں کھولے سو رہی ہو تو صندوق کو اٹھاکر چل دینا لیکن اس کی آنکھیں بند ہوں تو رہنے دینا–"

لنگور نے جیسے کہا تھا ویسے ہی شہزادہ محل میں داخل ہوکر اوپر کے دالان تک پہنچ گیا– دروازے سے جھانک‌کر دیکھا تو شہزادی صندوق کے اوپر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ارد گرد چالیس کنیزیں موجود تھیں– شہزادی اتنی حسین تھی کہ جو دیکھتا ہوش و حواس کھو بیٹھتا– تھوڑی دیر کے بعد شہزادی صندوق کے اندر لیٹ گئی– کنیزیں بھی صندوق کے ارد گرد سو گئیں– تب شہزادے نے دبے پاؤں جاکر صندوق کے اندر دیکھا– شہزادی کی آنکھیں بند تھیں– یہ دیکھکر شہزادے کو چپکے سے کھسک جانا چاہئے تھا– لیکن شہزادی کا حسن و جمال دیکھتے ہی وہ بےقابو ہو گیا اور لنگور کی نصیحت کو بھول‌کر شہزادی کے اوپر جھکتے ہوئے اس کو چومنا چاہا– اس کی سانسوں کی حرارت سے شہزادی کے چہرے پر بادل چھا گئے اور اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں– شہزادے کو دیکھتے ہی اس نے چیخ کر پوچھا:

"کون ہے تو؟ تجھے کیا چاہئے؟"

6—1805

چیخ سن‌کر کنیزیں جاگ گئیں— انہوں نے شہزادے کو پکڑ لیا اور مشکیں کس‌کر اس کو بادشاہ کے پاس لے گئیں— بادشاہ نے غصے میں آکر اس کے قتل کا حکم صادر کر دیا— لیکن اس کے وزیر نے کہا:

"جہان پناہ! اگر ہم نے اس کو قتل کر دیا تو صبح ہوتے ہوتے یہ خبر سارے شہر میں پھیل جائےگی— پھر ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں‌گے؟ بہتر ہوگا کہ آپ اس کو کوئی مشکل سا کام بتائیے—"

بادشاہ راضی ہو گیا اور اس نے شہزادے سے کہا:

"میں نے سنا ہے کہ یہاں سے نو مہینوں کی دوری پر بحرقلزم واقع ہے اور اس کے بیچوں بیچ الماس کا جزیرہ ہے— وہاں آرزقی نام کا ایک جادوگر رہتا ہے جس کے پاس قارا قلدرغاچ (کالی ابابیل) نام کا ایک گھوڑا ہے— وہ گھوڑا ایک مہینے کا راستہ پلک جھپکتے میں طے کر لیتا ہے— تم گھوڑا لاکر مجھے دینا اور میری بیٹی کو لے جانا—"

شہزادہ لنگور کے پاس لوٹ آیا اور آٹھ آٹھ آنسو روتے ہوئے سارا قصہ اس کو سنا دیا— لنگور نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

"شہزادے! تم پریشان نہ ہو— قسمت نے ساتھ دیا تو میں گھوڑا تمہیں دلا دوں‌گا—"

دونوں پھر چل پڑے— وہ صحراؤں، بیابانوں اور پہاڑوں کو پار کرتے ہوئے چلتے گئے اور بالآخر ایک بےکنار سمندر ان کے سامنے نمودار ہوا— اس کو دیکھ‌کر شہزادہ اداس ہو گیا اور اس نے لنگور سے کہا:

"ہم اس کو کیسے پار کریں‌گے؟ ڈوب‌کر مر نہ جائیں‌گے؟"

لنگور نے اس کو تسلی دی:

"ہر کام میں دل مضبوط کرکے لگ جانا چاہئے— گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں—" یہ کہہ‌کر لنگور سمندر کے نیچے ایک سرنگ کھودنے لگا—

چالیس دن بیتے، چالیس راتیں گزریں تو وہ اپنا کام مکمل کرکے واپس آیا اور شہزادے سے کہا:

"میں نے گھوڑے کی اگلی ٹانگوں کے نیچے تک زمین‌دوز راستہ بنا دیا ہے— سرنگ کے اس سرے پر پہنچ‌کر سوراخ سے اپنا سر باہر نکالنا— تمہیں دیکھ‌کر گھوڑا ہنہنانے لگےگا— یہ سن‌کر جادوگر اپنے بستر سے اٹھ‌کر گھوڑے کے پاس آئےگا اور اس کے ایک

کوڑا مارکے واپس چلا جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد تم دوبارہ سوراخ سے اپنا سر باہر نکالنا۔ گھوڑا پھر ہنہنانے لگے گا۔ پھر جادوگر آکر اور اس کے ایک کوڑا مارکر چلا جائے گا۔ تب تم آہستہ سے باہر نکل آنا اور اس سے پہلے کہ گھوڑا ہنہنانے لگے، تم اس کا منہ کشمشوں‌والے اس تھیلے میں ٹھونس دینا اور اس سے کہنا:

"صد افسوس قارا قلدرغاچ! تم کب تک اس ظالم کے ہاتھوں مار پیٹ کھاتے رہوگے؟ یہ کہہ کر پھرتی سے گھوڑے کو لےکر وہاں سے نو دو گیارہ ہو جانا۔ زین، لگام وغیرہ کی فکرمت کرنا۔ جلدی سے کھسک لینا۔"

لنگور کی باتیں ذہن‌نشین کرکے شہزادہ زمین‌دوز راستے پر روانہ ہو گیا اور سرنگ کے اس سرے پر پہنچ‌کر سوراخ سے اپنا سر باہر نکالا۔

آہٹ پاکر گھوڑے قارا قلدرغاچ نے اپنے کان کھڑے کر لئے، دم اوپر اٹھا لی اور بےچین ہوکر ناچنے لگا۔ پھر اس نے شہزادے کو دیکھ لیا اور زور زور سے ہنہنانے لگا۔ جادوگر آ گیا۔ قد جیسے مینار، دونوں کندھے جیسے چنار کے درخت، منہ جیسے کوئی غار، آنکھیں جیسے دو پرانے بورے، ناک بالکل تندور جیسی اور کسی بہت بڑے ہاتھی کا جیسا جسم۔ آتے ہی جادوگر یہ کہتے ہوئے گھوڑے پر ٹوٹ پڑا:

"لعنت ہو تجھ پر! ذلیل کہیں کا! یہاں کون سا انسان آ سکتا ھے جس کی تو بو پا گیا ھے؟ یہاں تو انسان چلے تو پاؤں جلیں، پرندہ اڑے تو پر جلیں۔"

یہ کہتے ہوئے جادوگر نے گھوڑے کی پیٹھ پر ایک کوڑا کھینچ‌کر مارا اور لوٹ گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد شہزادے نے دوبارہ اپنا سر باہر نکالا۔ گھوڑا پھر ہنہنانے لگا۔ جادوگر پھر آیا اور گھوڑے پر برس پڑا:

"ارے تجھے موت آئے! آخر کس انسان کی بو پا گیا تو؟ کہاں ھے وہ انسان؟ چاھے آسمان پر ہو یا زمین کے نیچے، وہ مجھ سے بچ نہیں سکتا۔ پکڑکر اسے کچا کھا جاؤں گا۔"

جادوگر گھوڑے کو کوڑا رسید کرکے پھر چلا گیا۔ تب شہزادہ اچک‌کر اوپر چڑھ آیا اور جلدی سے آکر کشمشوں کا تھیلا گھوڑے کے سر سے لٹکا دیا اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"ارے یار! تم کب تک اس جادوگر کے دست نگر رہوگے؟ کب تک اس کی مار کھاتے رہوگے؟"

یہ کہتے ہوئے شہزادہ اچک کر گھوڑے پر چڑھ گیا اور اسے ایڑ لگائی۔ قارا قلدرغاچ نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور ایال کو پھڑپھڑایا۔ اس کے دونوں طرف پر نکل آئے اور وہ کسی چیل کی مانند آسمان کی طرف اڑ چلا۔ اس کے سم کے نیچے سے ایک بجلی سی کوندی، جاکر جادوگر کے ماتھے پر لگی اور وہ جاگ اٹھا۔ وہ "رک جا! رک جا" چلاتا ہوا اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے گھوڑے کے پیچھے دوڑ پڑا۔ گھوڑا سمندر کی طرف اڑنے لگا۔ جادوگر اس کے بہت قریب پہنچ گیا اور اس کی دم پکڑنے ہی والا تھا کہ اس نے اپنی پچھلی ٹانگیں زور سے جھٹک کر جادوگر کے منہ پر زبردست دولتی ماری۔ اس کا منہ سڑے گلے پرانے کپڑے کی طرح پھٹ گیا۔ وہ سمندر کے پانی میں گر پڑا اور ڈوب گیا۔

نو مہینوں کا راستہ گھوڑے نے نو دنوں میں طے کر لیا۔ اچانک شہزادے نے دیکھا کہ سامنے صندوق کے اندر سونے والی شہزادی کا شہر ہے اور شہر کے دروازے کے سامنے لنگور بیٹھا اخروٹ توڑ توڑکر کھا رہا ہے۔

"اب کیا کریں گے؟" لنگور نے شہزادے سے پوچھا۔

شہزادے نے جواب دیا:

"اب کیا کرنا ہے۔ اب گھوڑے کو دےکر اس کے عوض میں لڑکی کو لے لیں گے۔"

"ارے تم بھی کیا باتیں کرتے ہو! بھلا ایسے گھوڑے کو کیسے دے دیں؟ ایک بات سنو۔ میں ایک قلابازی کھاکر گھوڑا بن جاؤں گا۔ تم دونوں گھوڑوں کو لےکر بادشاہ کے پاس جانا اور اس سے کہنا کہ ان گھوڑوں میں سے کسی ایک کو چن لو۔ بادشاہ مجھ کو چن لےگا۔"

لنگور قلابازی کھاکر ایک گھوڑا بن گیا۔ ایک ایسا گھوڑا جس کے آگے قارا قلدرغاچ ایک گدھے سے بھی گیا گزرا لگتا تھا۔ شہزادہ دونوں گھوڑوں کو لےکر شاہی محل کی طرف روانہ ہوا۔ بادشاہ اپنے محل میں بیٹھا ہوا تھا۔ کھڑکی سے دو کالے رنگ کے بےحد خوبصورت چمکتے چمکیلے گھوڑوں کو دیکھکر اس نے اپنے وزیر سے کہا:

"اس آدمی کو بلاؤ۔ اس کے گھوڑے ہمیں بہت پسند آ گئے۔ اس نے بیچا تو ہم خرید لیں گے۔"

شہزادے کو بادشاہ کے پاس لایا گیا۔

"تمہارے گھوڑوں کے کیا دام ہیں؟" بادشاہ نے شہزادے سے پوچھا۔

"میں ان کو نہیں بیچوں گا" شہزادے نے جواب دیا۔ "ان میں سے ایک کو میں آپ کو آپ کی بیٹی کے عوض میں دے دوں گا۔"

"ارے بےوقوف!" بادشاہ نے کہا۔ "کہیں گھوڑے کے عوض میں لڑکی بھی دی جاتی ہے؟"

تب شہزادے نے کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی کہی ہوئی بات بھول گئے ہیں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا نا کہ قارا قلدرغاچ کو لاکر دوگے تو میں اپنی بیٹی تمہیں دے دوں گا۔"

بادشاہ لاجواب ہو گیا اور اس نے اپنے وزیر سے پوچھا کہ اب کیا کیا جائے۔

وزیر نے کہا:

"مرد آدمی کوئی بات کہہ کر اس سے منکر نہیں جاتا۔ شیر جس راستے سے جاتا ہے اس راستے سے نہیں ہٹتا۔ آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا پڑے گا۔"

بادشاہ نے شہزادے سے کہا:

"ہم دونوں گھوڑوں کو لیں گے۔ ایک کا دام سونے سے چکائیں گے اور دوسرے کے عوض میں ہم اپنی بیٹی کو دے دیں گے۔"

"آپ اپنی بیٹی کو دے کر ان گھوڑوں میں سے کسی ایک کو لیجئے" شہزادے نے جواب دیا۔ "دوسرا میرے پاس رہے گا اور آپ کی بیٹی اس پر سواری کیا کرے گی۔"

"ان گھوڑوں میں سے کونسا زیادہ اچھا ہے؟" بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا۔

وزیر نے قارا قلدرغاچ کو پسند کیا۔ لیکن بادشاہ کو لنگور گھوڑا زیادہ پسند آیا۔ چنانچہ اس نے لنگور گھوڑے کو لےکر اس کے عوض میں اپنی بیٹی کو مع اس صندوق کے جس میں وہ سویا کرتی تھی، شہزادے کو دے دیا۔ لنگور گھوڑے کو کسی طرح اصطبل میں تو لے آیا گیا لیکن اس نے کسی طرح اپنے آپ کو باندھنے نہ دیا۔ وہ دونوں کان کھڑے کئے دم اوپر اٹھائے اپنی باگ چباتا اور نزدیک آنےوالے کو ٹانگوں سے مارنے اور کاٹنے کی کوشش کرتا رہا۔ چنانچہ اس کو اصطبل کے اندر یوں ہی کھلا چھوڑکر دروازے پر باہر سے آدمی کے سر جتنا بڑا تالا لگا دیا گیا۔ اصطبل کی چھت پر چالیس پہریدار کھڑے کر دئے گئے۔ خود بادشاہ اس کے پاس اپنا پلنگ رکھواکر رات کو وہیں سویا۔ لیکن رات کو گھوڑے نے پھر سے لنگور کی شکل اختیار کر لی، دیوار کی ایک درار سے باہر آ گیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ صبح ہوئی اور بادشاہ نے روشن‌دان

سے اصطبل کے اندر جھانکا تو دیکھا کہ گھوڑا غائب ہے— وہ ادھر ادھر دوڑنے اور شور مچانے لگا— وزیر دوڑا ہوا آیا اور بادشاہ کو تسلی دینے لگا:

"قارا قلدرغاچ جادوگر آرزقی کا گھوڑا تھا اور جادو کا حکم تو اچھی بری سبھی روحوں پر چلتا ہی ہے— شاید جادوگر اپنے گھوڑے کو واپس لے گیا ہے— اسی گھوڑے کے لالچ میں آج تک کتنے ہی بادشاہوں کے سر کٹ چکے ہیں— آپ پریشان نہ ہوں— یہی غنیمت ہے کہ جادوگر نے ہم کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا— اور یہ بات بھی ہے کہ آپ کی بیٹی ایک بادشاہ کی ملکہ بننےوالی ہے اور گھوڑوں میں سے ایک اس کے پاس ہے—"

اچھا اب ان کو یہیں چھوڑ دیجئے اور شہزادے کا حال سنئے—

شہزادی کو مع صندوق لےکر اڑنےوالے گھوڑے قارا قلدرغاچ پر سوار شہزادہ اس شاہی باغ تک آ پہنچا جہاں بلبل خوش‌نوا پنجرے میں بند رہتی تھی— آکر شہزادے نے دیکھا تو لنگور باغ کی دیوار کے نیچے بیٹھا اخروٹ توڑ توڑکر کھا رہا تھا—

"اب کیا کریں گے؟" لنگور نے شہزادے سے پوچھا—

"اب کیا کرنا ہے" شہزادے نے جواب دیا— "بس اب لڑکی کو دےکر بلبل خوش‌نوا کو لے لیں گے اور گھر چلیں گے—"

"ارے نادان!" لنگور نے کہا— "ایک پرندے کے عوض میں لڑکی کو کیسے دے دیا جائے— مناسب یہ ہے کہ میں ایک قلابازی کھاکر ایک لڑکی بن جاؤں— ایسی لڑکی جس کے سامنے یہ شہزادی نوے سال کی بڑھیا سے بھی گئی گزری لگے— تم ہم دونوں کو بادشاہ کے پاس لے جانا— بادشاہ مجھ کو چن لے گا—"

"کیوں نہ میں اکیلے تم ہی کو بادشاہ کے پاس لے جاؤں؟" شہزادے نے کہا—

"نہیں— ایسا مت کرو" لنگور نے جواب دیا— "ایمانداری سے کام لینا چاہئے— بادشاہ خود پسند کر لے تاکہ بعد میں اسے پچھتانا نہ پڑے—"

لنگور ایک بےحد حسین لڑکی بن گیا— شہزادہ دونوں لڑکیوں کو لےکر محل کے دروازے پر پہنچا— بادشاہ نے کھڑکی سے اس کو دیکھا اور کسی خدمت‌گار سے کہا:

"دروازے پر جو بھکاری کھڑا ہے اس کو کچھ دے دو—"

لیکن وزیر نے اس سے کہا:

"وہ نوجوان کوئی بھکاری نہیں ہے— یہ تو وہی شہزادہ ہے جس کو آپ نے حسین شہزادی کو لے آنے کے لئے دور دیس میں بھیجا تھا—"

بادشاہ نے شہزادے کو اندر بلایا اور اس سے پوچھا:

"اچھا تو بتاؤ- تم ہمارا بتایا ہوا کام کر آئے؟"

"جی ہاں حضور، کر آیا ہوں" شہزادے نے جواب دیا-

"لڑکی کہاں ہے؟" بادشاہ نے پوچھا-

شہزادے نے کہا:

"آپ نے ایک لڑکی کو لانے کے لئے کہا تھا- میں دو لڑکیاں لے آیا ہوں- ان میں سے جو آپ کو زیادہ پسند ہو، لے لیجئے- دوسری میرے پاس رہے گی-"

دونوں صندوقوں کو کھولا گیا- دونوں لڑکیاں ایک ساتھ چھینکیں اور اٹھ کھڑی ہوئیں- ان دونوں کا حسن دیکھکر بادشاہ دنگ رہ گیا- پھر بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا:

"ان میں سے کس کو لیا جائے؟"

وزیر نے شہزادی کی طرف اشارہ کیا- لیکن بادشاہ کو وہ لڑکی زیادہ پسند آئی جو اصل میں لنگور تھی- چنانچہ بادشاہ نے اسی کو لے لیا اور اس کے عوض میں بلبل خوش‌نوا کو شہزادے کے حوالے کر دیا- شہزادہ شہر سے باہر نکل آیا- وہ گھوڑے قارا قلدرغاچ پر سوار ہو گیا اور اپنے ایک گھٹنے پر شہزادی‌والے صندوق کو اور دوسرے گھٹنے پر بلبل خوش‌نوا‌والے پنجرے کو رکھے گھوڑے کو اڑاتا ہوا اپنے ملک کی طرف روانہ ہوا-

ادھر بادشاہ نے بڑی دھوم دھام سے لنگور شہزادی سے شادی رچائی- یہ دھوم دھام عین عروج پر تھی کہ لنگور چپکے سے اٹھا، اپنی اصلی شکل اختیار کرکے دیوار کے ایک سوراخ سے باہر آیا اور نو دو گیارہ ہو گیا-

اب شہزادے کا حال سنئے-

شہزادہ اپنے گھوڑے کو اڑاتا ہوا ایک مقام پر پہنچا جہاں چنار کا ایک پرانا درخت تھا- یہاں پہنچ‌کر اس نے دیکھا کہ لنگور پہلے ہی سے چنار کے نیچے بیٹھا دانتوں سے اخروٹ توڑ توڑکر کھا رہا ہے-

"اب کیا کریں گے؟" لنگور نے پوچھا-

"اب میں اپنے گھر چلا جاؤں" شہزادے نے جواب دیا-

لنگور نے کہا:

"نہیں۔ پہلے تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ دو چار روز میرے ہاں مہمان رہو۔ پھر اپنے گھر چلے جانا۔"

"تمہارا گھر تو کسی پہاڑ پر کوئی تنگ و تاریک سوراخ ہوگا۔ میں اس سوراخ میں گھس بھی پاؤں گا؟" شہزادے نے جواب میں کہا۔

لنگور ہنس کر بولا:

"ارے ابھی تک تمہیں یہ معلوم نہیں ہو پایا کہ میں کون ہوں؟"

شہزادہ لنگور کے ساتھ ہو لیا۔ وہ ایک پہاڑ کو پار کرکے ایک بڑے پھاٹک کے سامنے جاکر رکے جس پر بہت خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور سونے کے کڑے لگے ہوئے تھے۔ اندر داخل ہوئے تو شہزادے نے دیکھا کہ ایک نہایت ہی عمدہ باغ ہے۔ چاروں طرف رنگ برنگے خوشنما گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ نالی میں صاف شفاف پانی بہہ رہا ہے۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا تالاب ہے اور اس کے اوپر بیدمجنون جھکا ہوا ہے۔ درختوں پر کئی قسم کے پھل پک گئے ہیں اور ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ باغ کے چاروں کونوں میں چار مکان ہیں جو سب سونے کے بنے ہوئے ہیں اور ہر ایک میں چالیس کمرے ہیں۔ ہر کمرے میں نوعمر پریاں بیٹھی لکھنے پڑھنے میں مصروف ہیں۔

لنگور نے ایک قلابازی کھائی اور اب وہ ایک نہایت خوبصورت پری بن گیا۔ ایسی خوبصورت لڑکی کو شاید ہی کبھی کسی ماں نے جنم دیا ہو۔

شہزادہ تین دن تک پری کے ہاں مہمان رہا۔ چوتھے دن وہ جانے لگا تو پری نے اپنی چوٹی سے ایک بال توڑکر اس کو دیا اور کہا:

"کبھی تمہیں کسی مشکل کا سامنا ہو جائے تو اس بال کے ایک سرے کو جلا دینا۔ میں فوراً حاضر ہو جاؤں گی۔"

شہزادے نے پری سے پوچھا:

"تم نے میرے اوپر اتنا احسان کیا، میری برابر مدد کرتی رہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

تب پری نے بتایا:

"جس دن تم سے میری ملاقات ہوئی اس سے بہت دن پہلے ایک دفعہ میں نے فال دیکھا تھا تو مجھ پر یہ کھلا تھا کہ جہاں سورج غروب ہوتا ہے وہاں ایک ملک ہے جس کا بادشاہ بہت ہی ظالم ہے۔ وہ اپنی رعایا کو بھوکوں مارکر ہیرے جواہرات کا ایک

درخت بنوا رہا ہے۔ جب یہ درخت بن کر تیار ہو جائے گا تو ایک دن اسی درخت کی خاطر وہ سارے شہر کو مٹانے پر تل جائے گا۔ اس بادشاہ کے تین بیٹے ہیں۔ سب سے چھوٹا بیٹا سوچے گا کہ اگر اس درخت کی وجہ سے باپ نے سارے شہر کو تباہ و برباد کر دیا تو یہ بدترین بات ہوگی اور ارادہ کر لے گا کہ میں اس پرندے کو ضرور پکڑ لاؤں گا جو اس درخت کی پتیاں چراکر لے جایا کرتا ہے۔

جب مجھ پر یہ سب راز کھلا تو میں نے سوچا کہ یہ نوجوان غریب لوگوں کی خاطر اپنی جان تک قربان کرنے پر تیار ہے تو میں کس طرح یہاں تخت پر بیٹھی خوشیاں مناتی، گلچھرے اڑاتی رہوں۔ چنانچہ میں سات سال تک برابر تمہیں تلاش کرتی رہی اور بالآخر تم مل ہی گئے۔"

شہزادے نے پری کا شکریہ ادا کیا اور اس کو الوداع کہہ کر شہزادی کو ساتھ لئے اور بلبل خوش‌نوا والے پنجرے کو اٹھائے اپنے راستے پر روانہ ہو گیا۔

چلتے چلتے شہزادہ اس مقام پر پہنچا جہاں وہ اپنے بھائیوں سے جدا ہوا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو روک لیا اور سوچنے لگا کہ "میرے بھائی اب کہاں ہوں گے۔ کیوں نہ میں ان کو تلاش کر لوں"۔ یہ طے کرکے وہ ایک غار کی طرف چلا۔ لڑکی اور پرندے والے پنجرے کو اس غار کے اندر چھوڑکر خود اس راستے پر چل دیا جس پر اس کا بڑا بھائی گیا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک شہر میں پہنچا۔ ایک چائے خانے میں اس نے دیکھا کہ اس کا بڑا بھائی گاہکوں کی خدمت کرتا پھر رہا ہے۔ شہزادے نے گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے چائے خانے کے مالک سے پکارکر کہا:

"ارے چائے خانے والے! ذرا اپنے اس نوکر سے میرے لئے کھانا اور چائے سامنے کی کاروان سرائے میں بھیج دینا!"

چائے خانے کے مالک نے اپنے نوکر کو بلاکر کہا:

"یہ لے سالے، اس سامنے کی کاروان سرائے میں دے آ۔ دیکھ، ذرا سنبھال کر لے جا۔ کہیں گرا نہ دے" یہ کہتے ہوئے اس نے نوجوان کے گال پر ایک تھپڑ رسید کیا۔

کھانا لے کر وہ اپنے چھوٹے بھائی کے پاس آیا تو چھوٹے بھائی نے اس سے کہا:

"آئیے، بیٹھ جائیے اور یہ کھانا آپ خود کھا لیجئے۔"

"نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ مالک ناراض ہو جائے گا" بڑے بھائی نے کہا۔

چھوٹے بھائی نے اصرار کیا:

"ڈرئیے مت۔ وہ ناراض نہیں ہوگا۔"

بڑا بھائی بیٹھ گیا اور کھانے لگا۔ کھا چکا تو چھوٹے بھائی نے اس سے پوچھا:

"آپ کہاں کے رہنے‌والے ہیں؟"

"میں چائےخانے میں نوکر ہوں۔ یہیں کا رہنے‌والا ہوں۔ یہیں پیدا ہوا ہوں" بڑے بھائی نے جواب دیا۔

چھوٹے بھائی نے کہا:

"مجھ سے چھپانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ سچ بتا دیں گے تو میں آپ کو آپ کے وطن پہنچا دوں گا۔"

بڑا بھائی رو پڑا اور اپنی آپ بیتی شروع سے آخر تک سنا دی۔ تب چھوٹے بھائی نے پوچھا:

"آپ اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھیں تو کیا اس کو پہچان لیں گے؟"

"ہاں، پہچان لوں گا" اس نے جواب دیا۔

"کیسے پہچان لیں گے" چھوٹے بھائی نے پوچھا۔

"اس کی ایک نشانی ہے" بڑے بھائی نے کہا۔ "ان دنوں کی بات ہے جب ہم ابھی چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ایک دن میں گھوڑے کو پانی پلانے کے لئے ندی پر لے جا رہا تھا تو چھوٹا بھائی ضد کرنے لگا کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ وہ گھوڑے کے پیچھے دوڑنے لگا۔ گھوڑے نے اس کو دولتی مار دی۔ اس کے بائیں کندھے پر اس کا نشان باقی رہ گیا۔"

"آپ نے اس بیچارے کو تسلی دی ہوتی۔ گھوڑے پر بٹھاکر سیر کرا دی ہوتی۔ آخر ایسا کیوں نہیں کیا؟" چھوٹے بھائی نے پوچھا۔

"وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ بس اسی لئے ایسا نہیں کیا" بڑے بھائی نے جواب دیا۔

"آپ کے چھوٹے بھائی کی جو نشانی ہے وہ اس سے ملتی جلتی تو نہیں ہے؟" یہ کہتے ہوئے چھوٹے بھائی نے اپنا بایاں کندھا کھول کر دکھایا۔

بڑا بھائی اس کے قدموں میں گر پڑا اور سسک سسک کر رونے لگا۔ چھوٹے بھائی نے اس کو اٹھایا اور اس کے آنسو پونچھے۔ پھر وہ اپنے بڑے بھائی کو لےکر بازار گیا اور اس کو اچھے اچھے کپڑے اور ایک گھوڑا خرید دیا۔ اس کے بعد یہ دونوں منجھلے بھائی کی تلاش میں نکلے۔ پلاؤ بیچنے‌والے کی دکان میں منجھلے بھائی کا وہی حال تھا جو سالن بیچنے‌والے کے ہاں بڑے بھائی کا تھا۔ چھوٹے بھائی نے منجھلے بھائی کو بھی

اچھا سا لباس اور ایک گھوڑا خرید دیا اور تینوں بھائیوں نے ایک ساتھ اپنے وطن کی راہ لی۔

چھوٹا شہزادہ اپنے باپ کے لئے اچھے اچھے تحفے لئے جا رہا تھا۔ بڑے اور منجھلے بھائیوں نے ان تحفوں کو دیکھا تو مارے حسد کے اپنا چین و آرام کھو بیٹھے۔ چھوٹے بھائی نے ان پر جو جو احسان کئے تھے وہ سب انھوں نے بھلا دئے اور دونوں مل کر چھوٹے بھائی کو مار ڈالنے کا منصوبہ بنانے لگے۔ لیکن صندوق میں لیٹی ہوئی لڑکی نے ان کی باتیں سن لیں اور شام کو یہ لوگ رات بسر کرنے کے لئے ایک ندی کے کنارے رکے تو لڑکی نے چھوٹے شہزادے کو اپنے پاس بلاکر اس سے کہا:

"تمھارے بھائی تمھارے خلاف سازش کئے بیٹھے ھیں۔ وہ تم کو مار ڈالنا چاھتے ھیں۔ تم کہیں چھپ جاؤ۔"

رات ھو گئی۔ بڑے اور منجھلے بھائی دونوں سونے لیٹے۔ چھوٹا بھائی تھوڑی دیر تک لیٹا رھا اور جب اس کے دونوں بھائی سو گئے تو وہ چپکے سے اٹھا۔ اس نے اپنی دری پر بہت سی مٹی ڈال کر اسے اپنی چادر سے ڈھک دیا اور خود ایک طرف چھپ گیا۔ صبح کے قریب دونوں بھائی اٹھ کر چھوٹے بھائی کی دری کے پاس آئے اور اس کو اٹھاکر ندی میں پھینک دیا۔ وہ یہ کام کرکے لوٹ رہے تھے کہ اچانک پانی کے چھپ چھپ کرنے کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے مڑکر دیکھا تو چھوٹا بھائی کنارے پر بیٹھا منہ ھاتھ دھو رھا تھا۔ اپنی سازش کو ناکام ھوتے دیکھ‌کر ان کو بڑا دکھ ھوا۔ وہ فوراً اپنے گھوڑوں پر سوار ھوئے اور چھوٹے بھائی کو وھیں چھوڑکر بڑی سرعت سے آگے چلے گئے۔ وہ تھوڑی دور جاکر ریت کے ٹیلے پر رک گئے۔ یہاں انھوں نے ایک جگہ ریت میں ایک تیز سی تلوار کو سیدھا گاڑ دیا اور اس کے پاس بیٹھ‌کر خود کو کمر تک ریت سے ڈھک لیا۔ چھوٹا بھائی وھاں پہنچا تو اس نے اپنے بھائیوں کو اس حالت میں دیکھ‌کر ان سے پوچھا:

"آپ لوگوں نے اپنے آپ کو ریت میں کیوں گاڑ لیا ھے؟"

"تاکہ کمر اور ٹانگیں درد سے بچی رھیں" بڑے بھائی نے جواب دیا۔ "آؤ تم کو ریت میں گاڑ دیں۔ تمھاری ٹانگیں بھی ھمیشہ ٹھیک رھیں گی۔"

چھوٹا شہزادہ گھوڑے سے اترا۔ بڑے بھائیوں نے اس کو بھی کمر تک ریت میں گاڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں تپتی ریت سے اس کی ٹانگیں جلنے لگیں اور اس نے تڑپ کر کہا:

"ہائے میری ٹانگیں جل گئیں۔"

بڑے بھائیوں نے مشورہ دیا:

"تم ذرا اپنی ٹانگیں ہلاؤ۔ ریت ٹھنڈی ہو جائےگی۔"

چھوٹے شہزادے نے اپنی ٹانگیں ہلائیں تو گڑی ہوئی تلوار سے اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں۔ بڑے بھائیوں نے اس کی دونوں آنکھیں نکال لیں اور اس کو وہیں چھوڑکر اور لڑکی، پرندے اور گھوڑے کو لےکر چلے گئے۔

چلتے چلتے بڑے اور منجھلے شہزادے دونوں اپنے شہر پہنچ گئے اور جو کچھ لائے تھے وہ سب اپنے باپ کو دے دیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس نے لڑکی کو اپنے بڑے بیٹے کی دلہن قرار دیا اور حرم میں اس کے رہنے کا انتظام کر دیا۔ چالیس کنیزیں اس کی خدمت اور حفاظت کرنے لگیں۔ گھوڑے قارا قلدرغاچ کو بادشاہ نے اپنے اصطبل میں بندھوا دیا اور بلبل خوش‌نوا کے پنجرے کو ہیرے جواہرات کے درخت سے لٹکوا دیا۔

بلبل خوش‌نوا اپنا سر پروں میں چھپائے خاموش بیٹھی رہی۔ چہچہانے کا نام تک نہیں لیا۔ گھوڑا کسی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔ کوئی سامنے سے آتا تو اس کو کاٹتا اور کوئی پیچھے سے آتا تو اس کو دولتیاں مارتا تھا۔ لڑکی چالیس کنیزوں سے گھری ہوئی دن رات برابر اپنے صندوق میں لیٹی رہتی تھی۔ سر تک نہیں اٹھاتی تھی۔

اب ان کو یہیں چھوڑکر آئیے، ذرا چھوٹے شہزادے کا حال سنئے۔

تین دن اور تین راتیں گزرنے پر چھوٹا شہزادہ ہوش میں آیا۔ اسے پری کا دیا ہوا بال یاد آیا اور اس نے اس بال کو جلایا۔ پلک جھپکتے میں پری اپنی کنیزوں کے ساتھ اپنے تخت پر آ موجود ہوئی۔ آتے ہی اس نے شہزادے سے پوچھا:

"اے آدمی‌زاد! تمہیں کس نے نقصان پہنچایا ہے؟"

چھوٹے شہزادے نے سارا حال اس کو سنا دیا۔ تب پری نے اس کو اپنے تخت پر لٹوایا اور اپنی کنیزوں کو حکم دیا کہ اس کو میرے باپ کے پاس کوہ قاف لے جاؤ۔

اس نے اپنی کنیزوں کو اپنے باپ کے نام ایک خط بھی دیا جس میں اس نے لکھا:

"والد محترم! میری آپ سے یہ گزارش ہے کہ آپ اس آدمی‌زاد کو زندگی کے سمندر میں نہلاکر ہمارے روایتی طریقوں سے اس کا علاج کروائیں اور چالیس دنوں کے بعد جب یہ ٹھیک ہو جائے تو واپس میرے پاس بھجوا دیں۔ یہ میرے لئے ایک سگے بھائی کی طرح عزیز ہے۔"

پریوں نے چھوٹے شہزادے کو دنیا کے اس سرے پر واقع کوہ قاف میں اپنی ملکه کے باپ کے پاس پہنچا دیا— چالیس دنوں کے اندر اندر شہزاده بالکل تندرست اور پہلے سے بھی زیاده خوبصورت بن گیا— پریاں اس کو تخت پر بٹھاکر پھر واپس ملکه کے پاس لے آئیں— پریوں کی ملکه نے شہزادے سے کہا:

"میں تم کو اس حالت میں اپنے باپ کے پاس نہیں جانے دوں‌گی— تمھارا حلیه کسی اجنبی فقیر جیسا ہو جائے— تب میں خود تم کو پہنچا دوں‌گی— وهاں پہنچنے پر اگر معلوم ہوا که تمھارے باپ نے لڑکی کی شادی تمھارے بڑے بھائی سے کر دی هے اور اس کو اپنی جگه تخت شاهی پر بٹھا دیا هے تو هم شہر میں داخل هی نہیں ہوں‌گے، باهر هی باهر سے چلے آئیں‌گے— اور اگر یه سب ابھی نہیں ہو پایا هے تو میں اس لڑکی سے تمھاری شادی کر دوں‌گی—"

تین مہینے تک پری نے چھوٹے شہزادے کو اپنے هاں روکے رکھا— اس مدت میں شہزادے کے سر کے بال اتنے لمبے ہو گئے که اس کی پیشانی کو ڈھانپ لیا— اس کے ناخن بھی بہت بڑھ گئے— تب پری نے چھوٹے شہزادے کو پھر اپنے تخت پر بٹھایا اور دونوں اس کے وطن کی طرف اڑ چلے—

پری نے تخت کو شہر کے باهر چھوڑ دیا اور چھوٹے شہزادے کا هاتھ پکڑکے محل کو لے چلی— جب وه محل میں آئے تو بادشاه اپنے تخت پر بیٹھا ہوا اپنے وزیر سے گفتگو کر رہا تھا— وه بہت اداس ہوکر کہه رہا تھا:

"کتنے هی مہینوں سے میں فکر اور پریشانیوں کے دلدل میں پھنسا ہوا ہوں— پرنده جب سے آیا هے کبھی ایک بار بھی نہیں بولا— آج تک گھوڑا ایک بار بھی نہیں هنهنایا اور لڑکی هے که کچھ کھانے پینے تک کا نام نہیں لیتی—"

یه کہتے کہتے اچانک اس نے دیکھا که نوجوان بھکاری صحن میں کھڑا هے— اس نے نوجوان کو پکارا:

"اے، ادهر آؤ—"

چھوٹے شہزادے نے نظریں اٹھائیں تو دیکھا که اس کے دونوں بھائی باپ کے دائیں بائیں بیٹھے هیں— اس نے تخت کی طرف جیسے هی پہلا قدم بڑھایا، بلبل خوش‌نوا اس طرح چہچہا اٹھی که سننےوالوں کے دل موم کی طرح پگھل گئے— شہزادے نے ایک قدم اور اٹھایا تو گھوڑا قارا قلدرغاچ اصطبل میں زور سے هنهنانے لگا— شہزادے نے تیسرا قدم اٹھایا هی تھا که لڑکی صندوق سے باهر آ گئی اور اپنے

ہاتھوں میں زریں ساز لےکر چالیس کنیزوں کے درمیان گانا بجانا اور ناچنا شروع کر دیا۔

بادشاہ کھل اٹھا اور اس نے چھوٹے شہزادے سے کہا:

"اے اجنبی فقیر! تم ہمارے لئے بڑی خوشی لےکر آئے ہو" یہ کہتے ہوئے اس نے طشتری بھر اشرفیاں چھوٹے شہزادے کے اوپر اچھال دیں۔

تب شہزادے نے کہا:

"میں کوئی اجنبی فقیر نہیں ہوں۔ آپ ذرا بلبل خوش‌نوا سے پوچھئے۔ وہ ساری باتیں آپ کو بتا دےگی۔"

"ارے کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ چڑیاں بولیں" بادشاہ نے تعجب سے پوچھا۔

اتنے میں اچانک بلبل خوش‌نوا انسانوں کی طرح بول پڑی اور اس نے بادشاہ کو سارا قصہ شروع سے آخر تک سنا دیا۔

یہ قصہ سارے شہر میں پھیل گیا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ شہر کو تباہی سے کس نے بچایا ہے شہر کے تمام باشندے چھوٹے شہزادے کی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بادشاہ نے جب دیکھا کہ اس کی حکومت کا خاتمہ ہو رہا ہے تو وہ اپنے دونوں بڑے بیٹوں کے ساتھ شہر سے بھاگ کھڑا ہوا۔

بڑی دھوم دھام کے ساتھ صندوق والی حسین شہزادی سے چھوٹے شہزادے کی شادی ہوئی۔ چالیس دنوں تک سارے شہر میں خوشیاں منائی گئیں اور شادی کی دعوتیں کھائی گئیں۔ جب یہ سب ہو چکا تو پری اپنے ملک واپس چلی گئی۔ جاتے وقت اس نے اپنے سر کا ایک بال توڑکر چھوٹے شہزادے کو دیا اور کہا:

"جب کبھی تمہیں مجھے دیکھنے کی خواہش ہو اس بال کو جلا دو۔ بس میں فوراً حاضر ہو جاؤں‌گی۔"

اس طرح عوام بادشاہ کے جبر و ظلم سے چھٹکارا پا گئے اور چھوٹے شہزادے کی آرزوئیں پوری ہوئیں۔

شہزادے کی شادی میں ہم بھی شریک تھے۔ ہم نےخوب پلاؤ کھایا۔ پلاؤ کا روغن مونچھوں سے ٹپکا لیکن منہ میں نہ آیا۔

# ایک نوجوان کے لئے ستر ہنر بھی کم

قدیم زمانے کی بات ہے، کسی جگه ایک آدمی رهتا تھا۔ اس کے پاس تین سو اشرفیاں تھیں۔ ایک دن اس آدمی نے اکلوتے بیٹے کو جس کا نام علی‌جان تھا، اپنے پاس بلاکر اس سے کہا: "بیٹے! تم جوان هو گئے هو اور میں بوڑھا هو چکا هوں۔ میں چاهتا هوں که مرنے سے پہلے تم کو تجارت کا کام سکھا دوں۔ تم کل هی تاجروں کے ایک قافلے کے ساتھ چلے جاؤ۔ میں تمہیں سو اشرفیاں دیتا هوں۔ کسی دوسرے شہر میں پہنچنا تو اس رقم کو ایسی ویسی باتوں میں مت اڑانا۔ اس سے اچھی اچھی چیزیں خرید لینا تاکه ان کو یہاں لاکر اچھے داموں بیچ سکو۔"

علی‌جان کی عمر ابھی اٹھارہ سال کی هوئی تھی۔ وہ بڑا نیک، هوشیار اور سمجھدار لڑکا تھا۔ تجارت کا اس کو کوئی شوق نہیں تھا۔ اس کی آرزو تھی که کوئی ایسا هنر سیکھ لے جس سے وہ اپنی قوت بازو کے بل بوتے پر زندگی بسر کر سکے۔

لیکن جب اس کے بوڑھے باپ نے تجارت کا کام اپنانے کو کہا تو اس سے بحث کرنے کی اسے همت نه هوئی۔ چنانچه اس نے اشرفیاں لے لیں اور اگلے هی دن تاجروں کے ایک قافلے کے ساتھ سفر پر روانه هو گیا۔

کئی دنوں کے بعد تاجروں کا یه قافله ایک شہر میں پہنچا اور ایک کارواں سرائے میں ٹھہرا۔ اس شہر میں ایک بڑا سا پارک تھا۔ اسی رات علی‌جان اس پارک کی سیر کرنے گیا اور وهاں پہنچا تو کیا دیکھتا هے که هزاروں قمقمے جگمگا رهے هیں۔ سارا پارک دن کی طرح بقعه نور بنا هوا هے۔ ایک طرف درختوں کے بیچ ایک عمارت هے جو چاروں طرف سے کھلی هوئی هے۔ اس کا فرش مرمر کا هے اور کئی اونچے اونچے اور موٹے موٹے ستون چھت کو سہارا دئے هوئے هیں۔ چھت میں مختلف رنگوں سے بہت هی دلآویز نقش و نگار بنے هوئے هیں۔ فرش پر قالین بچھا هے اور اس پر جگه جگه

سونے، چاندی، لعل و گوہر کی بنی ہوئی چھوٹی اور نیچی نیچی سی میزیں رکھی ہیں جن پر جواہرات کی بنی ہوئی مختلف شکل کی چھوٹی چھوٹی چیزیں چنی ہوئی ہیں— ایک سے کپڑے پہنے ہوئے کوئی سو سے زیادہ نوجوان دو دو کی ٹولیوں میں بٹے میزوں کے گرد بیٹھے ہیں اور ان چنی ہوئی چیزوں کو ادھر ادھر سرکا رہے ہیں— لوہے کی سلاخوں کے بنے ہوئے ایک جنگلے کے ذریعے یہ جگہ باقی پارک سے الگ کر دی گئی ہے—

علی‌جان جنگلے کے پاس کھڑے ہوکر بڑی حیرت سے یہ تماشا دیکھنے لگا— کئی گھنٹے گزر گئے لیکن علی‌جان بت بنا کھڑا وہ عجیب و غریب تماشا دیکھتا رہا— بالآخر پارک کی دیکھ بھال کرنےوالے ایک آدمی نے اس کو دیکھ لیا اور اس کے پاس آکر پوچھا:

"صاحبزادے! آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟ آخر کس بات پر متحیر ہو رہے ہیں؟"

"یہ لوگ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟" علی‌جان نے جوش سے پوچھا—

"یہ نوجوان لوگ پورے ایک مہینے سے شطرنج‌بازی کا فن سیکھ رہے ہیں" اس آدمی نے بتایا—

"کیا میں بھی اس درس‌گاہ میں داخل ہو سکتا ہوں؟ اس کا طریقہ کیا ہے؟" علی‌جان نے پوچھا—

اس آدمی نے جواب دیا:

"سو اشرفیاں دینی پڑیں‌گی اور بس—"

اس کے پاس جو سو اشرفیاں تھیں ان کو دےکر علی‌جان شطرنج‌بازی کے اسکول میں داخل ہو گیا— تھوڑے ہی دنوں میں وہ شطرنج کھیلنے میں اتنا ماہر ہو گیا کہ خود استادوں سے بھی سبقت لے جانے لگا— ایک سال کے بعد شطرنج‌بازی کی تعلیم مکمل ہو گئی اور نوجوان اسکول چھوڑکر اپنے اپنے گھر روانہ ہونے لگے— علی‌جان اداس ہوکر سوچنے لگا کہ اب میں بغیر پیسوں کے کہاں جاؤں‌گا— استاد کو اس پر رحم آ گیا اور اس نے ایک اشرفی دےکر اس کو ایک قافلے کے ساتھ کر دیا—

علی‌جان خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا جس پر اس کے باپ کو بڑا دکھ ہوا—

اس کے بعد ایک سال گزرا— ایک دن باپ نے علی‌جان کو پھر اپنے پاس بلایا— اس نے بیٹے کو بہت سی نصیحتیں کیں اور سو اشرفیاں دےکر اس کو سوداگروں کے ایک قافلے کے ساتھ بھیج دیا—

سوداگروں کا یہ قافلہ پھر اسی شہر میں آیا۔ علی‌جان نے دل میں یہ طے کر لیا کہ اب اشرفیاں بےکار کی باتوں میں خرچ نہیں کروں گا۔

اسی روز شام کو وہ شہر کی سیر کرنے نکلا۔ گھومتے پھرتے وہ اسی پارک تک پہنچا۔ پارک کے اندر سے کوئی پیارا سا نغمہ سنائی دے رہا تھا۔ اندر جانے پر علی‌جان نے دیکھا کہ اس جگہ جہاں اس نے ایک سال پہلے شطرنج‌بازی کا فن سیکھا تھا بہت سے نوجوان بیٹھے مختلف باجے بجانا سیکھ رہے ہیں۔ اس نے اسی دم اپنے باپ کی ساری نصیحتیں بھلا دیں۔ سو کی سو اشرفیاں جیب سے نکال‌کر اسکول چلانےوالے کے حوالے کر دیں اور ساز بجانے کے سبق لینے لگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے اتنی مہارت حاصل کر لی کہ اپنے استادوں سے بھی آگے نکل گیا۔

ایک سال کے بعد جب تعلیم ختم ہوئی اور اسکول بند ہو گیا تو علی‌جان اداس ہوکر سوچنے لگا کہ اب گھر اباجان کے پاس کیا منھ لےکر جاؤں گا اور پیسوں کے بغیر پہنچ بھی کیسے پاؤں گا۔ لیکن اس پر رحم کھاکے استاد نے اس کو دو اشرفیاں دے دیں اور اسے بیوپاریوں کے ایک قافلے کے ساتھ کر دیا۔

علی‌جان واپس گھر آ گیا۔ اس کے لوٹ آنے پر اس کا باپ خوش تو ہوا لیکن بیٹے کو پھر خالی ہاتھ دیکھ‌کر بوڑھے کو بہت غصہ آیا اور اس نے بیٹے کو خوب برا بھلا کہا۔"

ایک سال اور گزرا۔ بوڑھے نے اپنی رہی سہی سو اشرفیاں بیٹے کو دےکر اس سے کہا:

"دیکھو، اگر تم نے ان سو اشرفیوں کو بھی ادھر ادھر کی باتوں میں اڑا دیا تو ہم بالکل کنگال ہوکے رہ جائیں گے۔ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو ترسیں گے۔ بےگھر ہوکر سڑکوں کی خاک چھانتے پھریں گے۔"

علی‌جان نے قسم کھاکر کہا:

"اب میں فضول خرچی نہیں کروں گا۔ ساری رقم سے اچھا سا مال خریدکر لاؤں گا۔"

بوڑھے کو کچھ اطمینان ہوا اور اس نے علی‌جان کو ایک قافلے کے ساتھ رخصت کر دیا۔

علی‌جان پھر اسی بڑے شہر میں پہنچا۔ وہاں وہ سب سے پہلے حمام میں گیا تاکہ راستے کا سارا گرد و غبار اپنے بدن سے دھو ڈالے۔

حمام سے لوٹتے ہوئے جب جانے پہچانے باغ کے پاس سے گزرنے لگا تو اس نے سوچا کہ چلو، ایک نظر باغ کو دیکھ لوں— بس پھر کیا تھا، اس نے اپنے آپ کو باغ کے بیچوں بیچ کھڑا پایا— دیکھتا کیا ہے کہ اسی مرمر کے چبوترے پر جہاں اس نے شطرنج کھیلنا اور ساز بجانا سیکھا تھا، بہت سے جوان لڑکے بیٹھے لکھنے پڑھنے کا سبق لے رہے ہیں— اس نے سوچا: "شطرنج کھیلنا اور باجے بجانا تو میں سیکھ گیا لیکن مجھے لکھنا پڑھنا نہیں آتا— چاہے کنگال ہی کیوں نہ ہو جاؤں میں لکھنا پڑھنا ضرور سیکھ لوں گا—"

یہ سوچ کر اس نے اپنی سو اشرفیاں نکال کر دے دیں اور بیٹھ کر لکھنا پڑھنا سیکھنے لگا—

پہلے کی طرح اس دفعہ بھی وہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں تعلیم مکمل کر لی— لیکن ایک بار پھر وہی سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ پیسوں کے بغیر اب کیا کیا جائے— استاد نے رحم کھاکے اس کو اپنے پاس سے تین اشرفیاں دیں اور اسے ایک قافلے کے ساتھ گھر بھیج دیا—

لیکن علی‌جان کو اب خالی ہاتھ گھر لوٹنے کی ہمت نہ ہوئی— ایک سوداگر دور کے کسی شہر کو جا رہا تھا اور اپنا سارا سامان اونٹوں پر لدوا چکا تھا— علی‌جان نے اسی سوداگر کے ہاں نوکری کر لی— منھ اندھیرے قافلہ چل پڑا— راہی دن رات برابر چلتے رہے لیکن کہیں پانی دکھائی نہ دیا— چلتے چلتے بالآخر وہ ایک کنویں تک پہنچے— کنواں بہت گہرا تھا اور اس میں بہت تھوڑا سا پانی تھا— اپنے مالک کے کہنے پر علی‌جان کسی طرح کنویں میں اتر گیا— اس نے مشک میں پانی بھر لیا اور اوپر چڑھنے کو سوچ ہی رہا تھا کہ دفعتاً کنویں کی دیوار میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے دروازے پر اس کی نظر پڑی— اس نے مشک وہیں رکھ دی اور دروازے کو ذرا سا کھول کر اندر جھانکا—دیکھتا کیا ہے کہ ایک بڑا سا روشنی سے بھرا ہوا کمرہ ہے— فرش پر قالین بچھا ہے جس پر ایک بوڑھا آدمی اپنا سر جھکائے بہت اداس بیٹھا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک وائلن ہے— یہ منظر دیکھ کر علی‌جان ذرا بھی نہ گھبرایا— وہ آہستہ سے بوڑھے کے پاس گیا اور بوڑھے کے ہاتھ سے وائلن لے کر اس کو بجانے لگا— تاروں کی پیاری آواز سن کر بوڑھے نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اطمینان کی گہری سانس لی— اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور علی‌جان کو دیکھا تو گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے پوچھا:

"اے آدمی‌زاد! تم یہاں کیسے آ گئے؟"

علی‌جان نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ پھر اس کو قافلہ یاد آ گیا اور وہ چلنے لگا۔

بوڑھے نے اس کو روک کر کہا:

"تمہاری سب سے بڑی آرزو کیا ہے؟ میں تمہاری خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

علی‌جان بوڑھے کی طرف بڑے تعجب سے دیکھنے لگا۔

"میرا اکلوتا بیٹا مر گیا ہے" بوڑھے نے بتایا۔ "پانچ دن ہوئے وہ مجھے اکیلا چھوڑکر اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔ میں غم کی شدت سے خود بھی مرنے کو تیار ہو گیا۔ کسی طرح اپنا غم غلط کرنے کے لئے میں نے وائلن اٹھا لیا۔ لیکن اس کو بجانا مجھے نہیں آتا۔ اگر تم کچھ تاخیر سے آتے تو میری جان نکل چکی ہوتی۔ تمہارے جادو بھرے نغمے نے میری جان بچا لی۔ تم چاہو تو میری ساری دولت لے سکتے ہو۔"

"بس اوپر چڑھنے میں میری مدد کیجئے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے" علی‌جان نے کہا۔

اس نے پھر ایک بار وائلن بجایا۔اس کے بعد بوڑھے جادوگر نے سونے سے بھرا ایک تھیلا علی‌جان کو دےکر اس سے کہا:

"اپنی آنکھیں بند کرو۔"

علی‌جان نے آنکھیں موند لیں اور ایک لمحے کے بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ اوپر زمین پر کھڑا ہے اور قافلہ غائب ہے۔ وہ قدموں کے نشانات دیکھتا ہوا چل پڑا اور قافلے تک پہنچ گیا۔ سب بڑے حیران ہوئے اور پوچھنے لگے کہ تم اوپر کیسے چڑھ آئے؟ علی‌جان نے سارا حال بتا دیا اور جادوگر کا دیا ہوا سونے سے بھرا تھیلا ان کو دکھایا۔

قافلہ آرام کرنے کے لئے ایک جگہ رکا تو قافلے کے مالک نے کاغذ قلم نکال‌کر ایک رقعہ لکھا۔ اس کو ایک لفافے میں بند کرکے اپنی مہر لگائی اور لفافہ علی‌جان کو دیتے ہوئے اس سے کہا:

"میرے ایک بیٹی ہے جو بہت ہی خوبصورت ہے۔ میں اس کی تم سے شادی کر دوں‌گا۔ تم جلدی سے میرے گھر چلے جاؤ اور میرے پہنچنے تک شادی کی تیاریاں مکمل کر لو۔ ہاں دیکھو، اپنی رقم سنبھال‌کے رکھنا۔ میں تین دن کے اندر اندر گھر پہنچ جاؤں‌گا۔"

اس نے علی‌جان کو ایک اچھا سا گھوڑا دے دیا اور راستہ بتا دیا۔ علی‌جان گھوڑے پر سوار ہوکر چلا گیا۔

علی‌جان بہت دیر تک رکے بغیر چلتا رہا پھر ایک جگہ رک‌کر آرام کرنے لگا۔ بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا کہ میں نے سو اشرفیاں دے کر لکھنا پڑھنا سیکھا ہے۔ لاؤ، ذرا پڑھ‌کر دیکھوں کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ یہ سوچ‌کر اس نے خط کو نکالا اور اسے کھول‌کر پڑھنے لگا۔ اس کو پڑھا تو گھبرا گیا۔ خط میں لکھا تھا:

"میری اچھی بیگم! میں سونے سے بھرا ایک تھیلا تمہیں بھیج رہا ہوں۔ وہ اس نوکر کے پاس ہے۔ دھوکا دینے کے لئے میں نے اس سے کہا ہے کہ تم سے اپنی بیٹی کی شادی کر دوں‌گا۔ تم اس کا سر فوراً کٹوا دینا۔ سلام کے ساتھ تمہارا خاوند۔"

علی‌جان نے یہ خط پھاڑکر پھینک دیا اور اس کے بدلے ایک دوسرا خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

"میری اچھی بیگم! اس عزیز مہمان کا خوب اچھی طرح استقبال کرنا اور اس کے ساتھ ہماری بیٹی کی شادی کر دینا۔ میرے آنے کا انتظار کئے بغیر شادی فوراً کر ڈالنا۔ سلام کے ساتھ تمہارا خاوند۔"

علی‌جان نے اس خط کو لفافے میں بند کرکے جیب میں ڈال لیا اور آگے چل پڑا۔

وہ اس شہر پہنچا، اس تاجر کا گھر ڈھونڈ لیا اور جاکر خط کو اس کی بیوی کے حوالے کر دیا۔ خط پڑھ‌کر تاجر کی بیوی نے آنے‌والے مہمان کا خوب گرم‌جوشی سے استقبال کیا اور اس کی دل کھول‌کر خاطرداری کی۔ اگلے ہی دن تاجر کی بیوی نے بڑی دھوم دھام سے علی‌جان کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔

تیسرے دن صبح ہوتے ہی علی‌جان اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر رخصت ہو گیا۔ جاتے وقت اس نے نوکروں کو ہدایت دی:

"میں تجارت کے سلسلے میں باہر جا رہا ہوں۔ رات کے وقت کسی کے لئے بھی دروازہ مت کھولنا۔ اگر کوئی دیوار پھاندکر اندر آ جائے تو اس کو پکڑ لینا اور مار مارکر اس کا کچومر نکال دینا۔ تمہارے مالک کا یہی حکم ہے۔"

رات کو تاجر اپنے قافلے کے ساتھ اپنے گھر آ پہنچا اور دروازے پر دستک دینے لگا۔ بڑی دیر تک وہ دروازہ کھٹکھٹاتا رہا لیکن دروازہ نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ تب تاجر مجبوراً دیوار پھاندکر صحن میں آ گیا۔ ادھر نوکر اسی تاک میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے فوراً اس کو پکڑ لیا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کی پٹائی کر دی۔ تاجر بہت

دیر تک بےہوش پڑا رہا۔ ہوش آیا تو وہ کسی طرح اپنے کمرے تک پہنچا، بیوی کو سلام علیک کیا اور اس سے پوچھا:

"کوئی میرا خط لےکر آیا تھا؟ اس کا تم نے کیا کیا؟"

"میں آپ کا حکم بجا لائی" بیوی نے جواب دیا۔

"اور اشرفیاں لے لیں؟ کہاں ہیں وہ؟" تاجر نے دریافت کیا۔

"کون سی اشرفیاں؟ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" بیوی نے متحیر ہوکر پوچھا۔

"آخر میں نے خط میں لکھ دیا تھا نا کہ خط لانے والے کو مار ڈالنا اور اشرفیوں کو لےکر چھپا دینا" تاجر نے کہا۔

"ارے آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ کے ہوش و حواس ٹھکانے تو ہیں؟ بھلا کہیں کوئی اپنے داماد کو بھی مار ڈالتا ہے؟" بیوی نے پوچھا۔

"داماد؟ کون سا داماد؟" تاجر نے گھبراکر کہا۔

"جی ہاں، آپ کی بیٹی کا خاوند" بیوی نے جواب دیا۔

"میری بیٹی کا خاوند؟ یہ تم نے اس کی شادی کب کر دی؟" تاجر نے استفسار کیا۔

"دو دن ہو چکے ہیں" بیوی نے کہا۔

تاجر نے اپنا ماتھا پیٹ لیا اور اپنی بیوی اور نوکروں کو ڈانٹنے اور انہیں گالیاں دینے لگا۔ پھر اس نے اپنے داماد کے متعلق پوچھا:

"اور وہ خود کہاں ہے؟"

"وہ تو صبح ہی صبح گھوڑے پر سوار ہوکر کہیں باہر چلے گئے" نوکروں نے بتایا۔ "اور ہم سے کہہ گئے کہ کسی کے لئے بھی دروازہ مت کھولنا اور کوئی دیوار پھاندکر اندر آ جائے تو مار مارکر کچومر نکال دینا۔"

تاجر سمجھ گیا کہ اس کو اپنے کئے کی سزا مل گئی ہے اور اس نے اپنے داماد سے صلح کر لینے کا فیصلہ کیا۔

اب تاجر اور اس کی بیوی کو یہیں چھوڑ کر ذرا علی‌جان کا حال سنئے۔

علی‌جان چلتے چلتے ایک بڑے شہر میں پہنچا۔ بازار کا دن تھا اور بازار میں ڈھنڈورچی یہ اعلان کر رہا تھا:

"اے لوگو! سن لو۔ پھر نہ کہنا کہ نہیں سنا۔ جو کوئی شطرنج اچھا کھیل لیتا ہو شاہی محل میں پہنچ جائے۔ جو شخص بادشاہ کے ساتھ تین بازیاں کھیل کر

تینوں جیت لےگا اس کو بادشاہ اپنے تخت پر بٹھائے گا اور جو تینوں بازیاں ہار جائے گا بادشاہ اس کا سر کٹوا دے گا—"

علی‌جان دربار میں پہنچا اور کہا کہ میں بادشاہ سلامت کے ساتھ شطرنج کھیلنا چاھتا ہوں—

کھیل شروع ہوا— علی‌جان ایک بازی ہار گیا اور دو بازیاں جیت لیں— دونوں پھر کھیلنے لگے— اس دفعہ بادشاہ دو بار جیتا اور ایک بار ہار گیا— پھر تیسری دفعہ کھیلنے لگے— علی‌جان نے تینوں بازیاں جیت لیں—

بادشاہ نے اپنا تخت علی‌جان کے لئے خالی کر دیا اور جھک‌کر اس سے کہا:

"لو، اب تم بادشاہ بن گئے— تخت پر بیٹھ جاؤ—"

"نہیں— بادشاہ بننے کی مجھے کوئی خواہش نہیں ھے" علی‌جان نے کہا— "میں تو اپنے شہر جاکر لوگوں کو لکھنا پڑھنا اور باجے بجانا سکھانا چاھتا ہوں—"

علی‌جان وھاں سے چل‌کر پہلے اس شہر گیا جہاں اس تاجر کا گھر تھا— وھاں سے اس نے اپنی بیوی کو ساتھ لیا اور اپنے شہر کے لئے روانہ ہو گیا—

گھر آنے پر جب اس نے اپنی ساری آپ بیتی اپنے باپ کو سنائی تو بوڑھا بہت خوش ہوا اور بیٹے سے کہا:

"تم سچ مچ بڑے ھوشیار ہو— تم نے کتنے ھی ھنر سیکھ لئے اور کتنی ھی بار موت سے بچ نکلے!"

علی‌جان نے خاکساری سے جواب دیا:

"اباجان! ایک جوان آدمی کے لئے ستر ھنر بھی کم ھوتے ھیں—"

# دانشمند گدھا

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک گدھا ایک باغ میں پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک طرف بڑے بڑے درختوں میں چھوٹے چھوٹے سیب لٹکے ہوئے ہیں اور دوسری طرف پاس ہی نیچے کیاریوں میں پتلی پتلی بیلوں میں بڑے بڑے کدو لگے ہوئے ہیں۔ گدھے نے بار بار سیبوں اور کدوؤں کی طرف دیکھا، بڑی حیرت سے اپنے کان ہلائے اور اپنے آپ سے کہا:

"کتنا بے ڈھنگا ہے سب کچھ اس دنیا میں!"

درخت پر ایک ننھی سی چڑیا بیٹھی تھی۔ اس نے گدھے کی یہ بات سنی تو اس سے پوچھا:

"جناب! بتائیے تو سہی، اس دنیا کے نظام میں آپ کو کون سی خامی نظر آ رہی ہے؟"

"کیا خود تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟" گدھے نے حقارت سے کہا۔ "لو دیکھو اس اونچے موٹے درخت سے کسی ننھے منے بچے کی مٹھیوں کے جتنے چھوٹے چھوٹے سیب لٹک رہے ہیں اور ان دبلی پتلی بیلوں میں میرے سر جتنے بڑے بڑے کدو لگے ہوئے ہیں۔"

"یہی تو اس نظام کی خوبی ہے!" چڑیا نے اعتراض کیا۔

"یہ بھی خوبی ہے؟" گدھے نے جوش میں آکر کہا۔ اگر سیب کدو جتنے بڑے اور کدو سیب جتنے چھوٹے ہوتے تو دوسری بات تھی۔ تب ہم خوبی کی بات کر سکتے تھے۔"

اتنے میں گدھے کی پیٹھ میں خارش ہونے لگی اور وہ اپنی پیٹھ درخت سے رگڑنے لگا۔ درخت کے ہلنے سے ایک سیب ٹوٹ کر گدھے کے سر پر گر پڑا تو گدھا "ہائے! میرا سر!" کہتے ہوئے درد سے بلبلا اٹھا۔

چڑیا ہنس پڑی اور بولی:

"اب کہئے جناب، کیسا لگا؟ وہ تو کہئے غنیمت ہے کہ سیب کدو جتنا بڑا نہیں تھا۔ نہیں تو آپ کا سر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔"

گدھا "ہوں" کرکے سیب کے درخت سے پرے ہٹ گیا۔

# عقلمند لڑکی

پرانے زمانے کی بات ہے، کہیں ایک بوڑھا آدمی رہتا تھا۔ اس کے ایک بیٹی تھی جس کی عمر کوئی بارہ سال کی تھی۔ بوڑھے کے پاس لے دے کے بس ایک اونٹ، ایک گھوڑا اور ایک گدھا تھا۔

وہ روز پہاڑی جنگل میں جاکر لکڑیاں جمع کرکے لاتا اور انھیں بازار میں بیچتا تھا اور اس کی بیٹی گھر کا کام کاج دیکھتی تھی۔

ایک دن بوڑھا پہاڑ پر سے لکڑیاں اکٹھا کرکے انھیں اونٹ پر لادے ہوئے بیچنے کے لئے بازار لے گیا۔ ایک موٹے سے امیر آدمی نے آکر پوچھا:

"ان لکڑیوں کا کتنا مانگتے ہو؟"

بوڑھے نے کہا: "تین تنگے*"۔

امیر آدمی نے کہا:

"میں دس تنگے دیتا ہوں، لکڑیاں جیسی ہیں ویسی ہی میرے گھر پہنچا دینا۔ منظور ہے؟"

بوڑھا خوشی سے راضی ہو گیا۔ وہ اپنے اونٹ کو ہانکتا ہوا امیر کے گھر لے آیا۔ لکڑیاں اس نے آنگن میں اتار دیں اور اپنے دس تنگے وصول کرکے جانے کو ہوا تو امیر کہہ اٹھا:

"اونٹ کو کھونٹے سے باندھ دو۔"

"اونٹ تو میرا ہے" بوڑھے نے حیران ہوکر کہا۔

"تمہارا کیسے ہے؟" امیر نے کہا۔ "جیسی تھیں ویسی ہی خریدی ہیں۔ مطلب ہے اونٹ کے ساتھ۔ ورنہ میں تم گدھے کو دس تنگے کیوں دیتا؟"

وہ دونوں دیر تک بحث کرتے رہے اور پھر قاضی کے پاس گئے۔

---

* تنگا ۔ اشرفی ۔ اڈیٹر۔

قاضی نے بوڑھے سے پوچھا:

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے "ویسی ہی" بیچی ہیں؟"

"جی ہاں، میں نے بیچی تو ویسی ہی ہیں— لیکن قاضی صاحب! میرے اونٹ کی قیمت تو تین سو تنگے ہے—"

"یہ تو بالکل الگ بات ہے" قاضی نے کہا— "میرا اس سے سروکار نہیں— قصور تمہارا ہی ہے— آخر تم لکڑیاں ویسی ہی بیچنے پر کیوں راضی ہوئے؟"

چنانچہ قاضی نے فیصلہ دیا کہ اونٹ امیر کو دے دیا جائے— بوڑھا روتا دھوتا اپنے گھر لوٹ آیا— لیکن اس نے اپنی بیٹی سے اس واقعے کا کوئی ذکر نہ کیا—

اگلے دن بوڑھا لکڑیاں گھوڑے پر لادکر پھر بازار لایا— پھر وہی امیر آدمی وہاں آ نکلا—

"لکڑیوں کا کیا دام ہے؟" اس نے بوڑھے سے پوچھا—

"تین تنگے" بوڑھے نے جواب دیا—

امیر نے کہا:

"میں تمہیں دس تنگے دیتا ہوں، لکڑیاں جیسی ہیں ویسی ہی میرے گھر پہنچا دینا— منظور ہے؟"

بوڑھا کل والی بات بالکل بھول گیا تھا، امیر کی شرط پر راضی ہو گیا— نتیجہ پھر وہی نکلا اور بوڑھا اپنے گھوڑے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا— وہ اداس اپنے گھر لوٹ آیا— لیکن اس دفعہ بھی اس نے اپنی بیٹی کو کچھ نہ بتایا—

تیسرے دن بوڑھے نے لکڑیاں گدھے پر لادیں اور بازار چلنے ہی والا تھا کہ اس کی بیٹی نے کہا:

"بابا! کل اور پرسوں تو آپ اونٹ اور گھوڑے کو کہیں کھو آئے— آج شاید یہ گدھا بھی چھن جائے گا— لائیے آج لکڑیاں میں بیچ آؤں—"

بوڑھا راضی ہو گیا— لڑکی گدھے کو ہانکتی ہوئی بازار پہنچی— پھر وہی امیر آیا اور لڑکی سے پوچھا:

"ان لکڑیوں کا کیا مانگتی ہو؟"

"تین تنگے" لڑکی نے جواب دیا—

"یہ جیسی ہیں ویسی کے پانچ تنگے لے لو" امیر نے کہا—

"اور آپ بھی اپنے تنگے ویسے ہی دے دیں گے؟" لڑکی نے پوچھا—

"اچھی بات ہے— مجھے منظور ہے" امیر نے جواب دیا— "اپنی لکڑیاں میرے گھر لے چلو—"

لڑکی اپنے گدھے کو ہانکتی ہوئی امیر کے گھر لے آئی— لکڑیاں صحن میں اتارنے کے بعد اس نے امیر سے پوچھا:

"جناب! آپ کے گدھے کو کہاں باندھ دوں؟"

امیر نے جگہ بتا دی اور لڑکی نے گدھے کو وہیں لے جاکر باندھ دیا— پھر جب امیر لڑکی کو پیسے دینے لگا تو لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

"سودا کرتے وقت آپ نے کہا تھا کہ پانچ تنگے ویسے ہی دے دوں گا— اب دیجئے ویسے ہی مطلب ہے ہاتھ کے ساتھ—"

دونوں دیر تک بحث کرتے رہے— شور سن کر پڑوسی جمع ہو گئے اور وہ ان دونوں کو قاضی کے پاس لے گئے— قاضی نے کتنی ہی چالیں چلیں، خوب حیلے کئے لیکن لڑکی اپنی بات پر اڑی رہی— لوگ شور مچانے لگے، چلا چلاکر کہنے لگے:

"لڑکی ٹھیک کہتی ہے— بڑی ہوشیار ہے لڑکی—"

قاضی دیر تک سوچتا رہا اور بالآخر فیصلہ دیا کہ ہاتھ دے دو— موٹا امیر رو پڑا اور اس نے کہا:

"ہاتھ کے بغیر میرا کام کیسے چلے گا؟"

تب قاضی نے اس سے کہا:

"اپنا ہاتھ دینا نہیں چاہتے تو پچاس تنگے اس کی قیمت ادا کرو—"

امیر نے فوراً پچاس تنگے گن کر لڑکی کو دے دئے— لیکن پھر اس کو اس رقم کا بڑا دکھ ہوا اور اس نے لڑکی سے کہا:

"آؤ، ہم تم دونوں بازی لگائیں— ہم میں سے جو زیادہ جھوٹ بولے گا وہ پچاس اشرفیاں جیتے گا—"

"اچھی بات ہے" لڑکی نے کہا— "آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں— اس لئے آپ ہی شروع کیجئے—"

امیر آدمی آرام سے بیٹھ گیا، کھانس کر اپنا گلا صاف کیا اور کہنا شروع کیا:

"ایک دفعہ میں نے گندم بوئے تھے— فصل اتنی پرواں چڑھی، اتنی اونچی ہو گئی کہ کوئی اونٹ یا گھوڑے پر سوار ہوکر اس کے اندر جاتا تو دس دن تک وہیں بھٹکتا رہتا— ایک دن چالیس بکریاں اس کے اندر گھس گئیں تو سب وہیں گم ہو

گئیں– فصل تیار ہو گئی تو میں نے بہت سارے مزدور بلاکے اس کو کٹوانا شروع کیا– ساری فصل کاٹ لی گئی، گاہی بھی جا چکی لیکن بکریوں کا کوئی پتہ نہ چلا– ایک دن میری بیوی اسی گندم کے آٹے کی تندوری روٹیاں پکانے لگی اور میں بیٹھکر قرآن پڑھنے لگا– جب روٹیاں پک گئیں اور تندور سے نکالی گئیں تو میں ایک روٹی سے ایک ٹکڑا توڑکر کھانے لگا– اچانک میرے منھ کے اندر سے "میں" کی آواز سنائی دی اور وھاں سے ایک بکری نکل آئی– اس کے بعد دوسری بکری نکلی، پھر تیسری– یہ سالی بکریاں اتنی موٹی تازی هو گئی تھیں کہ چار سال کے بیلوں سے ذرا بھی کم نہیں تھیں–"

امیر آدمی اپنا جھوٹا قصہ سنا چکا تو لڑکی تالیاں بجاکر کہنے لگی:

"بہت خوب! آپ نے بالکل سچی باتیں بتائیں– ایسا اکثر ھوتا ھے– لیجئے اب میری بات سنئے– ایک دفعہ میں نے گاؤں کے بیچوں بیچ ایک جگہ کو کھودکر کپاس کا ایک بیج بو دیا تھا– کیا آپ بتا سکتے ھیں کہ کیا ھوا؟ ھوا یہ کہ اس بیج سے ایک بہت ھی بڑا درخت اگ آیا– وہ درخت اتنا بڑا تھا کہ کوئی گھوڑے پر سوار ھوکر دن بھر چلتا رھتا تو بھی اس درخت کا سایہ اس کے سر پر برابر موجود رھتا– جب کپاس تیار ھو گئی تو میں نے پانچ سو تندرست اور توانا عورتوں کو بلاکر اس کو جمع اور صاف کرایا– صاف کی ھوئی روئی کو بیچکر ھاتھ آنےوالی رقم سے میں نے چالیس اونٹ خریدے اور ان پر مختلف قسم کے قیمتی کپڑے لدواکر ان کو اپنے دو بھائیوں کے ساتھ شہر بخارا بھیج دیا– تین سال تک میرے دونوں بھائیوں کی کوئی خبر نہ ملی– لیکن اب کچھ ھی دن ھوئے، معلوم ھوا کہ وہ دونوں مار دئے گئے ھیں– ھائے میرے بدنصیب بھائی! اب اے بھلے لوگو! ذرا ادھر تو دیکھو– یہ موٹا امیر میرے منجھلے بھائی کی مرزائی پہنے ھوئے ھے– یہ وھی مرزائی ھے جس کو پہنے میرا بھائی بخارا گیا تھا– اسی آدمی نے میرے دونوں بھائیوں کو مارکر ان کے اونٹوں اور سارے سامان پر قبضہ کر لیا ھے!"

موٹا امیر تذبذب میں پڑ گیا– اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے– اس نے سوچا کہ اس سارے قصے کو سچ مانے لیتا ھوں تو قتل کرنے اور ڈاکہ ڈالنے کے جرم میں مقدمہ چل جائےگا– اور اگر یہ کہتا ھوں کہ یہ سب سراسر جھوٹ ھے تو پچاس اشرفیاں دینی پڑیں گی– آخرکار اس نے اس رقم کی ادائیگی ھی کو غنیمت سمجھا– اس نے گن‌کر پچاس اشرفیاں لڑکی کو دیں اور کہا:

"میری زندگی میں آج پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ کسی نے چالاکی میں مجھ سے بازی جیت لی ہے-"

لڑکی اپنے اونٹ، گھوڑے اور گدھے کو لےکر خوش خوش اپنے گھر لوٹ گئی-

# طاہر اور زہرہ

سچ ہے یا جھوٹ، یہ تو معلوم نہیں لیکن کہنےوالے کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا جس کے کوئی اولاد نہیں تھی- ایک دن وہ اکیلا اداس بیٹھا تھا تو اس کے بڑے وزیر نے اس کے پاس آکے پوچھا:

"بادشاہ عالم! آخر آپ کس بات پر اتنے اداس ہیں؟ آپ کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے- آپ کے شہر اور دیہات پھل پھول رہے ہیں- ہر چیز آپ کے اختیار میں ہے- پھر آپ کو کس بات کی فکر ہے؟"

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے کہ میں بادشاہ ہوں اور میرے پاس دھن دولت کی کوئی کمی نہیں ہے" بادشاہ نے جواب دیا- "لیکن مجھے یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ میرے کوئی اولاد نہیں ہے- مرنے کے بعد اس دنیا میں میرا نام و نشان باقی نہ رہے گا-"

وزیر نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا:

"میرا بھی تو یہی حال ہے-"

بادشاہ اور وزیر دونوں دیر تک بیٹھے اپنا اپنا رونا روتے رہے- بالآخر انہوں نے قلندر بن‌کر دنیا کی سیر کرنے کا فیصلہ کیا-

دونوں سفر پر نکلے- بہت دنوں تک چلتے رہے- بہت سے راستے طے کئے اور بالآخر ایک دن وہ ایک بہت ہی خوبصورت باغ کے پاس آ نکلے- باغ کے چاروں طرف باڑ بنی ہوئی تھی اور اندر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا- باغ کے اندر رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے- درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں- پھولوں اور ہری

بھری گھاس کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو تر و تازہ کئے دیتی تھی۔ درختوں کے نیچے قالین بچھے ہوئے تھے اور ان پر نرم نرم گدے اور تکیے پڑے تھے۔ باغ ایسا تھا کہ اس کے اندر جانےوالا خود بخود اپنی تمام فکروں اور پریشانیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا اور اپنا سارا دکھ درد بھول جاتا۔

باغ کے گرد گھوم پھر کر دونوں قلندروں نے اندر جانے کا راستہ پا ہی لیا۔ دونوں اندر گئے اور درخت کے نیچے بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک سفیدریش بزرگ سفید کرتا پہنے ہوئے کہیں سے نمودار ہوئے اور مہمانوں کے پاس آکر ان سے پوچھا:

"بیٹو! تم لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

بادشاہ اور وزیر دونوں فوراً کھڑے ہو گئے اور اس بزرگ کو جھک کر سلام کیا۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اپنے خیالات یکجا کئے اور آخر بزرگ کو بتایا کہ ہم دونوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہم بےفرزند ہیں۔ اس لئے ہم نے دنیا کے تمام عیش و آرام کو چھوڑکر درویشی کا راستہ اختیار کیا ہے۔

بزرگ نے ان کی باتیں خاموشی سے سن لیں اور پھر اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال‌کر دو سرخ سرخ سیب نکالے اور ان دونوں کو ایک ایک سیب دیتے ہوئے کہا:

"بیٹو! یہ سیب لے لو اور اپنے اپنے گھر چلے جاؤ۔ گھر جاکر یہ سیب اپنی اپنی بیوی کے ساتھ مل‌کر کھانا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جاؤ، گھر جاکر اپنا کام سنبھالو۔ ہمیشہ انصاف کا دامن پکڑے رہو۔ عقل سے حکومت کرو۔ اپنے ملک کی خبرگیری کرو۔ اپنی رعایا کو دکھ نہ پہنچاؤ۔ ہاں ایک بات اور یاد رکھنا۔ تم میں سے کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہو تو اس کا نام طاهر اور بیٹی پیدا ہو تو اس کا نام زہرہ رکھنا۔ وہ جب تک چھوٹے رہیں ان کو ایک دوسرے سے الگ نہ کرنا اور بڑے ہو جائیں تو ان کی ایک دوسرے سے شادی کر دینا۔"

یہ کہہ‌کر بزرگ وہاں سے چلا گیا۔ بادشاہ اور وزیر نے بڑے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد انہوں نے طے کیا کہ بزرگ نے جیسا کہا ویسا ہی کریں گے۔

دونوں گھر لوٹ آئے اور انہوں نے ویسا ہی کیا جیسا اس بزرگ نے کہا تھا۔ دن گزرتے گئے۔ مہینے گزرتے گئے۔ خوشی سے بادشاہ اور وزیر دونوں کے

پاؤں جیسے زمین کو نہیں چھوتے تھے- آرزوئیں راتوں کو بھی انہیں سونے نہیں دیتی تھیں- وہ ایک ایک لمحہ فرزند کی پیدائش کے انتظار میں بتاتے تھے-

ایک دن بادشاہ اور وزیر دونوں درباریوں کے ساتھ کچھ دن کے لئے شکار کھیلنے چلے گئے- ان کو گئے تین دن ہوئے تھے کہ ان کے گھروں میں خوشی کے نقارے بج اٹھے- بادشاہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اور وزیر کے ہاں لڑکا- دونوں کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے فوراً آدمی دوڑائے گئے- وہ دونوں ساتھ تھے- آنےوالوں نے پہلے بادشاہ کو خوشخبری سنائی:

"بادشاہ عالم! انعام دیجئے- ملکہ کے لڑکی پیدا ہوئی ہے-"

پھر انہوں نے وزیر سے مخاطب ہوکر کہا:

"وزیر اعظم! انعام دیجئے- آپ کی بیگم صاحبہ کے لڑکا پیدا ہوا ہے-"

بادشاہ دن رات بیٹے کا خواب دیکھا کرتا تھا- بیٹی پیدا ہونے کی خبر سن‌کر وہ مارے غصے کے آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے پیغام لانےوالے کی طرف ایک سفید رومال پھینکتے ہوئے حکم دیا:

"ابھی جاکے بچی کو مار ڈالو اور میرا یہ رومال اس کے خون سے رنگ کر لاؤ!"

جہاں تک وزیر کا تعلق تھا وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا- دیوانوں کی طرح اچھلتا کودتا فوراً گھوڑے پر سوار ہوکر اسے سرپٹ دوڑاتا ہوا گھر روانہ ہو گیا- اپنے گھر کے نزدیک پہنچا تو اچانک گھوڑے نے ٹھوکر کھائی- وزیر زین پر سے زمین پر گر پڑا- اس کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور اس نے وہیں دم توڑ دیا-

بیچاری وزیر کی بیوی کے لئے مصیبتوں کے دن شروع ہوئے- وہ کڑھتی اور روتی دھوتی اکیلی بچے کی پرورش کرنے لگی جو اس دنیا میں آتے ہی یتیم ہو گیا تھا اور جس کو اپنے باپ کی صورت دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا- ایک ایک کرکے دن گزرتے گئے، مہینے گزرتے گئے، سال گزرتے گئے- لڑکا کافی بڑا ہو گیا- وہ دوڑ دوڑکر باہر سڑک پر آنے لگا- ایک دن وہ باہر سڑک پر کھیل رہا تھا کہ بادشاہ نے کھڑکی سے اس کو دیکھ لیا-

"یہ کس کا لڑکا ہے؟" اس نے اپنے نئے وزیر سے پوچھا-

نیا وزیر اٹھکر آداب بجا لایا اور کہا:

"بادشاہ عالم! یہ لڑکا آپ کے وزیر مرحوم کا بیٹا طاہر ہے- آپ کی بیٹی زندہ ہوتی تو وہ بھی آج اتنی ہی بڑی ہو گئی ہوتی-"

یہ الفاظ سن کر بادشاہ کا دل تڑپ اٹھا— افسوس اور ندامت سے اس نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا:

"لعنت ہو مجھ ایسے کمبخت پر! مجھ پر کون سا شیطان سوار ہو گیا تھا کہ میں نے اس کو مروا ڈالا—"

وزیر نے بادشاہ سے اس سلسلے میں اور کچھ نہ کہا— لیکن اسی دن زنان‌خانے میں گیا اور کنیزوں میں سے ایک کو بلاکر اس سے پوچھا:

"شہزادی کا کیا حال ہے؟"

"وہ زندہ ہے" کنیز نے جواب دیا— "اب تو خاصی بڑی ہو گئی ہے اور بہت ہی اچھا رنگ روپ پایا ہے— مگر آپ اس سب کا بادشاہ سلامت سے ذکر نہ کیجئے گا—"

لیکن وزیر دوڑا ہوا بادشاہ کے پاس پہنچا اور آتے ہی کہا:

"بادشاہ عالم! اگر آپ مجھ حقیر کی جان بخش دیں تو میں آپ کو ایک خوشخبری سناؤں—"

"ہاں سناؤ" بادشاہ نے ہدایت کی—

"بادشاہ عالم! آپ پریشان نہ ہوں— آپ کی بیٹی زندہ ہے—"

بادشاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا— اس نے فوراً حکم دیا:

"اس کو میرے پاس لے آؤ!"

بچی کو بادشاہ کے پاس لایا گیا— بادشاہ نے اپنی بیٹی کو بہت لاڈ پیار کیا اور حکم دیا کہ خوشیاں منائی جائیں— چالیس دن تک سارے شہر میں خوشیاں منائی گئیں—

ادھر طاہر بھی ہنستا کھیلتا دن بدن بڑا ہو رہا تھا— ایک دن وہ اپنے آنگن میں اپنے جیسے ایک لڑکے کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا— اس نے ایک دفعہ گلی کو ڈنڈے سے اچھالا تو گلی اڑتی ہوئی جاکر اس کی نانی کے لگی جو ایک طرف دھوپ میں بیٹھی چرخا چلا رہی تھی— بڑھیا جھلاکر طاہر کو کوسنے لگی:

"تیری ایسی کی تیسی! نالائق! بےباپ کے بچے! تو مجھے کیوں چھیڑتا ہے؟ جا اپنی منگیتر زہرہ کے پاس چلا جا— جاکے اسی سے چھیڑ چھاڑ کر!"

طاہر دوڑکر بڑھیا کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑکر پوچھنے لگا:

"نانی‌جان! آپ کس زہرہ کی بات کر رہی ہیں؟ آپ نے یہ بات کیوں کہی؟"

"چھوڑ دے میرا ہاتھ! بےباپ کے لڑکے! میں کہتی ہوں، چھوڑ دے ابھی!"

8*

بڑھیا چلاتی رہی- لیکن طاہر نے اس کا ھاتھ نہ چھوڑا اور اس کی منتیں کرنے لگا:

میری اچھی نانی! بتائیے نا، آپ نے یہ بات کیوں کہی؟"

آخرکار بڑھیا نے تنگ آکر کہا:

"جا، اپنی ماں سے پوچھ!"

طاہر بڑھیا کو چھوڑکر دوڑ دوڑا اپنی ماں کے پاس پہنچا اور پوچھا:

"امی جان! میری منگیتر کون ہے؟ سچ بتائیے-"

"یہ بات تو تمہارے جاننے کی نہیں تھی لیکن خیر بتاتی ہوں" ماں بولی اور اس نے ساری باتیں طاہر کو بتا دیں- پھر اس نے اپنے بیٹے سے کہا:

"اب تو زہرہ تمہیں ملنے سے رہی- وہ ٹھہری بادشاہ کی بیٹی اور تم بیچارے ایک یتیم ہو-"

"امی جان! کوئی بات نہیں- میں بس سچی بات جاننا چاھتا تھا" طاہر نے ماں سے کہا-

اسی دن سے طاہر زہرہ کے ساتھ کھیلنے لگا- دن گزرتے گئے- طاہر اور زہرہ بڑے ہوکر مدرسے جانے لگے- وہ دونوں مدرسے میں ساتھ بیٹھتے تھے- طاہر پڑھتا پڑھاتا خاک بھی نہیں تھا بس ہر وقت زہرہ سے باتیں کرتا رہتا تھا-

ایک دن استاد نے بادشاہ کے پاس جاکر شکایت کی:

"بادشاہ عالم! یتیم وزیرزادہ طاہر آپ کی بیٹی کو پڑھنے لکھنے نہیں دیتا ہے- ہر وقت اس کو باتوں میں الجھائے رکھتا ھے- اس کا کیا کیا جائے؟"

بادشاہ نے غصے میں آکر حکم دیا:

"ان دونوں کے درمیان ایک دیوار بنوا دو-"

استاد نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی- لیکن اسی دن طاہر نے دیوار میں ایک سوراخ بنا لیا اور پھر پہلے کی طرح زہرہ سے باتیں کرنے لگا-

طاہر اور زہرہ دونوں ایک دن بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے- اور جب دونوں بڑے ہو گئے تو ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت کی آگ بھڑک اٹھی- یہ بات بادشاہ کو معلوم ہوئی تو غصے سے آگ بگولہ ہو گیا اور کاریگروں کو بلاکر ان کو حکم دیا کہ ایک صندوق تیار کرو- اس نے طاہر کو اس صندوق میں بند کرکے دریا میں ڈال دینے کا ارادہ کر لیا تھا-

بادشاہ کا یہ ارادہ زہرہ کو معلوم ہو گیا۔ وہ سونے سے بھری ہوئی ایک طشتری لےکر کاریگروں کے پاس گئی اور روتے ہوئے ان کی منتیں کرنے لگی:

"یہ سارا سونا لے لو۔ اگر اس سے تمہاری تسلی نہ ہو تو مجھ سے اور مانگ لو۔ لیکن صندوق ایسا مضبوط بناؤ کہ اس کے اندر پانی نہ جا سکے۔ اور ذرا لمبا چوڑا بھی ہوتا کہ اس کے اندر طاہر کچھ آرام سے سانس لے سکے۔"

کاریگروں کو زہرہ پر رحم آ گیا۔ انہوں نے سونا لے لیا اور زہرہ کو تسلی دی:

"آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہوگا۔"

کچھ دنوں میں صندوق تیار ہو گیا۔ زہرہ منہ پر نقاب ڈال کے صندوق کو دیکھنے آئی۔ کاریگروں نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ صندوق بہت مضبوط اور کافی لمبا چوڑا بنا تھا۔

بادشاہ نے اپنے ڈھنڈورچیوں کو بھیج کر شہری اور دیہاتی آبادی کو شہر کے میدان میں جمع کرایا۔ پھر وہ خود بھی اپنے محل سے نکل آیا اور اعلان کیا:

"ہم نے طاہر کو موت کی سزا سنائی ہے۔ آج اس کو صندوق میں بند کرکے دریا میں پھینک دیا جائےگا۔ دریا اس کو جہاں چاہے بہاکر لے جائے۔"

سب کو طاہر پر رحم آ رہا تھا۔ لیکن ظالم بادشاہ کے ڈر سے کسی کو منہ کھولنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔

مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے سب دریا کے کنارے جمع ہو گئے۔ غم کی ماری طاہر کی ماں بھی آ گئی۔ وہ کنارے کی ریت پر اوندھے منہ گرکر سسک سسک کر رونے لگی۔ ہجوم میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگ چیخنے چلانے لگے۔

"ایک ماں کو رلانےوالے بادشاہ کی آنکھیں پھوٹ جائیں!"

"یہ کیا اندھیر ہے کہ کسی لڑکی سے محبت کرنے پر کسی کو قتل کر دیا جائے؟"

"بادشاہ کو اس ظلم کی ضرور سزا ملےگی!"

اتنے میں اعلان ہوا کہ طاہر کو لایا جا رہا ہے۔ لوگوں نے چیخنا چلانا بند کر دیا۔ ہجوم نے ذرا پیچھے ہٹ کر طاہر کے لئے راستہ خالی کیا۔ طاہر کی ماں نے اپنا سر اٹھایا اور روتے ہوئے چلاکر کہا:

"مجھے آخری بار اپنے بیٹے کو دیکھ لینے دو۔"

طاھر کو جس کے ھاتھ رسی سے کس کر باندھ دئے گئے تھے، ماں کے پاس لایا گیا— ماں روتی ھوئی اپنے بیٹے سے لپٹ گئی— اس نے اپنا سر بیٹے کے گھٹنوں سے لگایا، ایک دلدوز چیخ ماری اور بےجان ھو کر گر پڑی—

لوگ چیخنے چلانے اور رونے لگے— جلادوں نے جلدی جلدی طاھر کو صندوق میں ڈال کر اس کا ڈھکنا بند کر دیا— طاھر اپنی زھرہ سے پکارکر بس اتنا ھی کہہ پایا:

"زندہ رھا تو ھمیشہ تم سے محبت کرتا رھوں گا— اور مر گیا تو تمھاری محبت اپنے دل میں لے کر جاؤں گا—"

جلادوں نے صندوق اٹھاکر دریا میں پھینک دیا—

طاھر بہت دنوں تک صندوق کے اندر دریا میں بہتا رھا— بالآخر ایک دن صندوق شہر روم جا پہنچا—

بادشاہ روم کے دو بیٹیاں تھیں— اس دن وہ دونوں اپنی کنیزوں کے ساتھ دریا پر نہانے آئی تھیں— دفعتاً انھوں نے دیکھا کہ دریا میں ایک صندوق بہتا چلا آ رھا ھے—

صندوق قریب آ گیا تو بڑی شہزادی پانی میں اتر گئی اور اپنی چوٹی صندوق پر پھینکی لیکن وہ چوٹی میں نہ پھنسا— اس کے بعد چھوٹی شہزادی پانی میں اتری اور اس نے بھی اپنی چوٹی پھینکی— صندوق چوٹی میں پھنس گیا اور چھوٹی شہزادی نے اس کو کھینچ لیا—

صندوق کو کھینچ کر کنارے پر لایا گیا تو دونوں شہزادیاں بحث کرنے لگیں کہ شکار کس کو ملنا چاھئے—

آخرکار یہ طے پایا کہ صندوق بڑی شہزادی کو ملےگا اور اس کے اندر جو کچھ ھوگا وہ چھوٹی شہزادی کو— یہ طے کرکے انھوں نے صندوق کو کھولا— کیا دیکھتی ھیں کہ اس کے اندر ایک نہایت ھی خوبصورت نوجوان پڑا ھوا ھے— اس نوجوان کے حسن کے آگے سورج کی چمک دمک بھی جیسے پھیکی پڑ گئی— اس کو دیکھ کر دونوں بہنوں میں پھر سے بحث شروع ھو گئی— لیکن چھوٹی شہزادی نے اپنی جیتی ھوئی چیز ھاتھ سے نہ جانے دی—

اس دوران بادشاہ کے نوکر دوڑے ھوئے بادشاہ کے پاس گئے اور اس کو خبر دی:

"بادشاہ عالم! آپ کی بیٹیوں نے دریا میں ایک صندوق پکڑا ھے— اس کے اندر

ایک نوجوان تھا جو حسن میں بےمثال ہے— چھوٹی شہزادی اس کو اپنا شوہر بنانا چاہتی ہیں— آپ کو اس سے اچھا داماد شاید ہی مل سکے—"

بادشاہ نے اس خوشخبری کے لئے نوکروں کو قیمتی انعامات دئے اور اپنے وزیر کو ساتھ لےکر خود دریا کے کنارے پہنچا— اس نے دیکھا کہ نوکروں نے جتنی تعریف کی تھی نوجوان اس سے بھی کہیں بہتر ہے— چنانچہ بادشاہ، طاہر سے اس طرح ملا جیسے وہ اس کا اپنا ہی بیٹا ہو اور کچھ دن بعد اس نے طاہر سے اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی کر دی— شادی کی دھوم دھام چالیس دن تک برابر جاری رہی—

بادشاہزادی بہت خوبصورت تھی، زہرہ سے بھی زیادہ خوبصورت— لیکن طاہر کو اپنا وہ وعدہ یاد تھا جو اس نے اپنی دور کی منگیتر سے کیا تھا— وہ شہزادی روم کی طرف دیکھتا بھی نہیں بلکہ اس سے کبھی بات تک نہیں کرتا تھا—

وہ بیچاری کڑھتی رہتی— راتوں کو بلک بلک کر روتی اور سوچتی:

"آخر یہ مجھ سے ذرا سی بھی محبت کیوں نہیں کرتے؟ میرے لئے ایک لفظ بھی منہ سے کیوں نہیں نکالتے؟"

اس نے بار بار طاہر سے اس کی وجہ پوچھی بھی— لیکن طاہر ہر دفعہ خاموش رہا—

اس طرح چالیس دن گزر گئے— اکتالیسویں دن طاہر نے شہزادی سے کہا:

"آپ اپنے والد سے کہئے کہ طاہر ذرا دریا کے کنارے تک جانا چاہتا ہے—"

شہزادی دوڑی ہوئی اپنے باپ کے پاس گئی اور اس سے کہا:

"والد محترم! بادشاہ عالم! طاہر بول پڑے— وہ ذرا دریا کے کنارے جاکر بیٹھنا چاہتے ہیں—"

یہ خبر سن‌کر بادشاہ خوشی سے پھولا نہ سمایا اور اس نے فوراً حکم دیا کہ دریا کے کنارے بزم شادمانی کا انتظام کیا جائے— دریا کے کنارے جشن منانے بہت سے لوگ آئے— کنارے ایک اونچی جگہ پر طاہر کے لئے نرم و ملائم قالین بچھا دئے گئے— دسترخوان لگاکر اس پر طاہر کے لئے انواع واقسام کے کھانے چن دے گئے—

تھوڑی دیر میں طاہر آ گیا— اس کا چہرہ بہت اداس تھا— اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نام کو بھی نہیں تھی—

بادشاہ نے اعلان کیا:

"جو کوئی میرے داماد کو سب سے پہلے مسکراتے ہوئے دیکھ لےگا میں اس کو سونے چاندی سے لاد دوں‌گا—"

یہ اعلان کرکے بادشاہ اپنے محل میں لوٹ گیا۔ لیکن طاہر بدستور چپ‌چاپ بیٹھا اداس نظروں سے دریا کے پانی کو تکتا رہا۔

طاہر کو یہیں بیٹھے رہنے دیجئے اور اب ذرا زہرہ کا حال سنئے۔

طاہر سے جدا ہوکر زہرہ دن رات برابر بہت اداس رہنے لگی۔ پھر ایک دن اس کے ظالم باپ نے ایک دوسرے بادشاہ کے بیٹے کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔ اب تو اس کی قسمت بےانتہا غم و اندوہ اور مایوسی کی سیاہ چادر اوڑھکر سو گئی۔

دن گزرتے گئے۔ ایک دن زہرہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ طاہر کے ساتھ کسی باغ کے اندر ٹہل رہی ہے۔ وہ دھاڑیں مارکر رو پڑی اور جاگ اٹھی۔

"ممکن ہے، میرا محبوب زندہ ہو۔ کاش کوئی اس کی کچھ خبر لا دیتا!" زہرہ نے اداس ہوکر سوچا۔

اگلے دن زہرہ سونے سے بھری ایک طشتری لےکر کارواں سرائے میں گئی۔ وہاں ایک قافلہ‌بان یعنی تاجروں کی قافلوں کی رہنمائی کرنےوالا ایک آدمی رہتا تھا۔ زہرہ سونےوالی طشتری اس آدمی کو دےکر اس سے منتیں کرنے لگی:

"آپ ساری دنیا میں گھومتے رہتے ہیں۔ مختلف لوگوں سے آپ کی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ مہربانی کرکے طاہر کو تلاش کیجئے۔ مجھے اس کی کوئی خبر لا دیجئے۔"

قافلہ‌بان راضی ہو گیا۔ وہ اپنے اونٹ پر سوار ہوکر طاہر کی تلاش کرنے نکل گیا۔ وہ بہت دنوں تک گھومتا رہا۔ لمبے لمبے راستے طے کئے۔ کتنے ہی شہروں اور دیہاتوں میں طاہر کو تلاش کیا لیکن کہیں اس کا اتا پتہ نہ ملا۔

چلتے چلتے، گھومتے گھومتے قافلہ‌بان ایک دن ایک دریا کے کنارے پر آ نکلا۔ اس نے دیکھا کہ دریا کے اونچے کنارے پر ایک بہت ہی خوبصورت نوجوان بیٹھا ہوا ہے اور ارد گرد بہت سے لوگ ناچ گا رہے ہیں، خوشیاں منا رہے ہیں۔

قافلےبان نے سوچا کہ ممکن ہے، طاہر انہیں لوگوں کے بیچ ہو۔ ذرا اس کا نام لےکر تو دیکھوں۔ یہ سوچ‌کر وہ گانے لگا:

میں ٹھہرا اک قافلےبان
دنیا بھر میں گھومتا ہوں
طاہرجان کو ڈھونڈتا ہوں
کہاں گئے تم، طاہرجان؟

طاهر نے اپنا نام سنا تو اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور جواب میں وہ بھی گانے لگا:

ٹھہرو، ٹھہرو قافلےبان
اپنا گیت ذرا پھر گاؤ
دیکھو اور قریب آ جاؤ
یہ بیٹھا ہے طاھرجان—

تب یہ جاننے کے لئے کہ یہ وہی طاھرجان ہے جس کی اسے تلاش ہے، قافلےبان پھر گانے لگا:

ناموں سے ہے بھرا جہان
پر زہرہ کا سن‌کر نام
اپنا سارا چین آرام
کھو بیٹھے گا طاھرجان—

زہرہ کا نام سنتے ہی طاہر اٹھ کھڑا ہوا— وہ دوڑکر قافلےبان کے پاس گیا اور اس کے اونٹ کی گردن سے لپٹ کر روتے ہوئے گڑگڑاکر کہا:

"مجھ کو زہرہ کے پاس لے چلو— کم از کم ایک بار ہی پھر اس کو دیکھ لوں—"

"زہرہ کی تو شادی ہو چکی ہے— وہ تو اب قارا باتر کی بیوی بن چکی ہے" قافلےبان نے بتایا— "اب آپ اس کو دیکھکر کیا کریں‌گے؟ اور یہ بات بھی ہے کہ آپ کو یہاں رہتے اتنا عرصہ ہو گیا ہے— آپ نے شاید شادی بھی کر لی ہوگی— اب یہاں سے کیوں جائیں— آپ یہیں رہیں— میں بس اتنا جاننا چاہتا تھا کہ آپ زندہ ہیں یا نہیں—"

"یہاں بادشاہ کی لڑکی سے میری شادی کر دی گئی ہے" طاہر نے بتایا— "لیکن میں نے آج تک کبھی نظر اٹھاکر نہ اس کی طرف دیکھا ہے اور نہ ہی کبھی اس سے کوئی بات کی ہے— میری بات مان جاؤ— مجھ کو زہرہ کے پاس لے چلو—"

"اچھی بات ہے— میں تیار ہوں" قافلےبان نے بالآخر راضی ہوکر کہا— "مگر پہلے آپ ذرا جاکر اپنی بیوی سے رخصت ہو لیں— اس نے تو آپ کے ساتھ محبت کی خاطر شادی کی ہے— اس کا دل دکھانا مناسب نہیں—"

طاہر اسی وقت محل پہنچا— اس نے شہزادی کے کمرے کا دروازہ کھولا اور ایک پاؤں اندر اور دوسرا پاؤں باہر رکھتے ہوئے شہزادی سے کہا:

"ملکہ! آپ نے میرے اوپر جو احسان کئے ہیں ان کے لئے میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں— لیکن آج مجھے زہرہ کا پیغام مل گیا ہے اور میں ابھی جا رہا ہوں—"

شہزادی نے پوچھا:

"کیا دریا آپ کو میرے پاس نہیں لایا تھا؟ کیا دوروالی زہرہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے کہ دریا مجھ کو آپ کے پاس لایا تھا" طاہر نے جواب دیا— "اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ آپ بہت خوبصورت ہیں لیکن مجھے دنیا میں زہرہ سے زیادہ کوئی بھی عزیز نہیں—"

اسی وقت طاہر اور قافلےبان دونوں اونٹوں پر سوار ہوکر چل دئے— وہ چلتے چلتے ایک مقام پر پہنچے جہاں سے تین طرف کو راستے جاتے تھے— جہاں یہ تینوں راستے شروع ہوتے تھے وہاں ایک بڑا سا پتھر پڑا ہوا تھا جس پر لکھا تھا: "دائیں طرف کا راستہ جانےوالے کو واپس نہیں لاتا— بائیں طرف کا راستہ کہیں ختم نہیں ہوتا اور سیدھا جانےوالا راستہ پرخطر ہے" قافلےبان سوچنے لگا کہ کون سا راستہ اختیار کیا جائے—

"آئیے سیدھے جانےوالے راستے پر چلیں" طاہر نے کہا— "یہ راستہ خطرناک ضرور ہے— لیکن اس پر چل‌کر ہم زہرہ تک زیادہ جلدی پہنچ جائیں گے—"

وہ بیچ کے راستے پر چل پڑے— تھوڑی دور چلے تو ایک شہر آیا— یہاں ابھی حال ہی میں دو ڈاکو قید سے بھاگ نکلے تھے اور یہاں کے لوگ انہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے— انہوں نے قافلےبان اور طاہر کو دیکھا تو ان کو وہی ڈاکو سمجھکر پکڑ لیا اور لے جاکر زنداں میں ڈال دیا—

طاہر زنداں میں دن رات برابر کڑھتا رہا— اس کی محبوبہ تک تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا— لیکن وہ حیران تھا کہ کس طرح زنداں کی سنگین دیواروں اور لوہے کے دروازے سے باہر نکلے اور اپنی محبوبہ تک پہنچے— سوچتے سوچتے اس کو ایک بات سوجھی— اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں گاکر اپنا حال بیان کروں— ممکن ہے، کوئی نہ کوئی مجھ کو پہچان لے اور مجھے چھٹکارا دلا دے— یہ سوچ کر وہ گانے لگا:

جاتا تھا میں محبوبہ کے پاس
لمبا تھا رستہ، دل میں تھی آس
ظالم نے مجھ کو زنداں میں ڈالا
طاہر سے چھٹ کے کڑھتی ہے زہرہ۔

یہ گیت وہ روز گاتا تھا۔ آخر ایک دن اس گیت کو ایک تاجر نے سن لیا جو مدرسے میں طاہر کے ساتھ پڑھتا تھا اور ہمیشہ اس کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔

"ارے یہ تو اپنا طاہر ہے" اس تاجر نے سوچا۔ "اس کے سوا اور کون اتنے برسوں تک زہرہ کو یاد رکھے گا۔"

یہ سوچ کر تاجر فوراً زنداں کے نگہبانوں کے پاس گیا اور ان کو اشرفیاں دے کر ان سے کہا:

"طاہر کو چھوڑ دو۔ اس بیچارے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کو اپنی محبت کے سوا اور کسی بات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔"

پہریداروں نے طاہر اور قافلےبان دونوں کو زنداں سے نکالا اور ان کے اونٹ بھی ان کو واپس کر دئے۔ ان دونوں نے اس نیک‌دل تاجر کا شکریہ ادا کیا اور اس سے رخصت ہوکر اپنے راستے پر چل پڑے۔

چلتے چلتے وہ ایک دن صبح کے وقت اپنے شہر پہنچ گئے۔ کارواں سرائے کے پاس آئے تو قافلےبان وہیں ٹھہر گیا اور طاہر آگے چلا۔

طاہر چپکے سے محل میں داخل ہو گیا۔ اس وقت زہرہ محل کے باغ میں سو رہی تھی۔ اس کو جگانے کی غرض سے طاہر دبی ہوئی آواز سے گانے لگا:

ہو چکی ہے صبح جاگ اب، اٹھ بھی جا
تیرا محبوب اے صنم! یاں ہے کھڑا
قسمتیں جاگیں مگر سوئی ہے تو
جاگ زہرہ جاگ، طاہر آ گیا۔

زہرہ نے اپنے محبوب کی آواز سنی، خوشی سے اس کا دل زور زور سے دھڑک اٹھا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ طاہر کو دیکھتے ہی بستر سے اٹھ کر اس سے لپٹ

گئی۔ وہ خوشی سے ہنس بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ اسی ہم‌آغوشی کی حالت میں دونوں باغ کے ایک کونے میں چلے گئے۔ وہاں بیٹھے دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ وہ اس طرح دنیا سے بے‌نیاز اپنے آپ میں محو ہوکے بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک قارا باتر کی بہن نے ان کو دیکھ لیا۔ وہ دوڑی ہوئی اپنے بھائی کے پاس پہنچی اور اس سے کہا:

"طاھر آ گیا ھے۔ وہ اور زھرہ دونوں باغ کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے ھیں۔"

قارا باتر غصے میں بھرا ھوا بادشاہ کے پاس پہنچا اور ساری بات اس کو بتا دی۔ بادشاہ نے فوراً باغ میں اپنے سپاھیوں کو بھیجا۔ انہوں نے طاھر کو پکڑ لیا اور لے جاکر ایک ایسے گڑھے میں ڈال دیا جس میں گھٹنوں تک کیچڑ تھا اور اوپر سے پانی ٹپکتا تھا۔

دوسرے دن بادشاہ نے اپنے وزیروں اور صلاح‌کاروں کو بلایا۔ انہوں نے اس بات پر غور کیا کہ طاھر کے معاملے میں کیا کیا جائے۔ فیصلہ کیا گیا کہ اس کے دو ٹکڑے کرکے شہر کے دروازے کے اوپر لٹکا دئے جائیں۔

بادشاہ کے حکم پر شہر کے تمام باشندوں کو مرکزی چوک میں جمع کیا گیا۔ زھرہ بھی آ گئی۔ سب لوگ بادشاہ کی اندھیرگردی پر غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے۔

کوئی کہتا تھا کہ طاھر بیچارہ لوٹ‌کر آیا ھی کیوں؟ کوئی دوسرا کہتا تھا کہ اس کو محبت کھینچ لائی ھے لیکن اس کے لئے بیچارے نوجوان کو قتل کیوں کیا جائے؟ لعنت ھو اس خونخوار بادشاہ پر!

سپاھی طاھر کو میدان میں لے آئے۔ جلاد نے اپنی تلوار کو اور بھی تیز کر لیا۔ لوگ بادشاہ پر لعنت بھیج رہے تھے لیکن کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ زھرہ اپنے باپ کے پاؤں پڑی، ھاتھ جوڑے، اس کی خوب منتیں کیں مگر وہ بھی اپنے باپ کے پتھر دل کو نرم نہیں کر سکی۔ جب اس نے دیکھا کہ طاھر جلاد کے ھاتھ میں آ گیا ھے تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ بےھوش ھوکر گر پڑی۔

جلاد نے تلوار کے ایک بھرپور وار سے طاھر کے جسم کے دو ٹکڑے کر دئے۔ میدان میں کہرام مچ گیا۔ سب چیخنے چلانے لگے۔ ھجوم میں سے رونے اور کراھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک بوڑھی عورت آگے نکل آئی اور بادشاہ سے مخاطب ھوکر غیض و غضب سے کہنے لگی:

"اے ظالم بادشاہ! تیرا تخت جلاد کی تلوار کی طرح خون سے رنگا ھوا ھے۔ تو

نے طاہر کو قتل کرا دیا لیکن اس کی محبت کو قتل نہیں کرا سکتا۔ جب تک تجھ سے گلا نہیں چھوٹے گا تب تک آسمان میں کبھی سورج نہیں چمکے گا، پہاڑوں پر کبھی برف نہیں گرے گی اور دنیا میں کبھی انصاف نہیں ملے گا۔"

اتنے میں جلاد نے طاہر کے جسم کے ٹکڑے شہر کے دروازے پر لٹکا دئے۔

تب اچانک بےہوش پڑی ہوئی زہرہ کو ہوش آ گیا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا اور اپنے آپ کو کراہنے سے روکتے ہوئے پکار اٹھی:

آ رہے ھیں اونٹ صف باندھے ہوئے
شہر کے باہر ھے ان کا شور سا
اور قصائی باپ نے طاہر کا جسم
کاٹ کر دروازے پر لٹکا دیا۔

بادشاہ کو اس کا کوئی جواب دینے کی جرأت نہیں ہوئی۔

طاہر کی موت کے بعد زہرہ نے سیاہ ماتمی لباس پہن کے چہرے پر سیاہ نقاب ڈال کے چالیس دنوں تک اپنے محبوب کا سوگ منایا۔ اکتالیسویں دن اس نے اپنے باپ سے کہا:

"اجازت دیجئے که میں اپنے محبوب کی قبر کی زیارت کر آؤں۔"

بادشاہ نے اجازت تو دے دی لیکن اس نے کنیزوں کو زہرہ کے ساتھ کر دیا۔ زہرہ نے مٹھی بھر موتی اپنے رومال میں باندھ لئے، ایک تیز سی تیغ لے لی اور طاہر

محل سے باہر آتے ھی زہرہ ایک ایک کرکے موتیوں کو راستے پر پھینکنے لگی۔ کنیزوں نے موتیوں کو دیکھ لیا اور رک رک کر ان کو اٹھانے لگیں۔ زہرہ موتیوں کو پھینکتی گئی اور کنیزوں سے دور ہوتی گئی۔ طاہر کی قبر کے بالکل قریب پہنچی تو اس نے آخری موتی کو پھینک دیا اور قبر کی طرف دوڑ پڑی۔ قبر پر پہنچتے ھی اس کی قبر کی طرف چل دی۔

کنیزیں سب موتیوں کو اٹھا چکیں تو دوڑتی ہوئی قبر پر آئیں۔ آکر کیا دیکھتی ھیں که زہرہ بےجان پڑی ہوئی ھے۔ وہ سب خوب روئیں اور پھر انہوں نے زہرہ کو وھیں طاہر کے پہلو میں دفن کر دیا۔

نے تیغ کو اپنے سینے میں چبھو لیا۔

قارا باتر نے یه سنا تو اس نے گرج کر کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ زہرہ مرکر بھی طاہر سے محبت کرتی رہےگی۔ میں ان کو یوں نہ چھوڑوں گا" یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی۔

قارا باتر کی بہن نے لوگوں سے کہا:

"میرا بھائی، طاہر اور زہرہ کو اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کو ان دونوں کے درمیان دفن کر دو۔"

"کیا ان بیچاروں نے زندگی میں کچھ کم اذیتیں سہی تھیں؟ اب مرنے کے بعد بھی ان کو اپنے حال پر نہیں چھوڑوگے؟ از راہ کرم ان کو اب اپنے حال پر چھوڑ دو" عام لوگوں میں سے کئی ایک نے کہا لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی۔

ظالموں نے قارا باتر کو لے جاکر طاہر اور زہرہ کے بیچ دفن کر دیا۔

طاہر کی قبر پر سرخ گلاب کا پودا اگا اور زہرہ کی قبر پر سفید گلاب۔ ان دونوں کے بیچ قارا باتر کی قبر سے سیاہ کانٹے نکل آئے۔ لیکن گلاب کے دونوں پودے بڑھکر کانٹوں سے اونچے اٹھ گئے اور ان کی شاخیں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ تبھی سے ان دونوں پودوں پر ہر وقت پھول کھلے رہتے ہیں۔ یہ پھول بھی طاہر اور زہرہ کی محبت کی طرح جاوداں ہیں۔

# جادو کا پتھر

بہت دنوں پہلے کی بات ہے، کسی گاؤں میں ایک عورت رہتی تھی جس کے ایک بیٹا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے بیٹے کو کچھ پیسے دےکر اس سے کہا:

"بیٹے! ذرا جاکر بازار سے روٹی لے آؤ۔"

لڑکا پیسے لےکر بازار جا رہا تھا کہ ایک چوراہے پر اس نے کچھ بچوں کو بلی کے ایک مریل سے بچے کو ستاتے ہوئے دیکھا۔ اسے بلی کے بچے پر رحم آ گیا اور اس نے بچوں سے پوچھا:

"اے بچو! اس بلی کے بچے کو بیچوگے؟"

"ہاں بیچیں گے" بچوں نے جواب دیا۔

"کیا لوگے؟" لڑکے نے پوچھا:

"جو جی چاھے دے دو" بچوں نے کہا۔

لڑکے کے پاس جتنے پیسے تھے سب دےکر اس نے بلی کے بچے کو لے لیا اور اس کو گود میں اٹھائے واپس گھر آیا۔

ماں نے پوچھا:

"لے آئے روٹی؟"

"روٹی تو نہیں لایا۔ بلی کے ایک بچے کو لایا ھوں" لڑکے نے جواب دیا۔

"ارے کیا کہہ رھے ھو، بیٹے! یہ تم نے کیا کیا؟" ماں نے حیران اور اداس ھوکر کہا۔

لڑکے نے سارا حال اپنی ماں کو سنانے کے بعد کہا:

"ماں! کوئی بات نہیں۔ ایک دن روٹی کھائے بغیر ھی رہ لیں گے۔"

دوسرے دن ماں نے لڑکے کو پھر کچھ پیسے دےکر قصائی کی دکان پر بھیجا۔

راستے میں سڑک پر لڑکے نے دیکھا کہ کچھ لڑکے ایک پلے کو پتھروں سے مار رھے ھیں۔

لڑکے کو اس پلے پر رحم آ گیا اور اس نے لڑکوں سے پوچھا:

"اے لڑکو! اس پلے کو بیچوگے؟"

"ھاں بیچیں گے" لڑکوں نے جواب دیا۔

لڑکے نے اپنے ھاتھ کے سارے پیسے ان کو دے دئے اور پلے کو لےکر گھر واپس آ گیا۔

ماں نے پوچھا:

"لے آئے گوشت؟"

لڑکے نے کہا:

"ماں! آپ ناراض نہ ھوں۔ آپ نے جو پیسے دئے تھے ان کو دےکر میں یہ پلا لایا ھوں۔"

"ارے بیٹے!" ماں نے اداس ھوکر کہا۔ "ھم ٹھہرے غریب لوگ۔ میں نے جانے کتنی مشکلوں سے وہ پیسے کمائے تھے۔ تم ان سے پلا خرید لائے۔ بھلا یہ پلا ھمارے کس کام کا؟ اور پھر اس کو کھلانے کے لئے ھمارے پاس کچھ ھے بھی تو نہیں۔"

لڑکے نے جواب دیا:

"ماں، کوئی بات نہیں– ہم ایک دن گوشت کے بغیر جی لیں گے–"

تیسرے دن پھر ماں نے اپنے بیٹے کو کچھ پیسے دئے اور اسے تیل لانے کے لئے بازار بھیجا– وہ سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس نے دیکھا کہ کچھ لڑکے چوھے کے ایک بچے کو جو چوھےدان میں پھنس گیا تھا، ستا رہے ھیں– اس کو چوھے کے بچے پر رحم آ گیا، اس نے اپنے سارے پیسے دےکر اس کو لے لیا اور لئے ھوئے گھر واپس آیا– ماں نے پوچھا: "بیٹے! تیل لے آئے؟" تو اس نے بتایا کہ کس طرح اسے تیل کے بجائے چوھے کے بچے کو لینا پڑا– ماں اپنے بیٹے سے بہت پیار کرتی تھی– اس لئے اس دفعہ بھی اس نے بیٹے کو برا بھلا نہ کہا– بس ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی–

بہت دن گزر گئے– لڑکا جوان ھو گیا– پلا کتا بن گیا، بلی کا بچہ بڑا ھوکر بلی بن گیا اور چوھے کا بچہ بھی ایک اچھا خاصا چوھا بن گیا–

ایک دن نوجوان نے دریا میں ایک مچھلی پکڑ لی– اس نے مچھلی کو کاٹا اور اس کی آنتیں نکال‌کر کتے کے آگے پھینک دیں– کتا آنتوں کو کھانے لگا تو اچانک ان میں ایک چھوٹا سا پتھر مل گیا جو سورج کی مانند چمک رہا تھا– نوجوان نے اس پتھر کو دیکھا تو خوشی سے اچھلنے کودنے لگا– کیونکہ وہ ایک جادو کا پتھر تھا جس کے متعلق نوجوان نے لوگوں سے سن رکھا تھا– اس نے پتھر کو اٹھاکر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور کہا: "اے جادو کے پتھر! مجھے کھانا کھلاؤ!"

یہ کہہ‌کر اس نے مڑکر جو دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا– پلک جھپکتے میں اس کے سامنے ایک بیش‌قیمت دسترخوان پر ایسے انوکھے اور لذیذ کھانے چنے ھوئے تھے جن کو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا– اس نے پیٹ بھرکر کھانا کھا لیا– پھر وہ دوڑکر گھر آیا اور وہ جادو کا پتھر اپنی ماں کو دکھایا– ماں بہت خوش ھوئی– اسی دن سے ماں اور بیٹا دونوں بڑے چین اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے–

ایک دن نوجوان شہر گیا– وھاں گھوم پھر رہا تھا کہ اچانک اسے ایک نہایت حسین جوان لڑکی نظر آئی– وہ لڑکی نوجوان کو اتنی زیادہ پسند آئی کہ اس نے اس سے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا– گھر لوٹ‌کر اس نے اپنا یہ ارادہ ماں کو بتایا–

"واہ بیٹے! تم بھی کیا باتیں کرتے ھو!" ماں نے حیرت سے کہا– "تم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ لڑکی خود بادشاہ سلامت کی بیٹی ھے– نہ بابا، میں پیغام لےکر بادشاہ کے پاس کبھی نہیں جاؤں گی–"

لیکن نوجوان اصرار کرتا رہا اور آخرکار ماں مجبوراً راضی ہو گئی۔ اس نے کہا:

"اچھی بات ہے۔ کہتے ہو تو چلی جاؤں گی۔ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ بادشاہ کے محل سے آج تک کبھی کسی کو سکھ نہیں ملا۔"

رات کے وقت ماں شاہی محل تک گئی اور محل کے دروازے کے سامنے کی سڑک پر جھاڑو دے کر اس کی صفائی کر دی۔

صبح کو بادشاہ محل سے باہر نکلا تو اس نے یہ دیکھکر بڑا متعجب ہوا کہ دروازے کے سامنے کی ساری زمین صاف ستھری ہو گئی ہے۔ اگلے دن صبح پھر اس نے دیکھا تو یہی حال تھا۔ اس کو اور زیادہ تعجب ہوا اور اس نے رات کو دروازے کے سامنے پہریدار کھڑے کر دئے۔

تیسرے دن صبح سویرے پہریدار ایک عورت کو پکڑکر بادشاہ کے پاس لے آئے۔ بادشاہ نے عورت سے پوچھا:

"بتاؤ، تم روز رات کو میرے محل کے دروازے کے سامنے جھاڑو کیوں دیتی ہو؟"

عورت نے کہا:

"میں ایک غریب بیوہ ہوں۔ میرے ایک بیٹا ہے۔ میں آپ کی بیٹی سے اس کی شادی کی خواہش لےکر آئی تھی۔ لیکن آپ کے پاس یوں چلے آنے کی مجھے جرأت نہیں ہوئی۔ اور پھر آپ کے پہریدار بھی تو آنے نہ دیتے۔"

کسی غریب عورت کی یہ گستاخی بھلا بادشاہ کیسے برداشت کرتا۔ اس نے غصے میں آکر حکم دیا کہ عورت کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن اس کے دائیں ہاتھ والے وزیر نے کہا:

"بادشاہ عالم! اس بیچاری عورت کو قتل کروانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ اس کو کوئی ایسا کام بتائیے جس کو پورا کرنا اس کے بس کی بات نہ ہو۔ بس پھر یہ خود ہی محل میں آنا بند کر دےگی۔"

وزیر کی بات بادشاہ کو پسند آئی اور اس نے عورت سے کہا:

"جاؤ، جاکر اپنے بیٹے سے کہنا کہ وہ میری بیٹی کے لئے چالیس اونٹوں پر سونا لادکر لائے۔"

"ہم بیچارے اتنا سونا کہاں سے لائیں گے" عورت نے اداس ہوکر سوچا اور محل سے نکل کر اپنے گھر کی راہ لی۔ گھر لوٹ کر اس نے بادشاہ کی شرط اپنے بیٹے کو بتائی تو اس نے ماں سے کہا:

"امی جان! آپ فکر نہ کیجئے-"

اس نے جادو کے پتھر کو اپنی ہتھیلی پر رکھکر اس سے کچھ کہا- بس پھر کیا تھا، صبح ہوتے ہوتے غریب بیوہ کی جھونپڑی کے سامنے سونے سے لدے ہوئے چالیس اونٹ کہیں سے آکر کھڑے ہو گئے-

نوجوان نے ماں سے کہا:

"امی جان! آپ ان چالیس اونٹوں کو بادشاہ کے پاس لے جائیے-"

ماں کو بڑا تعجب ہوا لیکن وہ کچھ کہے بغیر ان چالیس اونٹوں کو ہانکتی ہوئی بادشاہ کے پاس لے گئی- بادشاہ بھی بہت متعجب ہوا لیکن اس نے فوراً ہی ایک اور حکم صادر کر دیا- اس نے عورت سے کہا:

"اپنے بیٹے سے جاکر کہنا کہ وہ اپنی دلہن کے لئے ایک محل بنوائے جو سارے کا سارا خالص سونے کا ہو- تب ہی شادی بیاہ کی بات ہو سکتی ہے-"

ماں اور زیادہ اداس ہو گئی اور گھر جاکر بادشاہ کی نئی فرمائش اپنے بیٹے کو سنائی- نوجوان نے ماں کی باتیں چپ‌چاپ سن لیں اور پھر اس سے کہا:

"امی جان! آپ فکر نہ کیجئے- خالص سونے کا محل بھی بن جائے گا-"

صبح سویرے دریا کے کنارے ایک عالیشان محل کھڑا ہو گیا جو سارے کا سارا خالص سونے کا تھا- ایسا محل اس وقت تک کسی نے نہیں دیکھا تھا-

ماں نے بادشاہ کے پاس جاکر کہا:

"بادشاہ عالم! محل تیار ہے- ذرا باہر چل کے اس کو دیکھئے تو-"

بادشاہ اپنے وزیروں کے ساتھ باہر آیا اور محل کو دیکھکر ہکا بکا رہ گیا- اب تو اس کو ٹال‌مٹول کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی اور اس نے غریب نوجوان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی-

بادشاہ کے محل میں ایک چڑیل رہتی تھی- اس نے راز معلوم کرنے کا عہد کیا کہ ایک غریب نے راتوں رات ایسا عالیشان محل کیسے بنوا لیا، وہ بھی سونے کا- یہ عہد کرکے وہ مزاج‌پرسی کے بہانے شہزادی کے پاس آئی اور اس کو پھسلاکر اس بات پر تیار کر لیا کہ وہ اپنے شوہر سے کسی طرح یہ راز معلوم کرے- چنانچہ اپنی بیوی کے اصرار پر نوجوان نے بتایا:

"میرے پاس جادو کا ایک پتھر ہے- اس کی مدد سے میں جو کچھ چاہوں حاصل کر سکتا ہوں-"

"تم اس جادو کے پتھر کو کہاں رکھتے ہو؟" بیوی نے پوچھا۔

"میں اس کو اپنے منھ میں زبان کے نیچے رکھتا ہوں" نوجوان نے جواب دیا۔

اگلے ہی دن شہزادی نے یہ سب باتیں چڑیل کو بتا دیں۔ اسی دن رات کو نوجوان گہری نیند سو گیا تو چڑیل نے آکر آہستہ سے اس کے منھ سے جادو کا وہ پتھر نکال لیا اور فوراً ہی اس کو حکم دیا:

"اے جادو کے پتھر! سونے کے اس محل کو شہزادی کے ساتھ ہی بادشاہ کے باغ میں منتقل کر دو۔ اور غریب نوجوان پہلے جہاں تھا وہیں رہے۔"

ایک ہی لمحہ بعد سونے کا محل بادشاہ کے باغ میں کھڑا تھا۔ نوجوان نے آنکھیں کھولیں تو اس نے دیکھا کہ نہ محل ہے، نہ شہزادی اور وہ خود اپنی بوسیدہ جھونپڑی کے اندر پڑا ہوا ہے۔ پاس اس کی ماں بیٹھی رو رہی ہے۔ اور ایک کونے میں سے کتا، بلی اور چوہا اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

"ہائے میری بدقسمتی!" نوجوان مایوس ہوکر کہہ اٹھا۔ "جادو کا پتھر گم ہو گیا ہے۔ اب میں کیا کروں؟" یہ کہہ کر اس نے اپنے آپ کو اوندھے منھ مٹی کے فرش پر گرا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کتے، بلی اور چوہے کو نوجوان پر رحم آ گیا۔

ان میں سے ہر ایک اپنے دل میں سوچنے لگا کہ اب آخر کیا کیا جائے۔ دفعتاً کتا بھونک اٹھا، بلی میاؤں کر اٹھی، چوہا چیں چیں کرنے لگا۔ وہ تینوں دوڑتے ہوئے جھونپڑی سے باہر نکلے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

وہ تینوں تمام دن برابر دوڑتے رہے اور شام ہوتے ہوتے بادشاہ کے باغ تک پہنچے۔ انہوں نے نظریں اٹھاکر دیکھا تو دیوار کے اس طرف نوجوان کا سنہرا محل چمک رہا تھا۔

"اب ہم کو کسی طرح باغ کے اندر داخل ہو جانا چاہئے" کتے، بلی، چوہے تینوں نے آپس میں طے کیا۔

لیکن باغ کی دیواریں اتنی اونچی تھیں کہ ان کو پھاندکر اندر جانا ناممکن تھا۔ سب دروازوں پر اندر سے مضبوط تالے لگے ہوئے تھے۔

کتا، بلی اور چوہا تینوں دیوار میں کوئی سوراخ تلاش کرنے لگے۔ سوراخ نہ ملا تو وہ تینوں مل‌کر دیوار کے نیچے زمین میں ایک سوراخ بنانے لگے۔ سب سے پہلے چوہے نے اپنے پنجے کام میں لگائے۔ پھر بلی، اور آخر میں کتا اس کی جگہ کام میں لگ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سرنگ تیار ہو گئی۔

پہلے چوہا سوراخ سے ہوکر اندر گیا۔ پھر بلی بھی اندر چلی گئی۔ کتا باہر پہرہ دینے لگا۔

بلی اور چوہا دونوں سارے محل میں دوڑتے پھرے اور بالآخر اس کمرے میں داخل ہو گئے جہاں شہزادی سوئی ہوئی تھی اور پاس ہی چڑیل پڑی سو رہی تھی جس نے اپنے ہونٹ زور سے بھینچ رکھے تھے۔ عقلمند چوہا فوراً سمجھ گیا کہ جادو کے پتھر کو اسی نے اپنے منہ میں زبان تلے دبا رکھا ہے۔ چوہا دبے پاؤں آکر چڑیل کی چھاتی پر چڑھ گیا اور اپنی دم کی نوک سے اس کی ناک میں گدگدی کرنے لگا۔ چڑیل نے اپنا منہ خوب کھول کر زور کی ایک چھینک ماری اور جادو کا پتھر اچھل کر فرش پر گر پڑا۔ بلی نے فوراً اس کو منہ میں اٹھا لیا اور جب تک چڑیل ہوش سنبھالتی بلی اور چوہا دونوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے ہوئے سوراخ کے راستے باہر سڑک پر آ گئے جہاں کتا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ کتے نے فوراً جادو کا پتھر بلی سے لےکر اپنے منہ میں دبا لیا اور تینوں آگے دوڑ پڑے۔

ادھر محل میں کھلبلی مچ گئی۔ سب "پکڑو! پکڑو!" کرکے چیخنے چلانے لگے۔ چور کی تلاش ہونے لگی۔ لیکن انہیں یہ کیا معلوم تھا کہ جادو کا پتھر کسی آوارہ کتے کے منہ میں پڑا ہوا ہے۔

کتا، بلی اور چوہا تینوں دوڑتے تھوڑی دیر میں دریا کے کنارے پہنچے اور آپس میں اس بات پر بحث کرنے لگے کہ جادو کے پتھر کو اس پار کون لے جائے۔

بلی کہتی تھی: "پتھر کو اس پار میں لے جاؤں گی۔"

کتا کہتا تھا: "نہیں، تمہیں تو تیرنا بھی نہیں آتا۔ کہیں اس کو لئے ڈوب ہی نہ جاؤ۔"

چوہے کی بھی یہی خواہش تھی کہ جادو کے پتھر کو اس پار میں لے جاؤں۔ تینوں بہت دیر تک بحث کرتے رہے۔ کتا اپنی بات پر اڑا رہا اور پتھر اسی کے پاس رہ گیا۔ تینوں تیرتے ہوئے دریا کو پار کرنے لگے۔ اچانک کتے نے پانی میں اپنا عکس دیکھ لیا اور اس کو کوئی دوسرا کتا خیال کرکے زور سے جو بھونکا تو جادو کا پتھر اس کے منہ سے نکل کر پانی میں گر گیا۔ اسی وقت اچانک کہیں سے ایک بڑی سی مچھلی آ نکلی اور وہ پتھر کو نگل گئی۔

"میں نے کہا تھا نا کہ پتھر کو تم ہرگز نہ لے جانا" بلی نے مایوس ہوکر کتے سے کہا۔

اب وہ تینوں حیران تھے کہ کیا کیا جائے۔ اپنے مالک کے پاس خالی ہاتھ جانا نہیں چاہتے تھے۔ نزدیک میں ماہی‌گیروں کی ایک بستی تھی۔ وہ تینوں حیران و پریشان چلتے ہوئے اس بستی میں آئے۔ تینوں کو بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔

خوش‌قسمتی سے ایک مچھیرے نے ایک بڑی سی مچھلی پکڑ لی تھی۔ اس نے مچھلی کو کاٹ‌کر اس کی آنتیں پھینک دیں۔ کتا، بلی اور چوھا تینوں ان آنتوں کو کھانے لگے۔

اچانک بلی خوشی سے میاؤں کر اٹھی۔ معلوم ہوا کہ مچھلی کی آنتوں میں اس کو کوئی چمکیلا پتھر مل گیا ھے۔ تینوں نے اس کو ذرا غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ انہیں کا جادو کا پتھر ھے۔ تینوں خوشی سے اچھلنے کودنے لگے۔ بلی نے پتھر کو اپنے منہ میں لے لیا اور تینوں اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ گھر پہنچتے ھی بلی نے جادو کے پتھر کو نوجوان کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ نوجوان اس کو دیکھ‌کر خوشی سے پھولا نہ سمایا اور اس نے کتے، بلی اور چوھے تینوں سے کہا:

"تم لوگوں کا احسان میں جیتے جی نہیں بھولوں‌گا۔"

"اور ہم جیتے جی تمہاری خدمت کرنے کو تیار ھیں۔ کیونکہ کبھی تمہیں نے ہماری جانیں بچائی تھیں۔" کتے، بلی اور چوھے تینوں نے ایک آواز میں اس کو جواب دیا۔

لیکن اس کی ماں نے اس کو روکتے ہوئے کہا:

"ابھی میں پتھر کو حکم دیتا ھوں اور سونے کا محل پھر سے آ جائے‌گا۔"

نوجوان نے جوش میں آکر کہا:

"رہنے دو، بیٹے۔ سونے کے محل کی ھمیں کوئی ضرورت نہیں۔"

تب نوجوان نے جادو کے پتھر سے کہا:

"محل کو مٹا دو۔"

بس پھر کیا تھا، نہ محل رہا، نہ چڑیل رہی اور نہ ھی بادشاہ اور اس کی بیٹی رہی۔ ان سب کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

لوگ کہتے ھیں کہ اس کے بعد نوجوان نے ایک مالی کی بیٹی سے شادی کر لی اور وہ لوگ بڑے سکھ اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ اور آج تک اسی طرح ھنسی خوشی جئے جا رہے ھیں۔

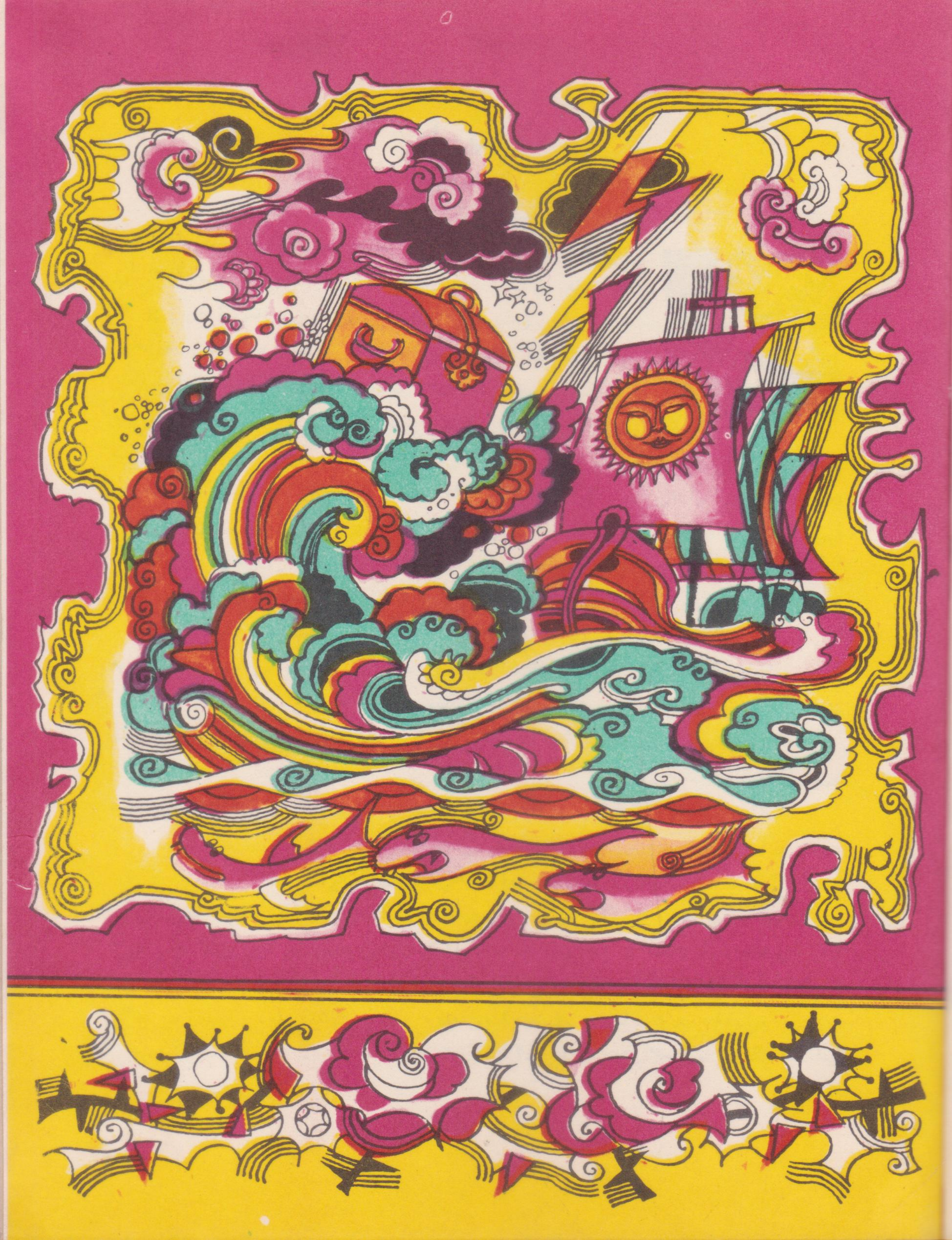

# سوسنیل

سچ ہے یا جھوٹ، یہ تو معلوم نہیں لیکن کہنےوالے کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کسی ملک میں ایک گدھا اور ایک بیل رہتے تھے۔ بیل دن بھر میں اتنی زمین پر ہل چلا لیتا تھا جتنی زمین پر کوئی دوسرا بیل ہفتے بھر میں بھی نہیں چلا سکتا تھا۔ لیکن شام کو وہ تھکا ہارا لوٹ کر گھر آتا تو اسے سوکھی پھیکی گھاس کا ایک گٹھا کھانے کو ملتا تھا۔ جہاں تک گدھے کا تعلق تھا وہ کوئی کام کاج نہ کرتا، دن بھر پڑے پڑے دھوپ کھاتا تھا لیکن اس کو پانی کی جگہ دودھ پلایا جاتا اور سوکھی پھیکی نہیں بلکہ ہری ہری رس بھری گھاس سے تواضع کی جاتی تھی۔

ایک روز بیل شام کو حسب معمول تھکا ہوا اپنے تھان پر لوٹا اور خشک بےذائقہ گھاس کو بےدلی سے چبانے لگا۔ بےچارہ لاکھ چباتا تھا لیکن سوکھی گھاس اس کے حلق سے نیچے ہی نہیں اترتی تھی۔ اس نے گدھے سے مخاطب ہوکر کہا:

"بھائی گدھے! اپنے رسیلے چارے میں سے تھوڑا سا مجھے بھی دے دو نا۔ یہ خشک، بےذائقہ گھاس تو اب مجھ سے بالکل ہی نہیں کھائی جاتی۔"

گدھے کو بیل پر رحم آ گیا اور اس نے اپنے چارے میں سے تھوڑا سا اس کو دے دیا۔

مالک تھان پر آیا تو یہ دیکھکر کہ گدھا اپنا چارا سارا کھا چکا ہے، بہت خوش ہوا اور کہا:

"ہا۔ہا۔ہا! خوب کھاتے ہو تم! شاباش، میرے گدھے!"

مالک نے گدھے کے آگے کولی بھر ہری ہری گھاس اور ڈال دی۔ پھر اس نے بیل کی ناند میں دیکھا تو پتہ چلا کہ تمام خشک گھاس جوں کی توں پڑی ہوئی ہے۔ وہ طیش میں آکر بیل پر چیخنے چلانے لگا:

"مردود! بدمعاش کہیں کا! تو کیوں چارہ نہیں کھاتا؟ کل کھیت پر جاکے لیٹ جائے گا تو کون چلائے گا۔ تیرا باپ؟"

یہ کہتے ہوئے وہ بیل کو ڈنڈے سے مارنے لگا— اتنا مارا، اتنا مارا کہ بیچارے بیل کی کھال کی ساری گرد جھڑ گئی—

اس دن سے گدھا روز اپنے شام کے کھانے کا کچھ حصہ بیل کو دینے لگا—

ایک دن مالک تھان پر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ بیل گدھے کا چارا ڈٹ کر کھا رہا ہے اور گدھا پاس کھڑا اس سے کہہ رہا ہے:

"کھاؤ بھائی، کھاؤ—"

بس پھر کیا تھا، مالک کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی، ڈنڈا لےکر گدھے پر ٹوٹ پڑا اور یہ کہتے ہوئے اس کی مرمت کرنے لگا:

"اہا! یہ بات ہے! تیرا پیٹ بھر گیا ہے؟ تجھ پر حد سے زیادہ چربی چڑھ گئی ہے؟ تو اب اپنا سارا چارا اس نکمے بیل کو دے دیتا ہے؟ خیر ٹھہر، میں تجھے اس کا مزا چکھائے دیتا ہوں—"

مالک جب گدھے کا گرد و غبار خوب جھاڑ چکا تو اسی ڈنڈے سے بیل کی خبر لینے لگا—

اگلے دن مالک نے تھان پر آکر کہا:

"اچھا گدھے میاں! اب ہل کھینچنے کی آپ کی باری آئی ہے— چلئے تو سہی—"

وہ گدھے کو کھیت میں لے آیا اور اس کی گردن میں طوق لگاکر ہانکنا شروع کر دیا— گدھا سارا دن پسینے سے شرابور ہل چلاتا رہا اور بیل مزے سے پڑا دھوپ کھاتا رہا— شام کو مالک گدھے کو واپس تھان پر لے آیا اور اس کو بیل کی جگہ پر باندھ‌کر سوکھے پھیکے پھوس کا ایک گٹھا اس کے آگے ڈال دیا— بیل کو ہری ہری نرم و ملائم گھاس کھانے کو ملی— چارا ڈال‌کر مالک چلا گیا تو گدھے نے بیل سے گڑگڑاتے ہوئے کہا:

"یار! جب تم بھوکے تھے تو میں نے تم پر رحم کیا تھا— اب تم بھی میرے حال پر رحم کرو— اپنے رسیلے چارے میں سے کچھ مجھے بھی دے دو—"

بیل پر لالچ غالب آ گیا اور اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا:

"دیکھتے نہیں ہو، میرا چارا تھوڑا سا تو ہے— خود میرے لئے بھی کافی نہیں ہے—"

بیچارے گدھے کو اپنی قسمت کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا— وہ دن بھر کھیت میں ہل چلاتا اور شام کو تھکا ہارا تھان پر لوٹ‌کر آتا تو روز وہی سوکھی

گھاس اس کو کھانے کو ملتی— اور بیل تھا کہ مزے اڑائے جا رہا تھا— پہلے وہ بالکل دبلا پتلا سا تھا— اس کی پسلیاں نکلی رہتی تھیں— لیکن اب کچھ ہی دنوں میں کھا پی کر خوب موٹا تازہ ہو گیا اور بیچارہ گدھا اتنا دبلا پتلا ہو گیا کہ کسی سوکھے ہوئے درخت کا ٹھنٹھ معلوم ہونے لگا— آخرکار اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور اس نے ایک دن بیل سے کہا:

"یار! تمہی بتاؤ— اب میں کیا کروں؟ روز روز کی اس مار پیٹ اور ان اذیتوں سے کیسے چھٹکارا پاؤں؟ مالک کی مسلسل مار پیٹ سے میرا بدن چھلنی ہو گیا ہے—"

بیل نے اس کو مشورہ دیا:

"کل جب مالک تمہاری گردن میں طوق لگاکر ہانکنے لگے تو تم ٹانگیں اڑائے کھڑے رہنا— اپنی جگہ سے ہلنا تک نہیں— مالک کو تم پر رحم آ جائے گا— وہ سوچے گا کہ بیچارہ گدھا بالکل تھک گیا ہے— اور تمہیں آرام کرنے دے گا—"

اگلے دن صبح مالک نے روز کی طرح گدھے کو کھینت لاکر گردن میں طوق لگا دیا اور ہانکنے لگا تو گدھا اس طرح اڑ گیا کہ چلنے کا نام ہی نہ لیا— مالک کو غصہ آ گیا اور وہ گدھے کو ڈنڈے سے بےدردی سے مارنے لگا— گدھا مار پیٹ کی تاب نہ لا سکا اور چل پڑا۔ شام کو مالک نے اس کو تھان پر لاکر باندھ دیا تو وہ تھکا ماندا پڑے پڑے سوچنے لگا:

"نہیں— اب ایسے کام نہیں چلنے کا— میں اب یہاں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتا— کہیں بھاگ جاؤں گا—"

یہ طے کرکے وہ اٹھ کھڑا ہوا، ایک جھٹکے سے رسی توڑ لی اور باہر آکر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا—

گدھا بھاگتا جائے اور آپ آئیے، ذرا مرغ کی بات سنئے—

ایک چکی‌والے نے ایک مرغا اور کئی مرغیاں پال رکھی تھیں—لیکن وہ ان کو کھانے کو کچھ نہیں دیتا تھا— مرغا اور مرغیاں بیچارے دن دن بھر خوراک کی تلاش میں آنگن میں مارے مارے پھرتے، ادھر ادھر اکا دکا دانے مل جاتے جنہیں کھاکر وہ اپنی بھوک کی آگ ٹھنڈی کر لیا کرتے—

ایک دفعہ مرغا چکی کے اندر آ گیا اور گیہوں کے دانے چگنے لگا— "در! در! مردود!" کہہ‌کر مالک اس کو بھگانے لگا اور ایک لکڑی اٹھاکر اس پر پھینکی— وہ

لکڑی مرغ کو اس زور سے لگی کہ بیچارہ قلابازیاں کھا گیا اور درد سے "ککڑوں کوں" کرکے کراہ اٹھا— وہ بھاگ کر آنگن میں نکل آیا اور آنگن کی دیوار پھاندکر ایک طرف کو چل دیا— وہ چلا جا رہا تھا کہ راستے میں گدھا مل گیا— دونوں نے ایک دوسرے کو سلام کیا پھر گدھے نے مرغ سے پوچھا:

"بھائی مرغ! تم کہاں جا رہے ہو؟"

مرغا: "میں سوسنبیل جا رہا ہوں—"

گدھا: "وہ کیسی جگہ ہے؟"

مرغا: "وہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہری بھری چراگاہ ہے، صاف و شفاف پانی ہے اور کوئی کسی سے کچھ نہیں کہتا—"

گدھا: "تب تو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں— مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلوگے؟"

مرغا: "ہاں، ضرور لے چلوں گا— چلو چلتے ہیں—"

دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے— چلتے چلتے وہ ایک میدان میں آ گئے— آگے بڑھے جا رہے تھے کہ اچانک شہد کی ایک مکھی نے نہ جانے کہاں سے آکر گدھے کی گردن میں ڈنک مار دیا—

"اری کمبخت!" گدھے نے طیش میں آکر کہا— "آکر مجھی کو ڈنک مارنا تھا؟ مجھ میں کیا رکھا ہے تمہارے لئے میری تو ساری چربی پگھل کے بہہ چکی ہے— رس نام کو نہیں ہے— میری گردن کو گردن نہیں، کوئی سوکھی لکڑی سمجھو— چاہے جتنے ڈنک مارو تم کو کچھ نہیں ملے گا— معلوم ہوتا ہے ہماری ہی طرح تم بھی قسمت کی ماری ہو— اچھا تو آؤ، تم بھی ہمارے ساتھ چلو—"

شہد کی مکھی: "تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟"

گدھا: "ہم سوسنبیل جا رہے ہیں—"

شہد کی مکھی: "وہ کون سی جگہ ہے؟"

گدھا: "یہ وہی جگہ ہے جہاں ہری بھری چراگاہ ہے، صاف و شفاف پانی ہے اور کوئی کسی سے کچھ نہیں کہتا—"

شہد کی مکھی: "تب تو میں ضرور تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی— لیکن میں اکیلی نہیں ہوں— میرے بہت سے ساتھی سہیلیاں ہیں— کیا میں ان کو بھی بلا لاؤں؟"

گدھا: "ہاں، شوق سے بلا لو سب کو—"

کچھ ہی دیر کے بعد مرغے اور گدھے کو کچھ شور سنائی دیا— انہوں نے پیچھے مڑکر دیکھا تو شہد کی مکھیوں کا ایک بڑا سا غول اڑتا چلا آ رہا تھا—

ان سب کو سوسنبیل کی طرف چلنے دیجئے اور آئیے اب ذرا کچھ دوسروں کا حال سنئے—

ایک جگہ میدان میں صحرائی خرگوش کا جوڑا رہتا تھا— ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا— روز میاں بیوی دونوں غذا کی تلاش میں دور دور تک چلے جاتے، زمین کو جگہ جگہ کھودتے لیکن کچھ نہ ملتا تھا— دونوں بہت تھک گئے اور فاقوں سے تنگ آ گئے— بالآخر ایک دن نر نے مادہ سے کہا:

"بڑھیا! آؤ آج راستے پر چلے جائیں— شاید ہماری قسمت جاگ اٹھے اور کوئی راہ‌گیر نظر آ جائے— ہم اس سے کچھ کھانے کو مانگ لیں گے—"

وہ راستے پر نکل آئے— اچانک انہوں نے گدھے اور مرغے کو آتے دیکھا جن کے اوپر اوپر شہد کی مکھیوں کا ایک غول بادل کی طرح اڑتا چلا آ رہا تھا— وہ نزدیک آئے تو میاں بیوی نے ان سے کہا:

"بھائیو! ہم نے کئی دنوں سے کچھ نہیں کھایا ہے— از راہ کرم ہم کو کچھ کھانے کو دے دو—"

"ارے دوستو!" مرغے نے رک‌کر ان سے کہا— "تم بھی ہمارے ہی طرح بھوکے ہو؟ تم بھی ہماری طرح پیٹ پالنے کی فکر میں مارے مارے پھرتے ہو؟ کھانا چاہتے ہو تو تم بھی ہمارے ساتھ چلو—"

خرگوش: "تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟"

مرغا: "ہم سوسنبیل جا رہے ہیں—"

خرگوش: "وہ کون سی جگہ ہے؟"

مرغا: "وہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہری بھری چراگاہ ہے، صاف و شفاف پانی ہے اور کسی کا کسی سے کوئی سروکار نہیں—"

خرگوش: "تب تو ہم بھی تم لوگوں کے ساتھ چلتے ہیں—"

وہ سب ایک ساتھ چلنے لگے— تھوڑی دور گئے تھے کہ اچانک کسی کے پکارنے کی آواز سنائی دی— انہوں نے مڑکر دیکھا تو دوری پر کوئی اسی طرف دوڑتا ہوا نظر آیا— تھوڑی دیر میں وہ قریب آ گیا تو گدھا اس کو پہچان گیا— یہ اس کا ساتھی بیل تھا— بیل نے نزدیک آکر سب کو جھک‌کر سلام کیا اور پوچھا:

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟"

جانور: "ہم سوسنبیل جا رہے ہیں-"

بیل: "وہ کون سی جگہ ہے؟"

جانور: "وہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہری بھری چراگاہ ہے، صاف و شفاف پانی ہے اور کوئی کسی کو تنگ نہیں کرتا-"

بیل: "یہ بات ہے تو تم لوگ مجھ کو ساتھ لے چلو-"

جانور: "ہاں شوق سے چلو-"

سب لوگ آگے چلے- چلتے چلتے گدھے نے بیل سے پوچھا:

"جناب! آپ کو کیا ہو گیا؟ جس وقت ہم دونوں جدا ہوئے اس وقت تو آپ بڑے مزے میں تھے-"

"ارے بھائی، کچھ نہ پوچھو" بیل نے کہنا شروع کیا- "تم چلے گئے تو مالک نے مجھے لے جاکر ایک سانڈ کے مقابل کھڑا کر دیا- ہم لڑنے لگے- میں نے اس کے چھکے چھڑا دئے اور وہ بھاگ کھڑا ہوا- اس کے بعد مالک نے مجھ کو ایک اور سانڈ سے لڑایا- میں نے اس کو بھی ہرا دیا لیکن بڑی مشکل سے- اس کے بعد میں سوچنے لگا کہ اب میری خیر نہیں- یہ مجھ کو سانڈوں سے لڑاتا رہےگا اور کسی نہ کسی دن ان میں سے کوئی میری جان لےکر چھوڑےگا- ایک رات کو میں پڑا سو رہا تھا کہ میں نے خواب دیکھا کہ ایک بڑے سے سانڈ نے میرے پاس آکر بڑے رعب سے کہا:

"اہا! ہاتھ آ گئے! اب میں تمہیں سبق سکھاتا ہوں!"

یہ کہہ کر وہ مجھ پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ میں نے ذرا سا پیچھے ہٹ کر اس کے وار سے پہلے ہی اس کو اس زور سے سینگ ماری کہ وہ بلبلا اٹھا- اتنے میں میری آنکھ کھل گئی اور کیا دیکھتا ہوں کہ میرا مالک میرے سامنے زمین پر اوندھے منہ بےہوش پڑا ہوا ہے-

معلوم ہوا کہ مالک مجھے چارا دینے آیا تھا اور میں سوتے میں اس کو سینگ مار بیٹھا- وہ ہوش میں آیا تو اٹھا اور ڈنڈا لےکر مجھے دنادن مارنے لگا- مار مار کر مجھ کو لہولہان کر دیا- مجھے اتنا دکھ ہوا کہ مالک مجھ کو چھوڑکر چلا گیا تو میں کسی طرح اپنی رسی توڑ کر باہر آیا اور چل دیا جہاں سینگ سمائے-"

سب جانور ساتھ ساتھ چلتے رہے— ان کے اوپر اوپر شہد کی مکھیاں بھی اڑتی رہیں— انہوں نے بہت لمبا راستہ طے کیا اور بالآخر سوسنبیل کے ملک میں پہنچ گئے— انہوں نے دیکھا کہ ایک سرسبز و شاداب وادی ہے— صاف و شفاف ہوا ہے— ہری بھری گھاس کے میدان ہیں— بغیچوں میں خربوزے، تربوز وغیرہ پک رہے ہیں— بیلوں سے انگور کے گچھے لٹک رہے ہیں— درختوں پر خوبانیاں، سیب، ناشپاتیاں اور انواع و اقسام کے دیگر پھل پک گئے ہیں اور ٹپ ٹپ گر رہے ہیں— کھیتوں میں گیہوں، جو وغیرہ کی فصلیں لہلہا رہی ہیں— ہر چیز کی فراوانی ہے—

سب نووارد سوسنبیل میں رہنے لگے— یہاں ان کو ڈانٹنے ڈپٹنے والا، مارنے پیٹنے والا کوئی نہیں تھا— یہ سب اپنی خوشی سے محنت کرتے، جو چاھتے کھاتے اور جتنا چاھتے کھیلتے کودتے، آرام اور تفریح کرتے— بیل اور مرغا دونوں گیہوں وغیرہ کی فصلیں کاٹتے، گدھا کٹی ہوئی فصل کو ڈھوتا، خرگوش اسے گودام میں جمع کرتے جاتے اور مکھیاں پھولوں کا رس جمع کرکے شہد بناتیں— سب بڑے چین اور آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے اور یہ بھول چکے تھے کہ فکر و پریشانی کس چڑیا کا نام ہے—

سوسنبیل کے گرد و نواح میں برف سے ڈھکے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ تھے اور ان پہاڑوں پر بہت سارے بھیڑئے رہتے تھے—

ایک دن بھیڑیوں کے سردار ایک اونچے پہاڑ پر اپنے بادشاہ کے گرد جمع ہوئے اور بیٹھے بیٹھے آپس میں رونا رونے لگے کہ کیسا برا زمانہ آ گیا ہے، پہاڑوں پر جنگلی بکریوں کا نام و نشان تک نہیں رہا، آئے دن فاقے کرنے پڑتے ہیں وغیرہ وغیرہ— اتنے میں اچانک ان کے بادشاہ نے نیچے سوسنبیل کی وادی میں بیل، گدھے، مرغ وغیرہ کو گیہوں کی فصل کاٹتے ہوئے دیکھ لیا— خوشی سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں— اس نے اپنے سرداروں سے مخاطب ہوکر کہا:

"وہ دیکھو، نیچے وادی میں کباب پھر رہا ہے—"

سب بھیڑئے ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے دانت کٹکٹاتے ہوئے نیچے وادی کی طرف دیکھنے لگے— ان کے منھ سے رال ٹپکنے لگی— ان کے بادشاہ نے حکم دیا:

"دس بہادر ابھی چلے جائیں اور اس چلتے پھرتے کباب کو اٹھا لائیں—"

ایک بھیڑیا جو بڑا شیخی‌باز تھا آگے بڑھا اور اپنی دم کو ہلاتے ہوئے کہا:

"بادشاہ اعظم! بیل، گدھے اور مرغ کو پکڑ لانے کے لئے دس بھیڑیوں کے جانے کی کیا ضرورت ہے— آپ اجازت دیں تو میں اکیلا جاکر ان کو آپ کے حضور میں ہانک لاؤں—"

"ارے تم کیا کر لوگے؟" ایک دوسرا بھیڑیا کہنے لگا— "تمہاری جگہ میں جاؤں تو زیارہ اچھا رہےگا—"

بس پھر کیا تھا کہ یہ دونوں آپس میں لڑ پڑے—

"بند کرو لڑائی!" بادشاہ غصے میں آکر غرایا— "جاؤ، تم دونوں ہی چلے جاؤ— باقی لوگ کباب پکانے کی سیخیں تیار کر لیں اور آگ جلا دیں—"

دو بھیڑئیے خوشی کے نعرے بلند کرتے ہوئے وادی کی طرف دوڑ پڑے—

گدھے نے ان کو آتے دیکھ لیا اور ہانک مارکر اپنے ساتھیوں کو آگاہ کیا:

"ایں آں، ایں آں! بھیڑئیے آ رہے ہیں— بھاگو!"

یہ کہہ کر گدھا بھاگنے ہی کو تھا کہ مرغا کہہ اٹھا:

"ککڑوں‌کوں! رک جاؤ! بزدل کہیں کے! کیا تمہیں اپنی مضبوط ٹانگوں پر بھروسہ نہیں؟" یہ کہتے ہوئے وہ اچھل کر گدھے کی پیٹھ پر چڑھ گیا اور اس کو روکنے کی کوشش کرنے لگا—

"ارے اب کیا کیا جائے؟ بھیڑئیے بہت سے ہیں اور ان کے دانت لوہے کے ہیں" گدھے نے گھبراکر کہا—

"میری بات سنو!" مرغے نے کہا— "بیل کی سینگیں بڑی مضبوط ہیں— وہ بھیڑیوں کو اپنی سینگوں سے مارےگا— گدھے کے مضبوط سم ہیں— وہ ان کو دولتیاں مارےگا— شہد کی مکھیوں کے تیز تیز ڈنک ہیں— وہ ان کو ڈنک ماریں گی— خرگوش جگہ جگہ گڑھے کھود دیں گے تاکہ بھیڑئیے ٹھوکریں کھا جائیں—"

"اور تم خود کیا کروگے؟ بس چیختے چلاتے رہوگے؟" گدھے نے ڈر کے مارے تھر تھر کانپتے ہوئے طنز سے کہا—

"اور میں تم لوگوں کی رہنمائی کروں گا— تمہیں ہدایتیں دیا کروں گا" مرغ نے جواب دیا—

اتنے میں بھیڑئیے نزدیک آ گئے— ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا:

"تم اس گدھے کو پکڑو— اور میں اس بیل کو پکڑوں گا—"

اور دونوں بھیڑئیے اپنے اپنے شکار کی طرف لپکے— بیل تھوڑا سا پیچھے ہٹا اور

دوڑتے ہوئے آکر بھیڑئے کو زور سے جو سینگ ماری تو بھیڑیا سات قلابازیاں کھاکر پرے جا گرا— ادھر شہد کی مکھیاں آندھی کی طرح امڈ آئیں اور بھیڑیوں کو ڈنک مارنے لگیں— بھیڑیوں کی ناکیں، آنکھیں، زبانیں، مختصر یہ کہ ان کے بدن کا کوئی بھی حصہ مکھیوں کے ڈنکوں سے نہ بچا— آخر بھیڑیوں نے دیکھا کہ ان کی خیر نہیں، تو بھاگ کھڑے ہوئے— وہ بھاگتے ہوئے کتنی ہی بار خر گوشوں کے کھودے ہوئے گڑھوں میں گر گر گئے اور ان کی ٹانگیں ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئیں—

ادھر پہاڑ کے اوپر باقی بھیڑئے اس امید میں کہ ان کے ساتھی ابھی جانوروں کو ہانک لائیں گے، کباب کھانے کے لئے سبھی تیاریاں کرکے بیٹھے تھے— انہوں نے بہت سی سیخیں بنا لی تھیں— الاؤ جلا رکھا تھا— یہاں تک کہ پیاز کو باریک باریک کاٹ کے اس پر نمک مرچ بھی چھڑک دیا تھا— اچانک وہ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے بہادر ساتھی ہانپتے کانپتے بھاگے چلے آ رہے ہیں، ان کے سارے بدن خون سے لت پت ہیں اور سانس پھول رہی ہے—

"کیا بات ہے؟" بادشاہ نے اپنے بہادروں سے پوچھا—

"بادشاہ اعظم!" وہ دونوں ہانپتے کانپتے کہنے لگے— "وہاں کباب نہیں پھر رہا تھا جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا— وہاں تو بھیڑیوں کی موت ناچتی پھر رہی تھی—" اور انہوں نے نیچے وادی میں جو کچھ دیکھا اور جھیلا وہ سب اپنے بادشاہ کو بتا دیا—

دونوں بہادروں میں سے ایک نے کہا:

"وہاں نیچے خود موت کا فرشتہ عزرائیل گھومتا پھرتا ہے— اس نے ہاتھ میں لوہے کا ایک بڑا بھاری ڈنڈا پکڑ رکھا ہے اور جس کو بھی اس ڈنڈے سے مارتا ہے وہ سات قلابازیاں کھاکر زمین پر بےہوش گر پڑتا ہے—"

"ارے معلوم ہوتا ہے تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا" دوسرے بہادر نے کہا— "ان کے ساتھ ایک پہلوان ہے جس کی آواز بالکل بگل کی طرح ہے اور ہاتھ لوہے کے ہیں— وہ جس کے مکا مار دیتا ہے وہ سات قلابازیاں کھائے بغیر سنبھل نہیں پاتا—"

"ارے معلوم ہوتا ہے تم نے ان جیالے سپاہیوں کو نہیں دیکھا جو اپنی تیز نوکدار برچھیاں بدن میں یوں گاڑتے ہیں کہ خارش اور درد سے تڑپ کر رہ جاؤ—"

"وہ تو اپنے گورکن بھی ساتھ لائے ہیں— ان گورکنوں نے ہمارے لئے دس دس

قبریں کھود ڈالی تھیں- ہم ان میں گر گر جاتے تھے- ہماری ٹانگیں ٹوٹتے ٹوٹتے بچیں-"

"ان کے ساتھ ایک بگل بجانےوالا بھی تھا- وہ ایک درخت پر چڑھا بیٹھا تھا اور اس زور سے بگل بجا رہا تھا کہ ہمارے کانوں کے پردے پھٹتے پھٹتے رہ گئے-"

یہ باتیں سن کر سب بھیڑئے خوف سے تھرتھر کانپنے لگے- ان کا بادشاہ بھی گھبرا گیا-

"اب ہم کیا کریں؟" بادشاہ نے اپنے سرداروں سے پوچھا- "کیوں نہ ہم سب ایک ساتھ ان پر هله بول دیں!"

"بادشاہ اعظم! ایسا کرنا مناسب نہیں" بھیڑئے تھرتھر کانپتے ہوئے کہنے لگے- "معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی بلائے ناگہانی ہیں کہ دنیا بھر کے بھیڑئے یکجا ہو جائیں تو بھی وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے-"

"تب تو خیر اسی میں ہے کہ ہم جلدی یہاں سے کھسک جائیں" بھیڑیوں کے بادشاہ نے کہا- یہ کہہ‌کر اس طرح بھاگ کھڑا ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا- باقی سب بھیڑئے بھی کباب پکانے اور کھانے کے اپنے تمام ساز و سامان کو چھوڑ چھاڑ کے اپنے بادشاہ کے پیچھے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے-

سوسنبیل میں بھیڑیوں کا نام و نشان نہ رہا- ہمارے سب جانور پھر بڑے چین اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے اور اپنی مرادیں پا گئے-

# ظالم بادشاہ

کسی زمانے میں ایک ملک میں ایک ظالم بادشاہ حکومت کرتا تھا- ایک دفعہ اس نے یہ فرمان جاری کیا:

"کسی گھر میں کوئی مر جائے تو گھروالے مردے کو چھتوں پر سے قبرستان پہنچائیں- جو کوئی حکم عدولی کرے گا اس کو قتل کر دیا جائے گا-"

اس ملک میں ایک بہت ہی بوڑھا آدمی رہتا تھا جس کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے اور جو لوگوں کو قصے کہانیاں سناتا پھرتا تھا- وہ ایک دن بادشاہ کے پاس آیا اور اس سے کہا:

"اے بادشاہ! ظلم و تشدد، افلاس اور فاقوں سے لوگ یوں ھی تنگ آ چکے تھے۔ اس پر آپ نے ایک اور احمقانہ فرمان جاری کر دیا ھے۔ مرنےوالوں کو دفن کرنے کے لئے لوگ ھفتہ ھفتہ بھر اور دس دس دن تک مصیبتیں برداشت کرنے لگے ھیں۔ لوگوں کو اس طرح ستاکر آپ کو کیا مزا ملتا ھے؟"

بادشاہ آگ بگولہ ھو گیا اور اس نے کڑک کر کہا:

"کہتے ھیں کہ سفید ریش بوڑھے دانشمند ھوتے ھیں۔ یہ سفید جھوٹ ھے۔ یہ بوڑھا طوطا جس کی عقل چرنے جا چکی ھے، مجھے عقل سکھانے آ پہنچا ھے۔ اس کو پکڑکر ابھی قتل کر دیا جائے۔"

اس کے بعد بادشاہ نے ایک نیا فرمان جاری کیا:

"جن کی داڑھیاں سفید ھوں ان سب کو قتل کر دیا جائے۔"

بادشاہ کے سپاھی گھرگھر گھوم کر سفیدریش بوڑھوں کو ڈھونڈنے اور ان کو قتل کرنے لگے۔ کچھ بوڑھے اپنی جانیں بچاکر تہہخانوں میں اور اسی قسم کی خلوت کی جگھوں میں چھپ گئے۔

ایک دن ظالم بادشاہ نے پڑوس کے کسی ملک پر لشکرکشی کرنے کا تہیہ کر لیا اور اس نے حکم دیا کہ جن سپاھیوں کی عمریں تیس سے اوپر نہ ھوں وہ سب میدان‌جنگ میں جانے کے لئے تیار ھو جائیں اور جن کی عمریں تیس سال سے اوپر جا چکی ھوں ان کو رھنے دیا جائے کیونکہ ان میں زیادہ طاقت نہیں ھے۔"

بادشاہ کے ایک وزیر تھا۔ اس نے آکر بادشاہ سے کہا:

"بادشاہ عالم! آپ یہ کیا کر رھے ھیں؟ لشکرکشی کی کیا ضرورت آ پری ھے؟ یوں بھی تو کتنے ھی لوگ خواہ مخواہ موت کے گھاٹ اتر چکے ھیں۔"

لیکن بادشاہ یہ برداشت ھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی اس کی بات کا جواب دے۔ چنانچہ وہ وزیر پر برس پڑا:

"احمق! تم کیا خاک سمجھتے ھو! مجھ سے بحث مت کیا کرو۔ پھر کبھی ایسا کیا تو تمھارے منہ میں پگھلا ھوا سیسہ بھروا دوں‌گا۔"

بادشاہ کے فوجیوں میں ذاکر نام کا ایک نوجوان تھا۔ اس کا باپ بوڑھا تھا جس کی عمر اسی سال کی ھو چکی تھی۔ جن دنوں بادشاہ نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ سفید ریش بوڑھوں کو قتل کر دیا جائے ان دنوں ذاکر نے اپنے باپ کو ایک جگہ چھپا

دیا تھا– اب جب جنگ پر جانے لگا تو ذاکر اپنے باپ کو الوداع کہنے کے لئے اس کے
پاس آیا– بوڑھے نے اپنے بیٹے سے کہا:

"بیٹے! اب چلے جاؤگے اور پھر جانے لوٹ کر آؤ کہ نہ آؤ– تمھارے سوا میرا
کون ھے جو میری خبرگیری کرے– جب تک تم باھر رھوگے میں یہاں اکیلے کیسے
زندہ رھوں گا؟ بہتر ھوگا کہ تم بادشاہ سے جاکر کہو کہ وہ مجھے مروا ڈالے– تم مجھ کو
دفن کرکے پھر چلے جانا– نہیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے چلو–"

اپنے باپ کو اس حالت میں چھوڑکر چلے جانے کو ذاکر کا جی نہ چاھا– اس
نے ایک صندوق بنوایا اور بوڑھے کو اس کے اندر چھپاکر اپنے ساتھ لے گیا–

بادشاہ اپنی فوج کو لےکر ایک لمبے سفر پر نکل گیا– وہ چلتے چلتے ایک
اونچے پہاڑ کے دامن میں پہنچے– وھاں ایک بڑا دریا ملا جس کا پانی شور مچاتا اور
جھاگ اڑاتا ھوا بہہ رھا تھا– بادشاہ نے حکم دیا کہ اسی دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالا جائے–

چاندنی رات تھی– بادشاہ کنارے پر بیٹھا دریا کے صاف شفاف پانی کو تک
رھا تھا کہ اچانک اس نے ایک عجیب منظر دیکھا– دریا کی تہہ میں دو ھیرے کچھ اس
طرح چمک رھے تھے جس طرح اندھیری رات میں تابناک تارے چمکتے ھیں– بادشاہ نے
فوراً اپنے ایک فوجی کو بلاکر حکم دیا:

"دریا میں غوطہ لگاکر ان ھیروں کو نکال لاؤ–"

اس فوجی نے دریا میں غوطہ لگایا لیکن پھر باھر آنا اسے نصیب نہ ھوا– بادشاہ
نے ایک اور فوجی کو پانی میں اتارا– وہ بھی دریا کی گہرائیوں میں کھوکر رہ گیا–
پھر تیسرے فوجی کو دریا میں اتارا گیا– اس کا بھی یہی حشر ھوا– اس طرح کتنے
ھی آدمیوں کو پانی نے نگل لیا– ذاکر کی باری آنے کو تھی تو وہ دوڑکر اپنے
باپ کے پاس گیا اور روتے ھوئے اس سے کہا:

"اباجان! الوداع! مجھ سے جو خطا ھوئی ھو اس کو معاف کر دیجئے گا–"

"کیا بات ھے، بیٹے؟" بوڑھے نے پریشان ھوکر پوچھا– ذاکر نے سارا حال اس
کو سنا دیا– بوڑھا کچھ دیر تک سوچتا رھا پھر اس نے بیٹے سے پوچھا:

"بتاؤ تو سہی، دریا کے کنارے پر کوئی درخت ورخت تو ھے؟"

"جی ھاں، اباجان، درخت ھے" ذاکر نے جواب دیا–

"تب تو ھیرے دریا کے اندر نہیں ھیں" بوڑھے نے کہا– "وہ درخت کے اوپر
ھیں– پانی میں بس ان کا عکس پڑ رھا ھے– بیٹے، تم اس جگہ کو اچھی طرح دیکھ بھال

لو اور جب تمہاری باری آئے تو تم دوڑکر اس درخت پر چڑھ جانا۔ ہیرے چڑیوں کے کسی گھونسلے میں پڑے ہوں گے۔ تم ان کو اٹھاکر اپنی کمر کے پٹکے میں رکھ لینا اور پھر پانی میں کود پڑنا۔"

ذاکر اپنے باپ کے پاس سے چل کر کنارے پر گیا۔ بادشاہ نے اس کو پانی میں کودنے کی ہدایت کی۔

ذاکر دوڑتا ہوا درخت کے پاس آیا اور اس پر چڑھنے لگا۔ یہ دیکھکر بادشاہ نے کڑک کر پوچھا:

"اے! یہ تم درخت پر کیوں چڑھ رہے ہو؟"

ذاکر نے جواب دیا:

"بادشاہ عالم! میں درخت پر سے پانی میں کودنا چاہتا ہوں۔ تب میں ہیروں کو ضرور نکال لاؤں گا۔"

اوپر چڑھکر ذاکر نے دیکھا تو ہیرے ایک گھونسلے کے اندر پڑے چاندنی میں جگمگا رہے تھے۔ اس نے فوراً ان کو اٹھاکر اپنی کمر کے پٹکے میں رکھ لیا اور چھلانگ مارکر پانی کے اندر غائب ہو گیا۔ اس سے پہلے جس وقت ذاکر اپنے باپ کے پاس گیا ہوا تھا بادشاہ نے اعلان کیا تھا کہ جو کوئی پانی سے خالی ہاتھ نکل آئے گا اس کی کھال اتار لی جائے گی۔ لیکن ذاکر پانی سے کنارے پر نکل آیا اور اس نے ہیرے بادشاہ کی طرف بڑھا دئے۔

بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے ذاکر کو شاباشی دےکر اپنے ہاتھ سے اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔

صبح کو بادشاہ کی فوج دریا کے کنارے کنارے آگے چل پڑی۔ وہ چلے جا رہے تھے کہ ایک جگہ چیونٹیوں کی ایک فوج سی نظر آئی۔ بادشاہ نے اپنے لوگوں سے پوچھا:

"یہاں اتنی چیونٹیاں کہاں سے آ گئیں؟ یہ آخر یہاں بھاگ دوڑ کیوں کر رہی ہیں؟"

کوئی اس کے سوال کا جواب نہ دے سکا تو بادشاہ نے اعلان کیا:

"میں روز دو آدمیوں سے یہی سوال کیا کروں گا۔ جس کا جواب مجھے پسند آئے گا اس کی تعریف کروں گا اور جس کا جواب پسند نہ آئے گا اس کو قتل کروا دوں گا۔"

بادشاہ کا یہ حکم سن کر ذاکر پھر دوڑکر اپنے باپ کے پاس گیا اور سارا حال اس کو سنا دیا— کچھ دیر سوچنے کے بعد بوڑھے نے کہا:

"تم بادشاہ کے پاس جاکر اس سے کہنا کہ میں آپ کے سوال کا جواب دینا چاهتا هوں— پھر تم اس سے کہنا کہ دریا کی تہہ میں ایک گھڑا پڑا هوا هے جس کے اندر پہلے تیل تھا— اگر بادشاہ نے حکم دیا کہ وہ گھڑا نکال لاؤ تو تم کہنا کہ اچھی بات هے— پھر کسی درخت پر چڑھ جانا اور وهاں سے بادشاہ کو تیر مارنا— تیر خوب اچھی طرح نشانہ سادھکر چلانا تاکہ وہ بادشاہ کے ٹھیک منہ میں لگے اور وہ وهیں ٹرپکر مر جائے— ایک ملعون کی وجہ سے کتنے هی آدمی اپنی جانیں گنوا رهے هیں—"

ذاکر اپنے باپ کے پاس سے اٹھکر سیدھے بادشاہ کے پاس پہنچا اور اس سے کہا:

"بادشاہ عالم! آپ کے سوال کا میں جواب دوں‌گا— یہاں دریا کی تہہ میں کوئی گھڑا پڑا هوا هے جس میں پہلے تیل تھا— اس کی بو پاکر یہاں چیونٹیاں گھوم پھر رهی هیں—"

بادشاہ کو بڑا غصہ آیا اور اس نے کڑککر کہا:

"احمق! گھڑا دریا کی تہہ میں پڑا هے اور چیونٹیاں یہاں اوپر دوڑ بھاگ رهی هیں— یہ کیسی بےتکی بات کر رهے هو!" یہ کہہکر اس نے جلاد کو پکارا— لیکن جلاد کے آنے سے پہلے هی ذاکر نے بادشاہ سے کہا:

"بادشاہ عالم! اگر آپ اجازت دیں تو میں اس گھڑے کو نکال لاؤں—"

"اچھا چلو، نکال لاؤ" بادشاہ نے کہا—

ذاکر دوڑکر ایک درخت پر چڑھ گیا— وہ درخت کی ایک شاخ پر آرام سے بیٹھ گیا اور وهاں سے نشانہ سادھکر ایک تیر جو مارا تو وہ آکر بادشاہ کے ٹھیک منہ میں لگا اور اس کے کان کو چیرتا هوا نکل گیا— بادشاہ گر پڑا اور جان بحق هو گیا—

ذاکر درخت سے نیچے اترا تو اس کے فوجی ساتھی دوڑکر اس کے پاس آئے اور اس سے بغلگیر هوکر انتہائی مسرت سے کہنے لگے:

"شاباش! تم نے بہت هی اچھا کام کیا— دنیا کو اس بلائے بےدرمان سے چھٹکارا دلا دیا—"

ذاکر نے جواب دیا:

"یہ کام میں نے نہیں، میرے بوڑھے باپ نے کیا ہے۔"

سب فوجی اکٹھا ہوکر بوڑھے کے پاس آئے۔ انہوں نے ظالم بادشاہ سے چھٹکارا دلانے کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا اور بڑی عزت و احترام کے ساتھ اس سفیدریش دانشمند بوڑھے کو اپنا سردار چن لیا۔

# حُسن آباد

کسی زمانے کی بات ہے، کسی جگہ ایک ظالم بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے ایک بیٹی تھی جس کا نام حسن آباد تھا۔ وہ بیحد خوبصورت تھی۔ حسن و رعنائی میں نہ چاند اس کی برابری کر سکتا تھا نہ سورج۔ چاند اس کے چہرے سے مات کھاتا تھا تو سورج اس کی آنکھوں سے۔ بہت سے ملکوں سے لڑکی کے لئے شادی کے پیغام آتے لیکن بادشاہ سب کو صاف جواب دیتا تھا۔

حسن آباد کی ماں ایک غریب آدمی کی بیٹی تھی اور بادشاہ اپنی بیوی کو ہر وقت یہ کہہ کر طعنے دیتا رہتا تھا کہ "تم ایک بادشاہ کی بیوی ہونے کے ناطے اچھا کھاتی پیتی اور اچھا پہنتی ہو۔ کسی غریب کی بیوی بنی ہوتیں تو روٹی کے بدلے مٹی چبایا کرتیں۔"

حسن آباد کی ماں بیچاری بادشاہ کے طعنے سن کر بہت روتی تھی۔ ایسے موقعوں پر لڑکی اپنی ماں سے کہتی:

"امی جان! آپ ہرگز کسی امیر آدمی سے میری شادی نہ کیجئے گا۔ میری شادی کسی غریب ہی سے کر دیجئے گا۔ قسمت نے ساتھ دیا تو میں خود اپنے شوہر کو بادشاہ بنا دوں گی۔ میں اس کو اپنے باپ کی جگہ تخت پر بٹھا دوں گی اور اس سے سبھی غریبوں کا بھلا ہوگا۔"

ایک دن بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً ایک کوا کہیں سے اڑکر آیا اور کھڑکی کے سامنے کے درخت پر بیٹھکر زور زور سے "کاؤں کاؤں" کرنے لگا— بادشاہ نے فوراً اپنے چار سو صلاح‌کار کو جمع کیا اور ان سے پوچھا:

"یہ کوا کیا کہتا ہے؟"

صلاح‌کار بڑی دیر تک سوچتے رہے اور پھر انہوں نے بادشاہ سے کہا:

"بادشاہ عالم! اس کی بولی ہماری سمجھ میں نہیں آئی— یہ ٹھہرا ایک کوا— اور ہم انسان ہیں— شاید اس کو کچھ تفریح کرنے سوجھی ہے— بس اسی لئے "کاؤں کاؤں" کر رہا ہے—"

"جلاد!" بادشاہ نے آگ بگولہ ہوکر آواز دی— اسی وقت چودہ جلاد سیاہ گدھوں کی طرح آ موجود ہوئے اور ایک آواز میں کہہ اٹھے:

"کس کی موت آئی ہے؟ ہم پلک جھپکتے میں اس کا سر بدن سے جدا کر دیں گے—"

"ان سب کو لے جاکر گردنیں کاٹ دو" بادشاہ نے حکم دیا—

اتنے میں حسن‌آباد دوڑکر باپ کے پاس آئی اور اس نے کہا:

"اباجان! اگر میں آپ کے سوال کا جواب دے دوں تو کیا آپ ان کو چھوڑ دیں گے؟"

"ہاں، اگر تم نے جواب دیا تو میں ان کو چھوڑ دوں‌گا" بادشاہ نے جواب دیا—

"تو سنئے" حسن‌آباد نے کہا— "یہ کوا کہتا ہے کہ جو شوہر کو آسمان پر اٹھا دے وہ بیوی ہے اور جو اس کو مٹی میں ملا دے وہ بھی بیوی ہے—"

یہ سن‌کر بادشاہ کو اتنا غصہ آیا، اتنا غصہ آیا کہ اس کے سر کا ایک ایک بال سوئی کی طرح کھڑا ہو گیا اور اس نے گرجتے ہوئے اپنی بیٹی سے کہا:

"نالائق لڑکی! بےشرم کہیں کی! کیا تیرا مطلب ہے کہ میرا سارا سکھ چین تیری ماں کی بدولت ہے جو ایک کنگال کی بیٹی ہے— کیا بکواس ہے! میں تجھ کو زنداں میں ڈال دوں‌گا تاکہ سب لڑکیاں اس سے سبق سیکھیں، اپنے باپ کے آگے اپنا منہ نہ کھولا کریں—"

بادشاہ نے حسن‌آباد کو زنداں میں ڈال دیا اور اپنے صلاح‌کاروں کو چھوڑ دیا— اس کے بعد وہ ایک مہینے تک منہ کالا کئے اداس اداس خیالوں میں غرق اندر بیٹھا رہا— ایک دن اس کے بڑے وزیر نے اس کو سمجھایا:

"جہاں پناہ! آپ یوں اندر ہی اندر نہ بیٹھے رہیں— ذرا اپنا دل بہلانے کی کوشش کریں— آئیے کہیں شکار کھیلنے چلیں—"

وزیر کے مشورے پر بادشاہ اپنے تمام چار سو صلاح‌کاروں اور چالیس وزیروں کو ساتھ لےکر شکار کھیلنے نکل گیا— شکاری سات دن تک شکار کی تلاش میں گھومتے پھرے لیکن کچھ ان کے ہاتھ نہ آیا—

بادشاہ کو بہت دکھ ہوا— وہ لوگ چلے جا رہے تھے کہ کچھ دوری پر ایک دریا دکھائی دیا— وہ چلتے ہوئے اس کے کنارے پر آئے تو دیکھا کہ ایک سفیدریش بوڑھا کنارے پر بیٹھا ہے— وہ پانی سے چھوٹے چھوٹے پتھر نکالتا ہے اور ان پر کچھ لکھ‌کر پھر پانی میں ڈال دیتا ہے—

بادشاہ نے اس سے پوچھا:

"اے بوڑھے! تم کون ہو اور یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟"

بوڑھا: "میں ایک غریب آدمی ہوں— بھلا میں بادشاہ سے کیسے بولوں—"

بادشاہ: "میرے سوال کا جواب دو— ورنہ ابھی تلوار سے تمہارے دو ٹکڑے کر دوں‌گا—"

بوڑھا: "میں لوگوں کی قسمتیں بتا رہا ہوں—"

بادشاہ: "اچھا! تو یہ بتاؤ کہ میری سرکش بیٹی کی قسمت کیسی ہے—"

بوڑھے نے پانی میں ہاتھ ڈال‌کر مٹھی بھر کنکر نکالے اور ان کو دیکھتے ہوئے کہا:

"ایک ملک میں جس کا نام شہر جرجان ہے، ایک بہادر نوجوان رہتا ہے— وہ ایک غریب چرواہے کا بیٹا ہے— اسی غریب نوجوان کے ساتھ تمہاری بیٹی کی شادی ہوگی—"

بادشاہ نے جس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا پوچھا:

"اس ملک تک کتنے دنوں کا راستہ ہے؟"

"کسی اچھے گھوڑے پر سفر کیا جائے تو اٹھارہ مہینے لگیں‌گے" بوڑھے نے جواب دیا—

گھر لوٹنے پر بادشاہ تین دن تک برابر سوچتا رہا کہ "کیا کیا جائے تاکہ میری بیٹی اس ادنی چرواہے کو نہ ملے، اس کو بھوکوں مار ڈالوں یا اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں؟"

بڑے وزیر کو بادشاہ کے ان سیاہ منصوبوں کا پتہ چل گیا۔ اس کو لڑکی پر رحم آ گیا۔ چنانچہ رات کو وہ اس کو زنداں سے نکال کر اپنے گھر لے آیا۔ اگلے دن اس نے ایک بڑھئی کو بلایا اور اس کو بہت سے پیسے دے کر اس سے کہا:

"ایک ایسا صندوق بنا دو جس کے اندر کسی طرح پانی نہ جا سکے۔"

صندوق بن کر تیار ہو گیا تو وزیر نے حسن‌آباد سے کہا:

"بیٹی! آؤ، اس صندوق میں لیٹ جاؤ۔ میں چالیس دنوں کی خوراک رکھکر صندوق کو دریا میں ڈال دوں گا۔ تمہاری قسمت میں جینا لکھا ہے تو بہرحال جیوگی۔ بادشاہ کی تلوار سے یا زنداں میں پڑے پڑے مر جانے سے کہیں اچھا ہے کہ تم کہیں بھیڑ بکریاں چرایا کرو۔"

لڑکی صندوق میں بیٹھ گئی۔ وزیر نے صندوق بند کرکے آدھی رات کے وقت اس کو دریا میں ڈال دیا۔

صندوق دریا میں تین مہینوں تک بہتا رہا۔ لڑکی نے ایک ایک دن کی خوراک چار چار دن کھاکر اپنے آپ کو کسی طرح جلائے رکھا۔

ایک ملک میں قارا شاہ نام کا ایک بادشاہ تھا۔ وہیں ایک بوڑھا آدمی بھی رہتا تھا جس کے بہت سارے پوتے تھے لیکن گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ پہاڑی جنگل سے بادشاہ کے لئے لکڑیاں اکٹھا کرکے لایا کرتا تھا۔

وہ ایک دن اپنی کلہاڑی کندھے پر رکھے اور رسی کمر کے گرد لپیٹے لکڑیاں جمع کرنے کے لئے شہر سے باہر نکل آیا۔ اس نے لکڑیوں کا ایک گٹھا جمع کر لیا اور واپس جانے ہی والا تھا کہ اسے شدید پیاس محسوس ہوئی۔ پاس ہی ایک دریا بہتا تھا۔ وہ لکڑیوں کا گٹھا وہیں چھوڑکر پانی پینے کے لئے دریا پر آیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ دریا میں کنارے کنارے ایک صندوق بہتا چلا آ رہا ہے۔ وہ فوراً اپنے کپڑے اتارکر پانی میں اترا اور صندوق کو کھینچتا ہوا کنارے پر لے آیا۔ اس نے چاروں طرف سے خوب دیکھا بھالا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کو کس طرح کھولا جائے۔ تب اس نے اپنی کلہاڑی سے صندوق کے ڈھکنے میں ایک سوراخ بنایا اور اندر جھانکا تو وہاں ایک نہایت حسین لڑکی لیٹی ہوئی نظر آئی۔ بوڑھا دنگ رہ گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ شاید کسی سوداگر کی بیٹی ہوگی۔ باپ کے ساتھ سفر پر نکلی ہوگی۔ جہاز ڈوب گیا ہوگا اور صندوق پانی کے اوپر رہ گیا ہوگا۔

"اے لڑکی! تم زندہ ہو کہ مردہ؟" بوڑھے نے لڑکی کو آواز دی۔

"میں زندہ ہوں" حسن‌آباد نے اندر سے جواب دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

بوڑھا سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ اگر صندوق کو چھوڑ کر لکڑیاں محل میں لے جاؤں گا مجھے تو ان کے عوض بادشاہ سے بیس تنگے سے زیادہ نہیں ملیں گے اور لکڑیوں کو چھوڑ دوں اور صندوق کو اٹھاکر محل میں لے جاؤں تو اس کا کچھ بھی نہیں ملےگا۔ بہتر یہ ہے کہ صندوق کو بازار لے جاکر بیچ دوں۔ آخر کس کو پتہ چلےگا کہ اس کے اندر کیا ہے۔

یہ طے کرکے بوڑھا صندوق کو لےکر بازار پہنچا۔ وہ ابھی بازار میں داخل ہی ہوا تھا کہ قاراشاہ ادھر آ نکلا اور اس کو دیکھ لیا۔

"لکڑیاں کہاں ہیں؟" اس نے کڑک کر بوڑھے سے پوچھا۔ "میری لکڑیوں کی فکر نہ کرکے تم کسی کے ہاں چوری کرنے گئے اور صندوق اٹھا لائے ہو؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی تلوار کھینچ لی اور اس سے بوڑھے کے دو ٹکڑے کر ڈلے پھر اس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ صندوق کو اٹھاکر محل لے چلو۔"

محل میں صندوق کو کھولا گیا تو حسن‌آباد کا حسن دیکھ کر بادشاہ اس پر لٹو ہو گیا اور اسی وقت لڑکی سے کہا کہ "مجھ سے شادی کر لو۔"

حسن‌آباد رو پڑی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا: "میں تو کسی غریب سے شادی کرنے کا عہد کر چکی ہوں۔ اب کیا کروں؟" پھر اس نے بادشاہ سے کہا:

"آپ مجھے چالیس دنوں کی مہلت دیجئے۔ میں برابر تین مہینے تک صندوق کے اندر پڑی رہی ہوں۔ تنگ آ گئی ہوں، تھک گئی ہوں۔ اب ذرا آرام کر لوں، لڑکیوں کے ساتھ کھیل لوں، تفریح کر لوں۔"

"تم نے ابھی اسی دم مجھ سے شادی نہ کی تو میں تم کو مار ڈالوں‌گا" قاراشاہ نے دانت پیس کر کہا۔

تو پھر کم سے کم تین دنوں کی چھٹی دیجئے" لڑکی نے گڑگڑاکر کہا۔

"تمہارے آرام اور تفریح کے لئے ایک ہی دن کافی ہے" قاراشاہ نے سختی سے کہا اور حسن‌آباد کو چھوڑ دیا۔ چالیس لڑکیوں کو اس کے ساتھ کر دیا اور ان کو تاکید کر دی کہ وہ اس پر برابر نگاہ رکھیں، ایک لمحے کے لئے بھی اس کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

حسن‌آباد چالیس لڑکیوں سے گھری ہوئی بادشاہ کے باغ میں آئی۔ باغ کے اس طرف دریا بہتا تھا۔ حسن‌آباد نے لڑکیوں سے کہا کہ چلو، چل کے دریا میں نہائیں۔ وہ

سب دریا کے کنارے آئیں۔ حسن آباد جونہی پانی میں اتری ایک ہیبتناک مچھلی جانے کہاں سے آ نکلی اور لڑکی کو نگل کر پھر پانی میں غائب ہو گئی۔

لڑکیاں دوڑی ہوئی محل میں آئیں اور بادشاہ کو اس حادثے کی اطلاع دی۔

یہ خبر سنتے ہی قاراشاہ کراہ اٹھا۔ اس نے اپنا تاج، سونے کی پیٹی، شاہی لباس سب اتار اتارکر فرش پر پھینک دیا اور محل چھوڑکے شہر سے نکل کر بیابانوں کی طرف چلا گیا۔

اب آئیے شہر جرجان کا حال سنئے۔

ایک دن دریا کے کنارے پر ایک نوجوان چرواہا بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ کچھ ماہی‌گیر دریا میں جال ڈال‌کر مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے۔ چرواہے نے ماہی‌گیروں کو اپنا دکھڑا سناتے ہوئے کہا:

"میرے باپ اور میں دونوں بھوکے ہیں۔ شہر جاکر روٹی لانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ باپ بیمار ہیں اور میں یہاں بھیڑ بکریوں کو چرانے میں مصروف ہوں۔ میں ان کو چھوڑکر کہیں نہیں جا سکتا۔ تم لوگ مجھے کوئی مچھلی دے دینا۔ میں اسے لے جاکر اپنے باپ کو کھلا دوں‌گا۔"

"اچھی بات ہے" ماہی‌گیروں نے کہا۔ "اب کی جو کچھ جال میں آئےگا وہ تمہارا ہے۔"

یہ کہہ‌کر انہوں نے اپنا جال کھینچا تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس میں ایک بہت ہی بڑی مچھلی پھنسی ہے۔ انہوں نے وہ مچھلی چرواہے کو دے دی۔ چرواہے نے اس کو اٹھانا چاہا تو اٹھا نہ سکا۔ اتنی وزنی تھی وہ مچھلی۔

نوجوان پانچ بیلوں کی مدد سے کھینچتا ہوا اس کو اپنے گھر لایا۔ مچھلی کو اپنے باپ کے پاس چھوڑکر وہ خود پھر اپنی بھیڑ بکریوں کے پاس لوٹ گیا۔

بوڑھا مچھلی کو پاکر بہت خوش ہوا۔ اس نے چھری سے اس کا پیٹ چیرا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہاں ایک لڑکی پڑی ہوئی ہے۔ بوڑھے نے لڑکی کے منھ میں پانی کے قطرے ٹپکائے۔ لڑکی کو ہوش آ گیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بوڑھے کو جھک‌کر سلام کیا۔ پھر اس نے کہا:

"بابا، مجھے بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کو دیجئے۔"

بوڑھے نے مچھلی کا ایک ٹکڑا کاٹا اور اسے تل‌کر لڑکی کو دیا۔ اس نے مچھلی کھا لی اور پھر بوڑھے سے پوچھا:

"بابا، آپ کیا کام کرتے ھیں؟"

"میں چرواھا تھا" بوڑھے نے بتایا۔ "اب بوڑھا ھو گیا ھوں۔ اب یہ کام میری جگہ میرا بیٹا کرتا ھے۔"

یہ سن‌کر لڑکی بےحد خوش ھوئی اور جوش سے کہہ اٹھی:

"میری مراد پوری ھو گئی! بابا، اگر آپ کہیں تو میں آپ کے بیٹے سے شادی کر لوں۔ میری ماں بھی ایک غریب گھرانے کی بیٹی تھیں۔"

"شادی کے لئے ھمارے پاس روپیے کہاں؟" بوڑھے نے کہا۔

"کوئی بات نہیں" لڑکی نے جواب دیا۔ "جب میں اپنی مرضی سے شادی کر رھی ھوں تو لوگوں کو دعوت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ھے۔"

بوڑھے نے اسی دن حسن‌آباد کے ساتھ اپنے بیٹے کا نکاح پڑھوا دیا۔

نکاح کے اگلے دن صبح حسن‌آباد نے اپنے سر کے بال ایک رومال تلے چھپا لئے اور آستینیں چڑھاکر گھر کے کام کاج میں لٹ گئی۔ وہ دیگچی کے پاس آئی تو دیکھا کہ دیگچی پر میل کی اتنی موٹی تہہ جم گئی ھے کہ اس کے دونوں کنڈے ایک دوسرے سے ملتے ملتے رہ گئے ھیں۔ باقی برتنوں کا بھی یہی حال تھا۔ حسن‌آباد نے کھرچ کھرچ‌کر مانج مانج کر ان سب کو چمکا دیا۔ پھر اس نے گھر کے آنگن میں جھاڑو دےکر اسے صاف ستھرا کر دیا۔ سب میلے کپڑے دھو ڈالے۔ یہ سب دیکھ‌کر بوڑھے کا دل دن کی طرح روشن ھو گیا۔ وہ اٹھ‌کر اپنی بہو کے پاس آیا اور بڑی محبت سے اس سے کہا:

"جگ جگ جیو بیٹی! میں بوڑھا ھو چکا ھوں۔ مجھ سے گھرگرھستی کا کوئی کام نہیں ھو پاتا۔ اور میرا بیٹا پو پھٹتے ھی چلا جاتا ھے اور اندھیرا ھوتے گھر لوٹتا ھے۔ لیکن ھم کتنے خوش‌قسمت ھیں کہ تم ھم کو مل گئیں۔ یہ دیکھ‌کر کہ تم اتنی محنت کرتی ھو، میرا بھی جی چاھتا ھے کہ تمہاری کچھ مدد کروں۔ مجھے بھی کوئی کام بتاؤ نا۔"

حسن‌آباد نے اپنے ایک کان کا بالا اتارا اور اس کو بوڑھے کے ھاتھ میں دیتے ھوئے اس سے کہا:

"آپ اس کو بازار لے جائیے۔ کوئی اس کا دام پوچھے تو کہہ دیجئے کہ تم خود ایمانداری سے کچھ دے دو۔ وہ جتنا دے اتنے ھی میں اس کو بیچ دیجئے۔"

بوڑھا بالے کو لےکر بازار پہنچا۔ عین اس وقت بڑے بڑے سوداگر مال خریدنے بازار

آئے ہوئے تھے- ایک سوداگر نے دیکھا کہ ایک بوڑھا ایک نہایت خوبصورت بالے کو ہاتھ میں لئے کھڑا ہے- اس نے بوڑھے کے پاس آکر پوچھا:

"بابا، اس کے کیا دام ہیں؟"

"آپ خود ایمان‌داری سے کچھ دے دیجئے" بوڑھے نے جواب دیا-

سوداگر نے ایک ہاتھ لمبی ایک صندوقچی سونے سے بھرکر بوڑھے کو دیتے ہوئے پوچھا:

"یہ کافی ہے یا کچھ اور دوں؟"

"میں نے تو کہہ دیا کہ خود ایمانداری سے کچھ دے دیجئے" بوڑھے نے جواب دیا-

سوداگر نے ایک تھیلی بھر سونا اور دیا اور اس ساری دولت کو لادکر گھر لے جانے کے لئے اپنے گدھے کو بھی دے دیا- بوڑھے نے دل میں سوچا:

"یہ میرا مذاق اڑا رہا ہے کیا- اچھا میں بھی اس کو سبق سکھائے دیتا ہوں- اس کا سارا سونا گدھے پر لادکر لے چلتا ہوں- پھر یہ میرے پیچھے بھاگتا پھرے-"

یہ سوچ‌کر اس نے سارا سونا گدھے پر لادا اور چل دیا- ادھر سوداگر سوچ رہا تھا کہ کاش ایسا ہی ایک اور بالا مل جائے تو میں یہ جوڑا اپنے بادشاہ کو دے‌کر سات اقلیم کا خراج اور باج جمع کرنے کا ٹھیکہ لے لوں-"

بوڑھے نے سارا سونا گھر لاکر اپنی بہو کے حوالے کر دیا-

اگلے دن حسن‌آباد نے اپنے دوسرے کان کا بالا بھی اتارکر اپنے سسر کو دیا کہ اس کو بھی بیچ آئیے-

بوڑھا بالے کو لےکر پھر بازار پہنچا- پھر اسی سوداگر نے اس کے پاس آکر پوچھا:

"بابا، اس کے کیا دام ہیں؟"

"میں اس کو تمہارے ہاتھ نہیں بیچوں‌گا" بوڑھے نے کہا- "پچھلی دفعہ تم نے میرا خوب مذاق اڑایا-"

"اچھا تو پھر آپ میرے ساتھ میرے گھر چلئے" سوداگر نے کہا-

وہ بوڑھے کو اپنے گھر لے آیا- اس نے سونے سے بھری دو صندوقچیاں بوڑھے کو دے دیں- یہی نہیں، اس نے بوڑھے کو ایک قیمتی چغہ بھی پہنایا اور گدھے بھی دے دئے- پھر اس نے پوچھا:

"بابا، آپ کا گھر کہاں ہے؟"

بوڑھے نے سوچا کہ اگر میں اپنا گھر بتا دوں گا تو یہ جاکر مجھ کو لوٹ لےگا۔ چنانچہ اس نے جواب دیا:

"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔"

گھر آکر بوڑھے نے سارا سونا اپنی بہو کو دے دیا۔ حسن‌آباد نے یہ ساری دولت اندر لے جاکر چھپا دی اور پھر اس نے اپنے سسر اور شوہر سے کہا:

"اب آپ لوگ جاکر بیس پچیس راج مزدوروں کو لے آئیے۔ ہم یہاں ایک شہر تعمیر کرائیں گے۔"

وہ جاکر شہر سے راج مزدوروں کو لے آئے۔

حسن‌آباد نے ان سب سے کہا:

"آپ لوگ سب گھر جاکر اپنے اپنے بیوی بچوں کو بھی لے آئیے۔"

وہ سب جاکر اپنے بیوی بچوں کو لے آئے تو شہر کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ حسن‌آباد کی ہدایت پر راج مزدوروں نے سب سے پہلے ایک لمبی چوڑی دیوار بنانا شروع کی۔ سب مزدوروں کو اور ان کے بال بچوں کو روز کھانا کھلایا جاتا اور کچھ پیسے بھی دئے جاتے تھے۔ حسن‌آباد نے ان سب کو اچھے اچھے کپڑے بھی بنوا دئے۔ حسن‌آباد کی فیاضی کا حال سن‌کر ہر طرف سے اور بھی مزدور آنے لگے۔ وہ سب کی آؤبھگت کرتی، سب کو کھلاتی پلاتی اور کپڑے بنواکر دیتی تھی۔ پاس سے گزرنےوالے راهگیر پوچھتے:

"یہ دیوار کون بنوا رہا ہے؟"

"اس کو چرواہے کی بیوی بنوا رہی ہے" مزدور جواب دیتے اور پوچھنےوالوں سے کہتے: "کام کرنا ہو تو تم بھی آ جاؤ۔ یہاں تمہیں اچھی مزدوری ملےگی اور کھانے پینے اور پہننے کو بھی ملےگا۔"

پندرہ دن کے اندر اندر پانچ ہزار خاندانوں کے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ انہوں نے تین مہینوں کے اندر اندر اتنی زمین کے گرد دیوار کھڑی کر دی جس کی لمبائی اور چوڑائی دس دنوں میں طے ہونےوالے راستے کے برابر تھی۔ اس دیوار میں بارہ دروازے بنائے گئے اور ہر دروازے پر حسن‌آباد کی تصویر لگاکر نیچے لکھ دیا گیا:

"اس شہر کا نام ہے حسن‌آباد۔ جس کسی کو روٹی کپڑے کی ضرورت ہو یہاں آکر نوکری کرے۔"

ایک سال کے اندر اندر پچھتر ہزار خاندان آکر بس گئے— حسن‌آباد نے ہر ایک خاندان کو دالان اور کوٹھری سمیت ایک الگ مکان بنوا دیا— شہر کے ہر ایک دروازے پر پچیس سپاہی کھڑے کر دئے اور ان کو حکم دیا:

"جو آدمی دیر تک میری تصویر کو دیکھتا رہے اس کو پکڑکر میرے پاس لایاکرو—"

اس نئے شہر کی شہرت شہر جرجان کے بادشاہ تک پہنچ گئی— وہ آگ بگولہ ہو گیا اور گرج‌کر بولا:

"اس ملک میں وہ کون ھے جس کو میری عظمت و ثروت پر ھاتھ اٹھانے کی جرأت ھوئی ھے؟ یہ کون میری جاگیر میں شہر آباد کر رہا ھے؟ اس کی جان کی خیر نہیں— میں ابھی جاکر اس کا سر تن سے جدا کئے دیتا ھوں—"

بادشاہ شہر حسن‌آباد پہنچا— اور دروازے پر پہریداروں کو دیکھ‌کر ان سے پوچھا:

"یہ شہر کس نے بنوایا ھے؟"

"جس کی یہ تصویر ھے اسی نے بنوایا ھے" پہریداروں نے جواب دیا اور انہوں نے دروازے پر لگی ھوئی حسن‌آباد کی تصویر کی طرف اشارہ کیا— "جب ھم آپ کے ھاں نوکری کرتے تھے تو آپ ھمارے بال بچوں کی فکر کرنا تو درکنار، خود ھم کو بھی پیٹ بھر کھانے کو نہیں دیتے تھے اور حسن‌آباد نہ صرف ھماری بلکہ ھمارے بال بچوں کی بھی خوب اچھی طرح پرورش کر رھی ھے— وہ ھمیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کرنے دیتی اور ھمارے بچوں کو پڑھاتی بھی ھے— ھمارے بہت سے بچے طرح طرح کے ھنر سیکھ گئے ھیں—"

بادشاہ نے حسن‌آباد کی تصویر دیکھی تو اس پر عاشق ھو گیا— وہ شہر میں داخل ھوا اور محل میں پہنچا— حسن‌آباد کے سپاھیوں نے آکر اس کو اطلاع دی:

"شہر جرجان کا بادشاہ آیا ھے— اس نے یہ خواھش ظاھر کی ھے کہ آپ اس کی بیوی بن جائیں—"

یہ سن‌کر حسن‌آباد کو غصہ آ گیا اور اس نے ھدایت کی کہ بادشاہ کو اندر لایا جائے— وہ اندر آیا تو حسن‌آباد نے اس سے پوچھا:

"ارے بادشاہ! بتاؤ تو سہی، تمہارے کتنی بیویاں ھیں؟"

"میرے چالیس بیویاں ھیں" بادشاہ نے اکڑکر جواب دیا:

"چالیس بیویاں ہیں اور ابھی کچھ ارمان باقی ہیں؟" حسن‌آباد نے طنز سے کہا—

بادشاہ جل ہی تو گیا— اس نے کڑک کر کہا:

"اچھا! تم مجھے طعنے بھی دینے لگیں! تم گداگر کی یہ ہمت!"

یہ کہہ کر اس نے اپنی تلوار کھینچ لی— لیکن حسن‌آباد کے نوکر دوڑکر آئے اور بادشاہ کو پکڑ لیا— انہوں نے اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑ دئے اور لے جاکر زنداں میں ڈال دیا—

بادشاہ کا حشر دیکھ‌کر ملک کے باشندے بہت خوش ہوئے— ان کے نمائندے حسن‌آباد کے پاس آئے اور اس سے گزارش کرنے لگے کہ شہر جرجان کا نظم و نسق چلانے کا کام آپ اپنے ذمے لے لیں— حسن‌آباد راضی ہو گئی—

چند مہینے گزر گئے— ایک دن ایک درویش شہر حسن‌آباد کے دروازے پر آیا اور وہ حسن‌آباد کی تصویر دیکھ‌کر رو پڑا—

پہریدار اس کو پکڑکر ملکہ حسن‌آباد کے پاس لے چلے— حسن آباد کھڑکی میں سے دیکھ‌کر اس کو پہچان گئی— یہ بادشاہ قاراشاہ تھا جو حسن‌آباد کو اپنی بیوی بنانے کے لئے بےتاب تھا اور اس کو آرام و تفریح کے لئے صرف ایک دن کی مہلت دی تھی— حسن‌آباد تخت پر بیٹھ گئی اور اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیا— قاراشاہ کو اندر لایا گیا تو حسن‌آباد نے اس سے پوچھا:

"درویش! تم کیوں رو رہے ہو؟"

"آپ میری حقیر سی جان بخش دیں تو عرض کروں" درویش بولا—

حسن‌آباد: "ہاں کہو— بخش دی میں نے—"

درویش: "مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی— اس کا نام حسن‌آباد تھا— آج اس شہر کے دروازے پر میں نے اس کی تصویر دیکھی—"

حسن‌آباد: "وہ لڑکی خود کہاں ہے؟"

درویش: "وہ نہانے گئی اور دریا میں ڈوب گئی تھی— مجھے یہی بتایا گیا تھا— لیکن اگر پتہ چلا کہ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے، کنیزوں کو رشوت دےکر بھاگ گئی ہے تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا— میں اس کو جنگلی گھوڑے کی دم سے بندھواکر بیابان میں چھوڑ دوں‌گا تاکہ وہ اس بدمعاش کو کانٹوں پر اس طرح گھسیٹتا پھرے کہ ایک ایک کانٹے پر اس کے جسم کا ایک ٹکڑا رہ جائے—"

حسن‌آباد: "تمہارے آگے اس کا کوئی قصور نہیں ہے— تم اس پر غصہ مت کرو—"

"یہ میری وھی حسن‌آباد تو نہیں ھے" بادشاہ قاراشاہ نے سوچا اور اس نے کپڑوں کے اندر چھپائی ہوئی اپنی تلوار نکال لی اور اس کو حسن‌آباد کے سر کے اوپر کرکے گرجتے ہوئے کہا:

"اپنا منہ کھولو— میں تمہاری صورت دیکھنا چاھتا ہوں—"

لیکن نوکر دوڑکر آئے اور قاراشاہ کو پکڑکر زنداں میں ڈال دیا—

اس کے بعد حسن‌آباد نے اپنے بڑے وزیر کو بلا لیا اور اس سے کہا:

"اب تم ذرا گن‌کر دیکھو کہ ھماری فوج میں کتنے سپاھی ھیں—"

وزیر نے حساب لگایا— معلوم ہوا کہ کل ملاکر سات لاکھ گھڑسوار اور پیادے ھیں—

"ان سب کو سفر کے لئے تیار کر لو!" حسن‌آباد نے وزیر کو ھدایت کی—

چالیس دنوں میں فوج سفر کے لئے تیار ہو گئی— پھر حسن‌آباد اپنے چرواھے شوھر کے ھمراہ اور اپنی فوج کو ساتھ لئے ہوئے اپنے باپ کی سلطنت کی طرف چل پڑی—

صحراؤں اور بیابانوں سے گزرتی، پہاڑوں اور دریاؤں کو پار کرتی، جھیلوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی فوج چلتی رھی، آگے بڑھتی رھی—

فوج چلتی رھے اور آپ آئیے اب ذرا حسن‌آباد کے ظالم باپ کا حال سنئے—

ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک چیل کہیں سے اڑکر آئی اور اس کو اٹھاکر اوپر لے گئی— آسمان اور زمین کے بیچ پہنچ کر چیل رک گئی اور اس سے کہا: "تو میرا غلام بن جا— ورنہ میں تیری گردن توڑ دوں‌گی—" ظالم بادشاہ نے چیل سے گڑگڑاکر کہا: "میرا تخت و تاج لے لو، میری سلطنت اور میرا خزانہ لے لو— میری جان بخش دو—" چیل نے جواب دیا: "تیری دولت اور سلطنت کی مجھے کوئی ضرورت نہیں— میں تو تیری بیٹی حسن‌آباد کا خون پینا چاھتی ہوں—" اپنی بیٹی کا نام سن‌کر بادشاہ رو پڑا— اتنے میں اچانک پہاڑ کے پیچھے سے حسن‌آباد نمودار ہوئی— اس کے ایک ھاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے ھاتھ میں سرخاب کے گوشت کے بنے ہوئے کباب کی سیخ— حسن‌آباد نے آکر اپنی تلوار سے چیل کے دو ٹکڑے کر دئے، ھاتھ بڑھاکر اپنے باپ کو کمر سے پکڑ لیا اور آھستہ سے نیچے لاکر زمین پر رکھ دیا— پھر اس نے کباب اپنے باپ کے ھاتھ میں تھماکر اس سے کہا: "اباجان! اگر مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو تو اس کو معاف کر دیجئے—" بادشاہ کے چیخ نکل گئی اور جاگ گیا—

صبح کو اس نے چار سو صلاح‌کاروں اور چالیس وزیروں کو بلا لیا اور ان سے کہا:

"اگر تم میرے خواب کی تعبیر نہ بتا سکے تو تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

بڑے وزیر نے کھڑے ہوکر کہا:

"اگر آپ میری جان بخش دیں تو میں آپ کے خواب کی تعبیر بتا دوں۔"

"ہاں بتاؤ!" بادشاہ نے گرج کر کہا۔

بڑے وزیر نے کہا:

"جس چیل نے آپ کو اٹھا لیا تھا وہ کوئی دشمن ہے۔ جس وقت وہ ہمارے ملک پر قبضہ کرکے آپ کو قیدی بنا لے گا اس وقت آپ کی بیٹی آکر آپ کو آزاد کرا لے گی۔ لیکن آپ کے تخت و تاج کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلے جائیں گے۔"

"جھوٹ!" بادشاہ گرجا۔ "میری سرکش بیٹی کو تو خاک میں ملے عرصہ ہو چکا ہے۔ ضرور تم مجھ کو ڈراکر چین آرام سے محروم کرنا چاہتے ہو۔ میں تم کو زندان میں ڈال دوں گا تاکہ میری بیٹی کے ساتھ تم بھی وہیں مر کھپ جاؤ۔"

بادشاہ نے جلادوں کو بلاکر اپنے بڑے وزیر کو زندان میں ڈلوا دیا۔ لیکن اسی دن سے بادشاہ اپنا چین اور آرام بالکل کھو بیٹھا۔ وہ راتوں کو ڈر کے مارے سو نہیں پاتا تھا۔ رات بھر اپنے بستر پر لوٹتا رہتا یا پھر اپنی خواب‌گاہ کے اندر ادھر ادھر گھومتا پھرتا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح کوئی زخمی جنگلی سؤر جھاڑیوں میں درد سے تڑپتا پھرے۔ ایک ہفتے کے بعد ایک ایلچی اس کے پاس آ پہنچا۔ اس نے آتے ہی اعلان کیا:

"شہر جرجان کا بادشاہ اپنا لشکر لےکر حملہ کرنے آ رہا ہے۔ جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ‌کر اور سر جھکاکر اس کا استقبال کرو۔ اگر تم نے اپنی مرضی سے اپنی سلطنت کو اس کے حوالے نہ کیا تو پچھتاؤگے۔ ہمارے بادشاہ نے تمہارے لئے سلام اور انعام بھیجا ہے۔"

یہ کہہ‌کر ایلچی دوڑکر بادشاہ کے پاس گیا اور اس کے منہ پر زور سے ایک تھپڑ مار دیا۔ وہ معافی مانگتا ہوا اپنے تخت کے پیچھے چھپ گیا۔ ایلچی چلا گیا تو اس نے تھرتھر کانپتے ہوئے اپنے وزیروں سے کہا:

"ایلچی کا یہ حال ہے تو بھلا اس بادشاہ کے سپاہی کیسے ہوں گے!"

"اب کیا کیا جائے؟ کوئی مشورہ دو-"

"ہم آپ کو کوئی مشورہ نہیں دے سکتے" وزیروں نے جواب دیا- "ہم چاہے اچھا کہیں یا برا، ہر صورت میں آپ ہم کو قتل کرا دیں گے- آپ بڑے وزیر کو زنداں سے نکالیں- وہ انعام و اکرام لےکر شہر جرجان کے بادشاہ کے پاس جائے- پھر جو ہوگا سو ہوگا-"

بادشاہ نے بڑے وزیر کو زنداں سے نکالا اور اس سے کہا:

"تم ابھی شہر جرجان کے بادشاہ کے پاس چلے جاؤ اور دوھرے تہرے ہوکر اس کو سلام کرو- وہ اگر کہے تو میری سلطنت اسے دے دو- کل‌والے تھپڑ سے میرا گال ابھی تک دکھ رہا ہے- اگر اس نے کہا کہ بادشاہ کی جان لوں‌گا تو میں درویش کا ڈنڈا لےکر شہر سے نکل جاؤں‌گا- ویسا کوئی دوسرا تھپڑ اب میں برداشت نہ کر سکوں‌گا-"

وزیر ہنس پڑا اور اس نے بادشاہ سے کہا:

"جب میں نے آپ کے خواب کی تعبیر بتائی تھی تو آپ کو غصہ آ گیا تھا- اب بتائیے، میں نے سچ کہا تھا کہ جھوٹ؟ اب دشمن آئےگا- وہ آپ کو کسی جنگلی گھوڑے کی دم سے باندھ‌کر گھوڑے کو بیابانوں کی طرف ہانک دےگا- گھوڑے کو کانٹوں پر گھسیٹتا پھرےگا اور آپ ایک کتے کی موت مر جائیں‌گے-"

بادشاہ کیچڑ میں پھنسے ہوئے گدھے کی طرح گردن جھکائے چپ رہ گیا-

بڑا وزیر قیمتی سوغات لےکر چل پڑا-

راستے میں اس نے شہر جرجان کے بادشاہ کے نام ایک خط لکھا اور نیچے اپنا نام درج کرکے اپنے ایلچی کے ہاتھ بھیج دیا- وہ خط حسن‌آباد کو مل گیا- خط پڑھنے کے بعد حسن‌آباد نے بڑے وزیر کو اپنے پاس طلب کیا- وزیر نے اندر آکر بہت جھک‌کر سلام کیا اور بیٹھ گیا- اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی تو دیکھا کہ سامنے بادشاہ بیٹھا ہے (یہ حسن‌آباد کا شوہر چرواہا تھا)- تخت کے ارد گرد چالیس سپاہی بادشاہ کے اشارے کے منتظر ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور تخت کے ایک طرف کوئی منہ پر نقاب ڈالے بیٹھا ہوا ہے-

"اے بڑے وزیر!" اس نقاب‌والے شخص نے کہا- "تمہیں اکیلے ہماری چھاؤنی میں آتے ہوئے ڈر نہیں لگا؟ یہاں تمہاری حمایت کرنےوالا کوئی نہیں ہے- اگر میں تم کو مار ڈالوں تو؟"

بڑے وزیر نے حسن‌آباد کی آواز کو پہچان لیا— اس نے فوراً جواب دیا:

"جس کو خود ہی موت کے منہ سے بچایا ہو کوئی اس سے کیوں ڈرے؟"

تب حسن‌آباد نے اپنے منہ کا نقاب اٹھا دیا اور اٹھکر بڑے وزیر کے پاس آئی:

"اے میرے محسن! اے نیک‌دل انسان!" اس نے وزیر سے مخاطب ہوکر کہا— "آپ ہی کی بدولت میں آج تک زندہ ہوں— اگر میں اپنے باپ کی سلطنت آپ کے حوالے کر دوں تو کیا آپ اس کا نظم و نسق عدل اور انصاف سے چلائیں گے؟"

"ارے بیٹی! میں تو اب بوڑھا ہو چکا ہوں" بڑے وزیر نے جواب دیا— "اگر تم نے یہ مملکت میرے حوالے کی تو میں اسے اس شخص کو سونپ دوں گا جو میرے سامنے تخت پر بیٹھا ہوا ہے—"

حسن‌آباد اپنی فوج کو لےکر شہر میں داخل ہوئی— بادشاہ کی تلاش کی جانے لگی— لیکن وہ کہیں بھی نہ ملا— وہ تو ڈر کے مارے اسی دن بھاگ کھڑا ہوا تھا— اس کے بعد کبھی کسی نے اس کو نہیں دیکھا—

حسن‌آباد اپنے چرواہے شوہر کے ساتھ مل‌کر ملک پر حکومت کرنے لگی— جتنے بےگناہ زنداں میں پڑے ہوئے تھے اس نے ان سب کو آزاد کر دیا— ان میں سے متعدد کو اس نے مختلف شہروں کا حاکم مقرر کیا—

اس طرح حسن‌آباد اپنی مرادیں پا گئی—

# غریب کی بیٹی

تراق تروق، ھاں اور طوق، غریب کو روزہ رکھنے کا شوق— سیب پک جا، منہ میں آ جا— شیطان دھوپ میں لمبا پڑا ہے، بندر درخت پر تنا کھڑا ہے— یہ جا وہ جا، گھر میں کھو جا— یہ سب تمہید کہلاتا ہے، قصہ آگے آتا ہے— لو سنو— بہت پرانے زمانے کی بات ہے، ملک عجم میں ایک بادشاہ تھا— اس کے ایک بیٹا تھا جس کی عمر بارہ برس کی ہو چکی

تھی— وہ اتنا نٹ کھٹ اور بدمعاش تھا کہ اس کی شرارتوں اور بدمعاشیوں سے شہر کے باشندے تنگ آ گئے تھے اور انہوں نے اس کا نام شہزادہ خردماغ رکھ چھوڑا تھا—

ایک دن شہریوں کے کچھ نمائندے بادشاہ کے پاس شہزادہ خر دماغ کی شکایت کرنے گئے— بادشاہ کو غصہ آ گیا اور اس نے شکایت کرنےوالوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر پہلے تو چلتا کر دیا پھر اس نے اپنے جلادوں کو بلاکر حکم دیا کہ ان سب کو جاکر پکڑ لاؤ اور قتل کر دو— لیکن اس کے وزیر نے اس کو روکا— اس نے کہا:

"بادشاہ عالم! ذرا ضبط و تحمل سے کام لیجئے— آپ کے بیٹے کی عمر بارہ سال کی ہو چکی ہے— اس کو مدرسے میں داخل کرا دیجئے— راہ پر آ جائےگا—"

وزیر کے مشورے پر عمل کرکے بادشاہ نے اپنے بیٹے کو مدرسے بھیج دیا— لیکن ضدی شہزادہ کتاب کو دیکھتے ہی چیخنے چلانے لگا:

"میں پڑھنا وڑھنا نہیں چاھتا— میں بادشاہ کا بیٹا ہوں— جو جی میں آئے وہی کروں گا— کتاب میں سر کھپانا مجھے بالکل پسند نہیں ہے—"

مولوی نے سوچا کہ اگر میں اس کو ڈانٹوں ڈپٹوں گا، ماروں پیٹوں گا تو بادشاہ خفا ہو جائےگا— یہ سوچ کر اس نے شہزادے کو اپنے حال پر چھوڑ دیا—

وہ تین سال تک مدرسے میں رہا لیکن بس اپنے ہم‌عمر بچوں کے ساتھ کھیلتا کودتا رہا، پڑھا وڑھا کچھ نہیں— تین سال کے بعد بادشاہ نے اپنے بیٹے کو مدرسے سے بلوایا اور چار سو علما اور فضلا کو بلاکر ان سے کہا:

"ذرا میرے بیٹے کا امتحان لےکر دیکھو کہ یہ مدرسے میں کیا پڑھ‌کے آیا ہے—"

عالموں نے بادشاہ‌زادے سے پوچھا:

"بتاؤ تو بیٹے، تم نے مدرسے میں کیا سیکھا؟"

بادشاہ‌زادے نے فوراً اپنی جیب سے پانچ ہڈیاں نکالیں— ان میں سے چار دو دو کرکے رکھ دیا اور پانچویں ہڈی ان پر پھینک کر کہا:

"یہ سیکھا میں نے مدرسے میں—"

بادشاہ کو بڑا غصہ آیا اور اس نے اسی وقت مولوی کو قتل کرا دیا— مولوی کے ساتوں بچے یتیم ہو گئے—

اس کے بعد بادشاہ نے سارے شہر میں اعلان کرا دیا:

"جو کوئی چالیس دنوں کے اندر میرے بیٹے کو پڑھنا لکھنا سکھا دےگا میں

اس کو اچھا انعام دوں گا لیکن اگر اس مدت میں کوئی اس کو پڑھنا لکھنا نہ سکھا سکا تو شہر کو جلاکر راکھ کر دوں گا۔"

اس شہر میں ایک غریب آدمی تھا۔ اس کے نو سال کی ایک بیٹی تھی۔ وہ گھر میں بیٹھی چرخا چلا رہی تھی کہ اچانک اس کا باپ روتا دھوتا اندر آیا۔ لڑکی نے اس سے پوچھا:

"اباجان! آپ رو کیوں رہے ہیں؟"

باپ: "ارے بیٹی! تم جان کر کیا کروگی؟ تم تو بچی ہو۔ تم کیا کر لوگی؟ بادشاہ نے شہروالوں کو حکم دیا ہے کہ چالیس دنوں کے اندر میرے بیٹے کو لکھنا پڑھنا سکھا دو۔ نہیں تو سارے شہر کو جلاکر راکھ کر دوں گا۔"

لڑکی: "آپ جاکر اس کو لے آئیے۔ میں چالیس دنوں میں اس کو اچھی طرح لکھنا پڑھنا سکھا دوں گی۔"

لڑکی کا باپ فوراً بادشاہ کے پاس گیا اور اس سے کہا:

"بادشاہ عالم! اگر آپ کہیں تو میری بیٹی آپ کے بیٹے کو پڑھا لکھا دے۔"

بادشاہ راضی ہو گیا اور اپنے بیٹے کو اس آدمی کے ساتھ کر دیا۔ بادشاہزادے نے آکر دیکھا کہ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی ہے۔ اس نے سوچا کہ ایک چپت مار دوں گا تو یہ مجھ کو پڑھانے سے توبہ کر لے گی۔

لڑکی بڑی سمجھدار تھی۔ اس نے بادشاہزادے کو پڑھانا شروع کر دیا۔

بادشاہزادے نے اس کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ لڑکی نے اس سے پہلے ہی اس کے منہ پر ایک چپت مار دی۔ اس نے کبھی مار نہ کھائی تھی، لڑکی کی چپت کھاکر اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ لڑکی اس کی کسی نہ کسی شرارت کے لئے روز اس کے ایک چپت مار دیا کرتی۔ آخر اس کا یہ حال ہو گیا کہ لڑکی کے ذرا تیور بدلے اور وہ تھرتھر کانپنے لگا۔ اس طرح وہ چالیس دنوں میں بہت کچھ سیکھ گیا۔

چالیس دن گزرنے پر لڑکی کا باپ بادشاہزادے کو واپس اس کے باپ کے پاس لے آیا۔ بادشاہ نے چالیس سفیدریش عالموں کو بلاکر ان سے کہا:

"ذرا امتحان لے کر دیکھو کہ لڑکی نے میرے بیٹے کو کہاں تک پڑھایا ہے۔"

ان میں سے ایک نے جو سب سے بڑا عالم تھا، بادشاہزادے سے کہا:

"صاحبزادے! تم نے کونسی کتاب پڑھی ہے؟ ذرا اس میں سے کوئی سبق پڑھ کر سناؤ۔"

بادشاہزادے نے اپنی کتاب کھول کر اس میں سے ایک سبق پڑھ کر سنایا۔
بادشاہ نے عالموں سے پوچھا:
"میرے بیٹے کی پڑھائی کیسی ہوئی ہے؟"
"بہت اچھی ہوئی ہے۔لڑکا بڑا ذہین ہے" عالموں نے جواب دیا۔
بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس نے اس غریب آدمی اور اس کی بیٹی کو انعام و اکرام سے نوازا اور سارے شہر کو دعوت دی۔ شہر والے موت کے منہ سے بچ نکلے۔
لیکن اس کے بعد بادشاہزادہ ایک کمرے میں پانی چھڑکواکر اور ایک خالی ٹاٹ بچھواکر اس پر لیٹ گیا اور کھانا پینا بالکل چھوڑ کر چالیس دنوں تک یوں ہی اپنا سینہ گیلے فرش پر رکھے پڑا رہا۔ بادشاہ کو بہت تشویش ہوئی۔ اس نے سارے شہر میں اعلان کرایا:
"جو کوئی میرے بیٹے کی زبان کھلوائے گا میں اس کو سونے چاندی سے لاد دوں گا۔ لیکن اگر کوئی اس کی زبان نہ کھلوا سکا تو میں سارے شہر کو مٹاکر رکھ دوں گا۔"
اس شہر میں ایک بڑھیا تھی۔ پیٹ میں آنت نہ منہ میں دانت۔ اس نے ایک سوکھی ہوئی خوبانی اپنے منہ میں ڈال لی، اس کو چوستی ہوئی شہزادے کے پاس پہنچی اور اس سے پوچھا:
"بیٹے، تمہارا باپ ایک بادشاہ ہے اور تم ایک بادشاہزادے ہو۔ تمہارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے پھر تم اس طرح بغیر بولے چالے کیوں پڑے رہتے ہو؟"
بادشاہزادے کی زبان کھلی اور وہ بولنے لگا:
"اگر میرے باپ نے میری استانی سے میری شادی کر دی تو میں بولوں گا۔ ورنہ کبھی منہ نہیں کھولوں گا۔"
بادشاہ فکرمند ہو گیا۔ اس نے مولویوں کو بلاکر ان سے کہا:
"ذرا اپنی کتابوں میں دیکھو تو، شریعت کی رو سے اپنی استانی سے شادی کرنے کی کوئی صورت ہے یا نہیں۔"
مولویوں نے اپنی کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھیں اور پھر بادشاہ سے کہا:
"اس کی کوئی صورت نہیں ہے۔"
بادشاہ طیش میں آ گیا اور اس نے جلادوں کو پکارا۔ سات جلاد ننگی تلواریں لئے اور اپنی زبانیں تیز کئے آ موجود ہوئے اور کہنے لگے:

"کس کی موت آئی ہے؟ دھوپ سایے کو نہ چھو پائے گی کہ ہم اس کا سر قلم کر دیں گے۔"

بادشاہ کے حکم پر جلاد چار سو مولویوں کو مشکیں کس کر قتل کرنے چوک پر لے گئے۔

اس شہر میں ایک پڑھا لکھا نوجوان رہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ چار سو آدمیوں کے مر جانے سے بہتر ہے کہ یہ زندہ رہ جائیں۔ یہ سوچ کر اس نے بادشاہ کے پاس آکر کہا:

"بادشاہ عالم! میں نے ایک کتاب میں ایک روایت دیکھی ہے جو اتنی ہی چوڑی ہے جتنی شہر نمانگان کی اسی گز چوڑی سڑک۔ آپ ایک نہیں، ایسی چھتیس شادیوں کو ایک رسی سے باندھ کر اس روایت میں سے کھینچتے ہوئے لے جائیں تو وہ کہیں اٹکے بغیر نکل جائیں گی۔"

یہ سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس نے فوراً بڑی دھوم دھام سے اس غریب آدمی کی بیٹی سے اپنے بیٹے کی شادی کر دی۔

اگلے دن صبح ہی بادشاہ زادے نے اپنے آنگن کے بیچوں بیچ ایک گہرا گڑھا کھدوایا۔ اپنی بیوی کو گھسیٹ کر اس گڑھے کے پاس لایا۔ اس کی چالیس چوٹیوں کو سمیٹ کر ایک موٹی لکڑی سے باندھا، اس کے گالوں پر ایک ایک چپت مار کے اس کو اس گڑھے میں اتارا اور لٹکتی ہوئی چھوڑ دیا۔ اور پھر خود گھوڑے پر سوار ہوکر شکار کھیلنے نکل گیا۔ شام کو گھر لوٹنے پر اس نے اپنی بیوی کو گڑھے سے نکال لیا اور رات بھر اس کو اپنے آغوش میں لے کر سویا۔ صبح ہونے پر اس نے پھر کل والا کام دوہرایا۔ بیوی کو گڑھے کے اندر لٹکاکر خود پھر شکار کھیلنے چلا گیا۔ یہ سلسلہ چالیس دنوں تک برابر جاری رہا۔ اکتالیسویں دن لڑکی نے روتے ہوئے بادشاہ زادے سے کہا:

"میں ایک عاجز اور ناتواں مخلوق ہوں۔ اے بے ہمت اور سنگدل بندے! آج مجھ پر رحم کرو۔ اجازت دو کہ میں کم سے کم ایک بار جاکر اپنے ماں باپ سے مل لوں۔ ورنہ شاید ان کو دیکھے بغیر ہی مر جاؤں گی۔"

بادشاہ زادے نے اجازت دے دی۔ لیکن اس نے بیوی کو تاکید کر دی:

"جلدی لوٹ آنا۔ ورنہ میں تم کو مار ڈالوں گا اور تمہاری کھال میں بھوسہ

بھرکر چوک پر لٹکا دوں گا تاکہ دوسری بیویاں بھی اس سے سبق سیکھیں اور اپنے شوہروں کی اجازت کے بغیر باہر قدم نہ رکھا کریں—"

لڑکی خوشی سے اچھل پڑی— اس نے جلدی جلدی اپنی مخسی* پاؤں میں اٹکائی، رومال کو گردن پر ڈالا، برقعے کو الٹا سیدھا پہنا، مکئی کی دو روٹیاں بغل میں دبا لیں اور ان کو توڑ توڑکر کھاتی ہوئی اپنے ماں باپ کے گھر چل دی—

جب وھاں پہنچی تو اس کی صورت دیکھتے ھی ماں نے پریشان ھوکر پوچھا:

"کیا بات ھے، بیٹی؟ تمھیں کیا ھو گیا؟ منھ بھوسے کی طرح پیلا پڑ گیا ھے— تمھاری پتلی نازک کمر بال بن‌کر رہ گئی ھے—"

"ماں، مجھے کچھ نھیں ھوا— میں بالکل ٹھیک ھوں" بیٹی نے جواب دیا—

"سچ سچ بتاؤ، بیٹی! نھیں تو میں خود اپنی جان لے لوں‌گی" روتے ھوئے ماں نے کہا اور اس نے چھری اٹھا لی— لڑکی ڈر گئی اور اس نے سارا قصه ماں سے کہہ سنایا— قصه سناتے ھوئے اس نے جو آہ بھری تو اس کے منھ سے شعله نکل پڑا—

بیٹی کا حال سن‌کر ماں کے دل و جگر خون ھو گئے— اس نے بیٹی کو تسلی دیتے ھوئے کہا:

"بیٹی، تم فکر مت کرو— اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کا ایک اچھا سا طریقه ھے— وہ میں تمھیں بتاتی ھوں—"

ماں نے اپنی بیٹی کے ھاتھ منھ دھلائے، اپنے ھاتھوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرکے پھر سے چوٹیاں بنا دیں اور پھر اس کے آگے دسترخوان بچھاکر طرح طرح کی لذیذ چیزیں اس کو کھلائیں — خوب کھا پی‌کر اور ماں سے باتیں کرکے لڑکی کا غم تھوڑا سا غلط ھوا اور اس نے ماں سے کہا:

"ماں، اب مجھے اجازت دیجئے— اب میں چلتی ھوں—"

ماں نے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا اور اسے اپنی بیٹی کو دے‌کر کہا:

"جب تمھارا شوھر تم کو مارنے لگے تو تم قہقهه مارکر ھنسنا— جب وہ پوچھے کہ تو کیوں ھنستی ھے تو تم اس سے کہنا کہ تمھاری مار میرے لئے پلاؤ ھے اور گالیاں قورمه— تم میرے ساتھ جو سلوک چاھو کرو— لیکن ایک بات نه کرنا: اس لڑکی کو

---

* مخسی: لانگ بوٹ کے سے ھلکے چمڑے کے پاتابے— اڈیٹر—

میری سوت نہ بنانا" یہ کہہ کر اس تصویر کو اسے دکھا دینا- بس سب ٹھیک ہو جائے گا-"

گھر لوٹنے پر لڑکی نے ویسا ھی کیا جیسا اس کی ماں نے کہا تھا- بادشاہزادہ کاغذوالی لڑکی کو دیکھتے ھی اس پر عاشق ہو گیا- اس مہ‌لقا اور آفتاب‌نظر حسینہ کی محبت کا تیر اس کے سینے کو چیرکر اس کے دل اور جگر میں پیوست ہو گیا- اس نے بیوی سے پوچھا:

"یہ ھے کون؟ یہ کوئی انسان ھے یا پری؟ اس کا اتا پتہ کیا ھے؟"

"یہاں سے چھے مہینوں کے فاصلے پر ایک ملک ارم ھے" اس کی بیوی بتانے لگی- "اس کا بادشاہ آدمی‌زاد ھے لیکن اس کی بیوی ایک پری‌زادی ھے- یہ لڑکی انہیں دونوں کی اکلوتی بیٹی ھے- لوگ اس کو آق‌بیلک کے نام سے یاد کرتے ھیں-وہ اپنے چہرے پر ستر تہوں‌والا حریری نقاب ڈالے رہتی ھے- وہ رات کے وقت اس پردے کی ایک ھی تہہ کو اٹھا دے تو اس کے حسن کے جلوے سے بتیس محلے روشن ہو جائیں اور لوگ چراغ جلائے بغیر ھی اپنا کام کاج کریں- اس نے اعلان کر رکھا ھے کہ جو کوئی مجھ کو تین دفعہ بلوائےگا اسی سے میں شادی کر لوں‌گی لیکن اگر کسی نے مجھے بلوا نہ سکا تو اس کا سر کٹواکر مینار کی دیوار میں اینٹ کی جگہ چنوا دوں‌گی-"

شہزادے خر دماغ نے چالیس خچروں پر سونا چاندی لادکر اور چالیس نوکروں کو ساتھ لےکر ملک ارم کی راہ لی- وہ چلتا رہا، منزلیں طے کرتا گیا-

بہت دن گزر گئے، کئی مہینے بیت گئے-

ایک دن وہ اپنے نوکروں کے ساتھ ایک لق و دق صحرا میں چلا جا رہا تھا کہ سامنے ایک پہاڑ نظر آیا- وہ پہاڑ تک پہنچ گیا اور اس کے اوپر چڑھ‌کر چاروں طرف روانہ ہو گئے اور کچھ دیر میں باغ تک پہنچ گئے- شہزادہ خر دماغ کیا دیکھتا ھے کہ باغ کے اندر ہر طرف رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے ھیں- چڑیاں چہچہا رہی ھیں- باغ کے بیچوں بیچ ایک چبوترا بنا ہوا ھے اور اس پر ایک سونے کا تخت رکھا ھے- چبوترے کے فرش پر اطلس کے نرم نرم گدے بچھے ہوئے ھیں- باغ میں ایک طرف تالاب ھے جو سونے کا بنا ہوا ھے اور اس میں پانی کی جگہ دودھ بھرا ہوا ھے- بادشاہزادہ بہت خوش ہوا- وہ چبوترے پر چڑھ‌کر پاؤں پسارکر بیٹھ گیا اور اپنے نوکروں کو حکم دیا:

"چائے بناؤ— کھانا تیار کرو— ہم کچھ دن یہیں آرام کریں گے—"

وہ ابھی اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ کہیں سے تین قمریاں اڑتی ہوئی آئیں اور سونے کے تخت پر بیٹھ گئیں— پھر ایک ایک قلابازی کھاکر وہ تینوں تین پریاں بن گئیں—

وہ پریاں بادشاہ‌زادے کے سامنے بیٹھ گئیں لیکن اس کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھا— وہ بیٹھ کے شطرنج کھیلنے لگیں— کھیلتے کھیلتے پریوں میں سے ایک نے دوسری پری سے کہا:

"بےایمانی نہ کرو—"

"بےایمانی تو آدمی‌زاد کرتے ہیں" دوسری پری نے جواب دیا—

یہ سن‌کر بادشاہ‌زادے کو غصہ آ گیا اور اس نے کہا:

"نہیں— بےایمانی پریاں کرتی ہیں—"

تب اسی پری نے بادشاہ‌زادے سے مخاطب ہوکر کہا:

"تو پھر آؤ، تم بھی کھیلو— دیکھیں تو ذرا، کیسے کھیلتے ہو—"

بادشاہ‌زادہ راضی ہو گیا اور پری کے ساتھ شطرنج کھیلنے لگا— بس پھر کیا تھا، جتنی دیر میں ایک بڑھیا پکر ہوئے آڑو کی گٹھلی بھی گودے سے الگ نہ کر پائے اتنی ہی دیر میں بادشاہ‌زادہ چالیس خچروں پر لدی ہوئی اپنی ساری دولت خچروں سمیت اور اپنے چالیس نوکروں تک کو ہار گیا— تب پریوں میں سے ایک نے اٹھ‌کر بادشاہ‌زادے سے کہا:

"اے انسان کی اولاد! اٹھو! یہاں سے دفع ہو جاؤ— یہ جگہ تمہارے بیٹھنے کی نہیں ہے" یہ کہہ‌کر اس نے بادشاہ‌زادے کو پیچھے ایسی لات ماری کہ اس کا ایک جوتا بادشاہ‌زادے کی ایک جگہ سے چسپاں ہو گیا— بادشاہ‌زادہ تیر کی طرح اڑتا ہوا دروازے سے باہر ہو گیا— افسوس اور ندامت سے اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے، بالکل اس بلی کی طرح جس کے حلق میں چربی کا ایک بڑا سا ٹکڑا پھنس گیا ہو—

اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اس طرح اپنے باپ کے پاس لوٹ‌کر جانے سے کہیں بہتر ہے کہ آق‌بیلک پری کے ہاتھوں مارا جاؤں— یہ سوچ‌کر وہ آق‌بیلک پری کی تلاش میں چل کھڑا ہوا—

چلتے چلتے وہ ایک شہر تک پہنچا— شہر کے باہر اس نے دیکھا کہ سات مینار کھڑے ہیں— اس نے ایک چرواہے سے پوچھا:

"بھائی، یہ کس مدرسے کے مینار ہیں؟"

"ارے بھائی، یہ کوئی مدرسہ نہیں ہے" چرواہے نے روتے ہوئے کہا۔

"ظالم بادشاہ کی ایک بیٹی ہے۔ اس نے کہہ رکھا ہے کہ جو کوئی مجھ کو تین دفعہ بولنے پر مجبور کر دے گا میں اس سے شادی کر لوں گی۔ لوگ آتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ کچھ بولے لیکن بلوا نہیں پاتے۔ شہزادی ان کے سر کٹوا کٹوا کر ان میناروں میں چنوا دیتی ہے۔"

شہزادہ خردماغ شہر میں داخل ہوا اور شہزادی کے محل میں پہنچا۔ شہزادی چالیس زینوں کے اوپر تخت پر بیٹھی تھی۔ اس کے نوکروں نے بادشاہزادے کو اٹھا لیا اور چالیس سیڑھیاں چڑھ کر اس کو شہزادی آق بیلک کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔

بادشاہزادے نے دیکھا کہ ستر پردوں کے پیچھے سے شہزادی کا چہرہ اس سے بھی زیادہ حسین و جمیل دکھائی دیتا ہے جیسا کہ اس کی بیوی نے کہا تھا۔ وہ اپنے ہوش و حواس گنوا کر کیچڑ میں پھنسے ہوئے گدھے کی طرح سر جھکا کے کھڑا ہو گیا۔ شہزادی آق بیلک نے اپنے وزیر سے اشارے سے کہا کہ پوچھو تو، شہزادہ کیا چاہتا ہے۔ وزیر نے شہزادہ خر دماغ سے یہ سوال کیا۔ کچھ اور نہ پوچھا تو اس نے شہزادی سے مخاطب ہو کر کہہ دیا:

"میں تمہارے ساتھ جوا کھیلنا چاہتا ہوں۔"

شہزادی نے خاموشی سے شطرنج اور ہڈیوں کی طرف اشارہ کیا۔ بادشاہزادے کو شطرنج کھیلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے ہڈیاں چن لیں۔ اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا۔ شہزادی نے چاندی کی دو اینٹیں جوڑ کر رکھ دیں، پھر چار ہڈیاں اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر ان اینٹوں کے اوپر پھینکیں اور بازی جیت لی۔ شہزادے کی باری آئی ہی نہیں۔ شہزادی نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو جلاد حاضر ہو گئے۔

لیکن دائیں طرف بیٹھے ہوئے وزیر کو بادشاہزادے کے حسن اور جوانی پر رحم آ گیا اور اس نے شہزادی سے کہا:

"ملکۂ اعظم! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔ آپ اس بدتمیز کو مجھے دے دیں۔ میں ستا ستا کر اس کی جان لے لوں گا تاکہ دوسرے اس سے سبق سیکھیں اور اپنے خالی جسم کو لے کر آپ کے ساتھ جوا کھیلنے سے باز رہیں۔"

شہزادی نے بادشاہزادے کو وزیر کے حوالے کر دیا— وزیر اس کو باہر لے آیا اور اس سے کہا:

"تمہاری اٹھتی ہوئی جوانی پر رحم کھاکر میں نے دھوکے سے تم کو موت سے بچا لیا ہے— اب میری بات سنو— میرے پاس ایک کولھو ہے— اس پر ایک بوڑھا کام کرتا ہے— میں اس کا سر مینار میں چنوا دوں گا اور اس کی جگہ تم کو رکھوں گا— منظور ہے؟"

شہزادہ خردماغ نے روتے ہوئے جواب دیا:

"آپ جو کچھ کہیں مجھے منظور ہے—"

شہزادہ خردماغ وزیر کے کولھو پر کام کرنے لگا— وہ ماش‌خوردہ (ماش اور چاول کا سوپ) اور شوربا کھاتا اور روزانہ تین من بنولوں کا تیل نکالتا— اس طرح تین سال تک کولھو چلاتا رہا—

ایک دن وہ چولھے کے پاس بیٹھا اوپلے کی بدبو سونگھتا ہوا ماش پکا رہا تھا کہ بہت سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی— وہ دوڑکر باہر آیا اور دیکھا تو سوداگروں کا کوئی قافلہ جا رہا تھا— اس نے پکارکر پوچھا:

"اے سوداگرو! تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟"

"ہم ملک عجم جا رہے ہیں" انہوں نے جواب دیا—

"میرا ایک خط عجم کے بادشاہ تک پہنچا دوگے؟"

قافلے کا سردار راضی ہو گیا— شہزادے خر دماغ نے فوراً کاغذ قلم لےکر اپنے باپ کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون و مفہوم یہ تھا:

"پدر مہربان! میں آپ کا بیٹا، آپ کا نور چشم — میں ملک ارم آیا، شہزادی سے شادی کرنا چاہی لیکن جال میں پھنس گیا— تین سال سے کولھو چلا رہا ہوں— آپ میرے والد ہیں اور ملک عجم کے بادشاہ ہیں— ایک غریب کی بیٹی نے مجھ کو اس مصیبت میں مبتلا کیا ہے— میرا یہ خط پاتے ہی آپ اس کی سات کیا، ستر پشتوں کے چھوٹے بڑے سب کے ٹکڑے کر ڈالیں— اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو میں جیتے جی اور مرنے کے بعد بھی آپ کا دامن‌گیر رہوں گا— خط لکھنے والا آپ کا بیٹا—"

بادشاہزادے نے یہ لکھکر اپنی مہر لگا دی اور خط قافلےبان کے حوالے کر دیا— سوداگر ملک عجم پہنچے— ان میں ایک سوداگر دوسروں کے مقابلے میں کچھ

غریب تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر خط کو بادشاہ کے پاس میں لے جاؤں تو شاید وہ بطور انعام میرا محصول معاف کر دے۔ اس نے قافلےبان سے اس کا ذکر کیا اور اس سے خط مانگا تو قافلےبان نے مروت کرکے خط اس کو دے دیا۔ اتفاق سے یہ سوداگر اس غریب آدمی کا پڑوسی تھا جس کی لڑکی بادشاہزادے کی بیوی بنی تھی۔ چنانچہ سوداگر اپنے غریب پڑوسی سے ملنے اس کے ھاں گیا، خطوالی بات اس کو بتائی اور خط بھی نکال‌کر دکھا دیا۔ غریب آدمی کی بیٹی برابر کے کمرے میں بیٹھی سب باتیں سن رہی تھی۔ جب اس نے خطوالی بات سنی تو اس نے سوچا کہ یہ ضرور میرے شوھر کا خط ھوگا۔ چنانچہ وہ اٹھکر اس کمرے میں آئی، جھپٹ‌کر خط سوداگر کے ھاتھ سے لے لیا اور بھاگ گئی۔

اس نے خط کھول‌کر پڑھا تو دیکھا کہ مصیبت سر پر آ کھڑی ھوئی ھے۔ اس نے بغیر کسی جھجک کے اس خط کو جلا ڈالا اور کاغذ قلم لےکر اس کے بدلے یہ خط لکھا:

"پدر مہربان! میں ھوں تمھارا بیٹا، تمھاری آنکھوں کا نور، تمھارے جگر کا ٹکڑا۔ میں نے ملک ارم آکر شہزادی آق‌بیلک پری سے شادی کرلی اور سات اقلیم کا بادشاہ بن گیا ھوں۔ کیا دیو، کیا پری‌زاد اور کیا بھوت پریت سب میرا حکم مانتے ھیں۔ میرا تم کو یہ حکم ھے کہ اس خط کو پاتے ھی میری بیوی کے سبھی عزیزوں اور رشتےداروں کو بلاکر چھوٹے بڑے سب کو انعام و اکرام سے سرفراز کرو اور سونے چاندی سے لاد دو۔ تم نے ایسا نہ کیا تو میں فوراً اپنے سات لاکھ کے لشکر کو لےکر پہنچ جاؤں‌گا اور تمھاری جان تمھاری ناک سے کھینچ لوں‌گا۔

دستخط کرکے مہر لگانےوالا تمھارا بیٹا۔"

لڑکی نے واپس آکر یہ خط اس سوداگر کو دے دیا۔ سوداگر نے اس کو لے جاکر بادشاہ کے حوالے کر دیا۔ خط پڑھنے کے بعد بادشاہ نے فوراً ھی اس غریب آدمی کو دربار میں بلا لیا اور اس کو قیمتی کپڑے بطور انعام دئے اور سر سے پاؤں تک سونے چاندی سے لاد دیا۔

غریب آدمی زرق برق لباس پہنے اور سونے چاندی سے لدا ھوا خوش و خرم گھر آیا تو یہ دیکھ‌کر اس کی لڑکی خوشی سے پھولی نہ سمائی اور اس نے باپ سے کہا:

"اب چالیس دنوں تک کمرے کے اندر بیٹھ‌کر ریاضت کروں‌گی۔ مجھے کھانے پینے یا کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں، نہ کوئی میرے پاس آئے اور نہ ہی کوئی اندر جھانکے یا میرا نام لےکر پکارے۔ ورنہ میں خودکشی کر لوں‌گی۔"

یہ کہہ‌کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ لیکن رات کے وقت جب گھروالے سو گئے تو وہ چپکے سے کمرے سے باہر آئی اور شاہی محل کی راہ لی۔ محل میں پہنچ‌کر وہ شاہی اصطبل سے اس گھوڑے کو نکال لائی جس پر سوار ہوکر اس کا شوہر روز شکار کھیلنے جایا کرتا تھا۔ پھر اس نے مردانہ لباس پہنا، سر پر رئیسوں‌والی بھیڑ کی کھال کی ٹوپی پہنی، اصفہانی تلوار کمر سے لٹکا لی اور گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس نے گھوڑے کو ایک ایسا چابک لگایا کہ وہ گھوڑے کی ہڈیوں تک جا پہنچا۔ چابک کی ضرب سے گھوڑا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوکر زور سے ہنہنایا اور صحراؤں اور بیابانوں کی طرف سرپٹ دوڑ پڑا۔

لڑکی چلتے چلتے اس باغ میں پہنچی جہاں اس کا شوہر شطرنج پر اپنی ساری دولت اور نوکروں کو ہار گیا تھا۔ اس نے اندر جاکر باغ کے نگراں کو ادب سے سلام کیا اور چبوترے پر چڑھ‌کر بیٹھ گئی۔ وہ ایک پیالی چائے بھی ابھی ختم نہ کر پائی تھی کہ تین قمریاں آسمان سے اتریں اور ایک ایک قلابازی کھاکر تین پریوں کی شکلیں اختیار کر لیں۔ پریاں لڑکی کے سامنے بیٹھ گئیں اور شطرنج کھیلنے لگیں لیکن انہوں نے لڑکی کی طرف مڑکر بھی نہیں دیکھا۔ کھیلتے کھیلتے ان میں سے ایک نے دوسری سے کہا:

"بےایمانی نہ کرو۔"

"بےایمانی آدمی زاد کرتے ہیں" دوسری نے جواب دیا۔

یہ سن‌کر لڑکی چڑ گئی اور اس نے کہا:

"نہیں۔ آدمی‌زاد بےایمانی نہیں کرتے۔ بےایمانی تو پری‌زاد کرتے ہیں۔"

تب اس پری نے لڑکی سے مخاطب ہوکر کہا:

"تو پھر آؤ، کھیلو۔ دیکھیں، تم کیسے کھیلتے ہو۔"

لڑکی ان کے ساتھ داؤ پر شطرنج کھیلنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا سب کچھ جیت لیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس سر کھجانے کو ناخن تک نہ رہے۔ انہوں نے لڑکی سے کہا:

"ہم کوہ‌قاف سے دولت لاکر تمہارے ساتھ جی بھرکر کھیلیں گے۔"

لڑکی نے کہا: "دولت نہیں ہے تو خود اپنی بازی لگاؤ-"

پریاں اپنے آپ کو داؤ پر لگاکر کھیلیں اور پلک جھپکتے میں یہ بازی بھی ہار گئیں- لڑکی نے اپنی تلوار غلاف سے کھینچ لی- یہ دیکھکر پریاں درخت کی پتیوں کی طرح تھرتھر کانپنے لگیں اور لڑکی سے گڑگڑاکر کہنے لگیں:

"ہمیں چھوڑ دو- ہم ملک ارم کے بادشاہ کی بیٹی آق‌بیلک کی باندیاں ہیں- جب اس کو معلوم ہوگا کہ ہم نے اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا تو وہ ہمارے ماں باپ کو زندہ نہ چھوڑےگی- تم ہمیں چھوڑ دو- اس کے بدلے ہم تمہاری ہر خواهش پوری کر دیں‌گے-"

"اچھی بات ہے" لڑکی نے کہا- "میں تم لوگوں کو چھوڑے دیتا ہوں اور تم لوگ میری ایک خواهش پوری کر دینا: آق‌بیلک کو تین دفعه بلواکر اس کو میری بیوی بنوا دینا-"

پریوں نے ٹھنڈی سانسیں لیں اور سب سے بڑی پری نے کہا:

"آق‌بیلک بڑی ظالم اور خونخوار ہے- اس کی عمر اٹھارہ سال کی ہو چکی ہے اور اس نے آج تک اپنی ماں کی بھی ایک بھی نہیں سنی- لیکن خیر ہم تمہاری یہ خواهش پوری کر دیں‌گے- مگر ہماری بھی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ ہم جیسا کہیں تم کو ویسا ہی کرنا ہوگا- آق‌بیلک کے کمرے میں تین پلنگ ہیں- ایک زمرد کا بنا ہوا ہے، دوسرا یاقوت کا اور تیسرا ہیرے کا- ہم تمہیں اپنا ایک ایک بال دے دیں‌گے- تم آق‌بیلک کے کمرے میں پہنچ‌کر یہ بال جلا دینا- ہم تینوں اسی وقت آکر پلنگوں کے نیچے چھپ جائیں گے- پھر جب آق‌بیلک زمرد کے پلنگ پہ بیٹھے تو تم ساتھ‌والے پلنگ پر بیٹھ جانا اور زمرد کے پلنگ سے باتیں کرنا اور کہنا کہ کچھ سناؤ، میرا دل بہلاؤ- میں کوئی قصه سنانے لگوں‌گی اور آق‌بیلک سوچےگی کہ پلنگ بول رہا ہے- پھر آق‌بیلک زمرد کے پلنگ سے اٹھ‌کر یاقوت کے پلنگ پر بیٹھےگی- اب تم یاقوت کے پلنگ سے گفتگو کرنا- پھر اسی طرح ہیرے کے پلنگ سے بولنا- لیکن ایک بات یاد رکھو: جو بات ہم کہیں تم اس کی الٹی کوئی احمقانه بات نہ کہہ بیٹھنا-"

یہ کہہ‌کر پریوں نے اپنا ایک ایک بال توڑکر لڑکی کو دیا اور قمری بن‌کر پھر سے اڑ گئیں-

غریب کی بیٹی اپنے گھوڑے پر سوار ہوئی، جلدی سے ملک ارم پہنچی اور

سیدھی آق‌بیلک پری کے محل میں داخل ہو گئی۔ دیکھا تو آق‌بیلک پری ستر حریری پردے منہ پر ڈالے بیٹھی تھی۔ اس کے ارد گرد چالیس کنیزیں سب مہ‌لقا، آہو چشم، پیوستہ ابرو، اپنی نازک انگلیاں لبوں پر رکھے، نازو ادا سے مسکراتی ادب سے کھڑی تھیں۔ ان میں سے کسی کو بھی یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ آنے‌والا دراصل ایک حسین و جمیل سجیلا جوان نہیں بلکہ ایک لڑکی ہے۔ غریب کی بیٹی نے آق‌بیلک سے مخاطب ہوکر کڑک کر کہا:

"اے ظالم! خونخوار! کیا تم کو اس کا غرور ہے کہ تم ایک بادشاہ کی بیٹی ہو اور تمہارا نام آق‌بیلک ہے؟ تم کب تک اس زعم میں بےگناھوں کا خون بہاتی اور زمین کو لالہ‌گوں کرتی رھوگی؟ فوراً اٹھو اور میرے قدموں میں گر جاؤ۔ نہیں تو ابھی تمہارا سر کاٹ ڈالوں‌گا۔ تمہاری جیسی میرے ستر بیویاں ھیں۔ تمہارے جبر و ظلم اور خونخواری کی بات سنی تھی تو میں نے عہد کر لیا تھا کہ آتے ھی تمہارا سر قلم کرکے اپنے گھوڑے کے زین سے باندھ دوں‌گا۔ لیکن تمہارے حسن کو دیکھ‌کر مجھے تم پر رحم آگیا۔ میں تمہیں اپنی سلطنت میں لے جاؤں‌گا اور تم میرے چالیس ہزار سپاھیوں کو چائے پلایا کروگی۔"

غصیلی آق‌بیلک نے اپنے وزیر سے اشارے سے کچھ کہا۔ وزیر لڑکی پر برس پڑا:

"ارے احمق! تو کیوں اتنا غراتا ہے؟ کیوں اتنی ڈینگ مارتا ہے؟ تو نے اپنے کو سمجھا کیا ہے؟ بس حکم کی دیر ہے کہ تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھےگا۔ بک بک مت کر۔ کام کی بات کر۔"

غریب کی بیٹی قہقہہ مارکر ہنس پڑی۔ اس نے کہا:

"کاش میرے پاس ھڈیاں ھوتیں! تو میں اس پری‌زادی کو جوئے میں جیت لیتا۔"

آق‌بیلک نے فوراً چاندی کی چار اینٹیں اور چار ھڈیاں نکالیں اور لڑکی سے اشارے سے کہا کہ داؤ لگاؤ۔

"ذرا ٹھہرو" لڑکی نے کہا۔ "تم بےایمانی سے سب آنےوالوں کو لوٹ لیتی ہو اور خود ان کو مار ڈالتی ہو۔ لیکن میرے آگے یہ چالیں نہیں چلیں‌گی۔ تم مجھ کو نگل نہیں پاؤگی۔ میں تمہارے گلے میں پھنس جاؤں‌گا۔ لاؤ، ھڈیاں مجھے دے دو۔ پہلے میں پھینکوں‌گا اور پھر تم۔"

آق‌بیلک جل سی اٹھی لیکن ھڈیاں لڑکی کو دے دیں۔ اس نے ایک بڑا خزانہ

داؤ پر لگا دیا- لڑکی نے چاروں ہڈیاں اپنی ہتھیلی پر رکھکر چاندی کی اینٹوں پر پھینکیں اور جیت گئی-

آق بیلک اپنا سر بھی نہ کھجا پائی کہ اپنے ستر کے ستر خزانوں سے ہاتھ دھو بیٹھی- اپنی اس ناکامی پر اس کو اتنا دکھ ہوا، اتنا غصہ آیا کہ اس نے اپنے بال نوچ ڈالے اور اٹھکر زمرد کے پلنگ پر بیٹھ گئی- غریب کی بیٹی نے فوراً پری کا دیا ہوا ایک بال جلایا جس سے آق بیلک بےخبر رہ گئی- اسی وقت پریوں میں سے ایک، زمرد کے پلنگ کے نیچے آ موجود ہوئی- غریب کی بیٹی ساتھ والے پلنگ پر جاکر بیٹھ گئی اور زمرد کے پلنگ سے مخاطب ہوکر کہا:

"اے زمرد کے پلنگ! میں چھے مہینوں کا راستہ طے کرکے آیا ہوں اور اتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں کہ میرا برا حال ہو گیا ہے- آؤ کچھ سناؤ، میرے دل کو ذرا بہلاؤ، تکلیفوں کا بوجھ ذرا اس پر سے اٹھاؤ-"

پلنگ کے نیچےوالی پری نے پوچھا:

"کیا سناؤں؟"

"کچھ بھی سناؤ" لڑکی نے کہا- "سنانا تمھارا کام ہے، سننا میرا اور سمجھنا آق بیلک کا-"

اور پری ایک قصہ سنانے لگی-

## پہلی پری کا قصہ

ایک تھا بڑھئی- اس نے کچھ پیسے جمع کر لئے تو دنیا کی سیر کرنے کا فیصلہ کیا- بڑھئی کی ایک سنار سے دوستی تھی- اس نے کہا کہ تمھارے ساتھ میں بھی دنیا کی سیر کرنے چلوں گا- سنار کا بھی ایک دوست تھا جو درزی کا کام کرتا تھا- اس نے کہا کہ میں بھی چلوں گا- درزی کا بھی ایک دوست تھا جس کو جادو ٹونا کرنا آتا تھا- اس نے بھی کہا کہ میں بھی چلوں گا- غرضیکہ یہ چاروں ساتھ ساتھ دنیا کی سیر کرنے نکلے- چلتے چلتے شام ہو گئی- اندھیرا چھانے لگا تو وہ چاروں رات بسر کرنے کے لئے ایک جگہ ٹھہر گئے- انھوں نے سوچا کہ ہم چاروں کا سو جانا مناسب نہ ہوگا- تین آدمی سوئیں اور ایک آدمی پہرہ دے- چنانچہ تین آدمی لیٹ کر سو

گئے اور بڑھئی جاگ کر پہرہ دینے لگا۔ نیند کو دور رکھنے کی غرض سے اس نے لکڑی کا ایک ٹکڑا لیا اور اس کی ایک مورتی بنانے لگا۔ اس نے مورتی بنا لی اور اس کو الاؤ کے پاس رکھکر سو گیا۔ کچھ دیر کے بعد سنہار جاگا۔ مورتی کو دیکھکر اس نے سوچا کہ اس کو بڑھئی نے بنایا ہے۔ اس کو میں اور بھی اچھا کر دوں گا۔ یہ سوچ کر اس نے چاندی کے ایک سکے کو آگ میں پگھلایا اور اس سے مورتی کی آنکھیں، دانت اور ناخن بنا دئے۔ یہ سب کرکے وہ سو گیا اور درزی اٹھا۔ درزی نے خوبصورت کپڑے بناکر مورتی کو پہنا دئے اور اس کو اسی جگہ رکھکر سو گیا۔ اب جادوگر اٹھا۔ اس نے جادو کے ذریعے مورتی میں جان ڈال دی۔ صبح تینوں دوست جاگے تو انہوں نے ایک خوبصورت لڑکی کو کھڑے دیکھا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اس کے آگے چاند اور سورج کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اس کے آگے آق‌بیلک کسی مینڈک سے بھی زیادہ بدصورت لگتی تھی۔"

قصہ سنا چکی تو پری نے غریب کی بیٹی سے مخاطب ہوکر کہا:

"اے جوان! اب تم بتاؤ، یہ لڑکی ان چاروں میں سے کس کی تخلیق ہے؟ بڑھئی کی، سنار کی، درزی کی یا جادوگر کی؟"

"بےشک وہ درزی کی تخلیق ہے" لڑکی نے جواب دیا۔ "اگر درزی لباس بناکر نہ پہنا دیتا تو وہ انسان کیسے بنتی؟"

آق‌بیلک بھڑک اٹھی۔ اس نے کہا:

"ارے بےوقوف! لباس کی کون سی بات ہے؟ مجھی کو لو۔ میں چاہے لباس پہنوں یا نہ پہنوں بہرحال شہزادی ہی رہوں گی۔"

نقارے بج اٹھے۔ اعلان ہوا کہ شہزادی پہلی دفعہ بولی ہے۔

آق‌بیلک بالکل اس بلی کی طرح جس کے منہ سے چربی کا ٹکڑا چھین لیا گیا ہو بھڑک اٹھی اور زمرد کے پلنگ سے اٹھکر یاقوت کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ غریب کی بیٹی نے دوسری پری کا بال جلایا اور یاقوت کے پلنگ سے مخاطب ہوکر کہنے لگی:

"اے یاقوت کے پلنگ! اب تم بھی کچھ سناؤ۔ میرے دل کا غبار اتارو۔"

"بھلا میں تمہیں کیا سناؤں" پلنگ کے نیچے سے پری بولنے لگی۔ "تم نے تو زمرد کے پلنگ کی باتیں پرانے جوتوں کی طرح الٹ پلٹ کر رکھ دیں۔ لیکن خیر لو سنو۔"

## دوسری پری کا قصہ

قدیم زمانے کی بات ہے، کسی جگہ ایک امیر آدمی رہتا تھا۔ اگرچہ امیر تھا لیکن اس کی پیٹھ پر تین من میل تہ بہ تہ چڑھا رہتا تھا۔

اس کے تین بیٹے تھے۔ ایک دن سب سے بڑے بیٹے نے باپ سے کہا:

"اباجان! مجھے سو اشرفیاں دیجئے۔ میں شہر تاشقند جاکر موٹی تازی بھیڑیں لاؤں گا۔"

باپ نے اس کو سو اشرفیاں دے دیں۔ لڑکا گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ کئی لڑکے پھٹے پرانے متعدد سوراخوں والے ایک پوستین کو ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امیر کے بیٹے نے جھلاکر ان سے کہا:

"ارے لڑکو! اس پھٹے پرانے پوستین میں کیا رکھا ہے کہ تم لوگ اس کو اس طرح آپس میں کھینچ تان رہے ہو؟"

"یہ کوئی معمولی پوستین نہیں ہے۔ یہ جادو کا پوستین ہے" ایک لڑکے نے جواب دیا۔

"اس میں کیا خوبی ہے؟" امیر کے بیٹے نے پوچھا۔

"اس میں یہ خوبی ہے کہ اگر اس کے اوپر بیٹھ جاؤ تو یہ تم کو پلک جھپکتے میں مشرق سے مغرب پہنچا دے" لڑکوں نے جواب دیا۔

امیر کے بیٹے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے پوچھا:

"کیا تم لوگ یہ پوستین میرے ہاتھ بیچوگے؟"

"ہاں بیچیں گے" لڑکوں نے کہا۔ "سو اشرفیاں دےکر اس کو لے سکتے ہو۔"

امیر کے بیٹے نے سو اشرفیاں دےکر پوستین کو لے لیا اور اس کو لئے گھر واپس آ گیا۔ اپنے بیٹے کا سودا دیکھکر باپ کو بڑا غصہ آیا اور اس نے لڑکے کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

اب منجھلے بیٹے نے باپ سے کہا:

"اباجان! مجھے بھی سو اشرفیاں دیجئے۔ میں اوزگن جاکر چاول لاؤں گا۔ کہتے ہیں کہ وہاں چاول بہت سستا بکتا ہے۔"

باپ نے اس کو بھی سو اشرفیاں دے دیں۔ وہ گھر سے نکلا اور سڑک

پر چلا جا رہا تھا کہ اس کو ایک لڑکا ملا جو کسی آئینے کے ایک ٹکڑے کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا اور اس میں دیکھ دیکھ‌کر کہہ رہا تھا:

"واہ کیا عجیب و غریب آئینہ ہے— کیا سمرقند اور بخارا اور کیا قوقند اور نمانگان سب نظر آتے ہیں اس میں—"

امیر کے بیٹے نے دیکھا تو آئینے میں سے وہی لڑکا نظر آیا— اس کو بڑی حیرت ہوئی— اور اس نے لڑکے سے پوچھا:

"اپنا آئینہ میرے ہاتھ بیچوگے؟"

لڑکا: "ہاں بیچوں‌گا— چاہو تو لے لو—"

امیر کا بیٹا: "دام کیا مانگتے ہو؟"

لڑکا: "سو اشرفیاں—"

امیر کے بیٹے نے سو اشرفیوں میں آئینے کا وہ ٹکڑا خرید لیا اور گھر لوٹ آیا— بیٹے کی بےوقوفی دیکھ‌کر باپ نے اس کو خوب ڈانٹا— اب سب سے چھوٹے بیٹے نے باپ سے کہا:

"اباجان! اب مجھے بھی سو اشرفیاں دے دیجئے— میں سودا سلف کی دکان کھولوں‌گا—"

باپ کو بڑا غصہ آیا لیکن اس نے چھوٹے بیٹے کو بھی سو اشرفیاں گن‌کر دے دیں—

موسم سرما کے دن تھے— ہر طرف برف پڑی ہوئی تھی— امیر کا چھوٹا بیٹا اشرفیاں لےکر گھر سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ کچھ لڑکے ایک پرانے بغیر تہہ کے ٹب میں بیٹھ‌کر باری باری سے ایک ٹیلے سے نیچے کی طرف پھسل رہے ہیں— یہ دیکھ‌کر امیر کے بیٹے کو بہت تعجب ہوا— اس نے دل میں سوچا کہ کیا عجیب و غریب چیز ہے! پاؤں نہیں ہیں لیکن دوڑتی ہے— غرض اس نے سو اشرفیاں لڑکوں کو دےکر وہ ٹب لے لیا اور اس کو اٹھائے ہوئے گھر واپس آ گیا— اپنے بیٹے کی یہ حماقت دیکھ‌کر غصے اور مایوسی سے امیر کے منہ پر گہری شکنیں پڑ گئیں، بالکل اس کتے کی طرح جس نے کوئی سوئی نگل لی ہو— اس نے اپنے ہاتھ ہوا میں زور زور سے لہراتے ہوئے اپنی بیوی سے کڑک‌کر کہا:

"ارے بیگم! بتاؤ تو سہی، ان بےوقوف لڑکوں کو کس نے جنم دیا ہے؟"

بیوی نے چڑکر کہا:

"میں نے ہی جنم دیا—"

امیر لال پیلا ہو گیا اور اس نے کہا:

"تب تو میں تمہیں سات طلاق دیتا ہوں—"

بیوی بیچاری اپنا سر پکڑکر رونے لگی— ادھر لڑکے لاکھ افسوس اور ندامت سے اپنی اپنی خریدی ہوئی چیز کو گھور گھورکر دیکھنے لگے— اچانک منجھلے بھائی نے اپنے آئینے میں دیکھا کہ ملک مغرب کے بادشاہ کی اکلوتی بیٹی مر گئی ہے اور اس کا جنازہ اٹھنےوالا ہے— وہ فوراً اپنے بڑے بھائی کے پوستین پر بیٹھ گیا، چھوٹے بھائی کا ٹب ہاتھ میں لے لیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں— ایک ہی لمحے بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو ملک مغرب کی شہزادی کے تابوت کے پاس پایا— وہ فوراً بغیر تھہ کے ٹب میں پانی لےکر مری ہوئی شہزادی کے سر پر ڈالنے لگا— اچانک شہزادی نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کھڑی ہوئی— وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اس کے مقابلے میں آق‌بیلک کسی خارپشت سے بھی گئی گزری معلوم ہوتی—"

قصہ ختم کرکے دوسری پری نے کہا:

"اب جو عقلمند ہو وہ بتائے کہ وہ شہزادی اب کس کی بن گئی؟ پوستین‌والے کی، آئینے والے کی یا ٹب والے کی—"

غریب کی لڑکی نے کہا:

"وہ ضرور آئینےوالے کی بن گئی— اگر آئینےوالے نے اپنے آئینے میں شہزادی کو نہ دیکھ لیا ہوتا تو بھلا شہزادی کیسے جی اٹھتی؟"

"ارے بےوقوف!" آق‌بیلک کہہ اٹھی— "جب میں مر جاؤں تو کوئی مجھے لاکھ دیکھے میں خاک جی اٹھوں‌گی—"

ایک بار پھر نقارے بج اٹھے اور اعلان ہوا: "شہزادی دوسری دفعہ بولی ہے!" غصے سے آق‌بیلک تڑپ اٹھی اور یاقوت کا پلنگ چھوڑکر ہیرے کے پلنگ پر جا بیٹھی—

غریب کی بیٹی نے اب تیسری پری کا بال جلایا اور ہیرے کے پلنگ سے مخاطب ہوکر کہا:

"اے ہیرے کے پلنگ! آؤ، اب تم بھی کچھ سناؤ— میرا من اور کچھ ہلکا ہو جائے—"

اور ہیرے کے پلنگ کے نیچے چھپی ہوئی پری نے بھی ایک قصہ چھیڑ دیا—

# تیسری پری کا قصہ

کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ اس نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ وہ میٹھی میٹھی باتیں کرکے اپنے مالک کا دل بہلایا کرتا تھا۔ بادشاہ اپنے طوطے سے بہت پیار کرتا تھا اور اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ اس کو اپنے ہاتھ سے پستے توڑ توڑکر کھلاتا تھا۔ ایک دن طوطے نے سوچا کہ آج تو میں زندہ ہوں اور بادشاہ کا دل بہلاتا رہتا ہوں۔ اس لئے یہ مجھ سے بڑے پیار سے پیش آتا ہے۔ لیکن مر جاؤں‌گا تو یہ میرے ساتھ جانے کیا سلوک کرے۔ طوطے نے اپنے مالک کا امتحان لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے پنجرے میں کچھ یوں دراز ہو گیا جیسے مر گیا ہو۔

بادشاہ نے دیکھا تو اس کو مردہ سمجھکر اپنے نوکر سے کہا کہ اس کو باہر لے جاکر پھینک دو۔ نوکر نے اس کو پنجرے میں سے نکال‌کر باہر پھینک دیا۔

لیکن طوطے پھر سے اڑکر چھت پر جا بیٹھا اور بادشاہ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا:

"ارے بادشاہ! میں مرا نہیں ہوں۔ میں تو بس تمہارا امتحان لینا چاہتا تھا۔ مرنے جینے کی تو مجھے کوئی فکر نہیں۔ مجھے تو اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ جب زندہ ہوں تو تم میرے لئے بڑا پیار دکھاتے ہو۔ میرا خیال رکھتے ہو۔ لیکن معلوم ہوا کہ مرنے پر تمہارے لئے میری کوئی قدر نہیں رہےگی۔ اب ازراہ‌کرم میری ایک خواہش پوری کرو۔"

بادشاہ نے اپنے کئے پر سخت پشیمان ہوتے ہوئے کہا:

"ہاں کہو۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

"اجازت دو کہ میں ذرا ہندوستان ہو آؤں" طوطے نے کہا۔ "وہاں میرے ماں باپ رہ گئے ہیں۔ میں نے چالیس سال سے ان کی صورت نہیں دیکھی ہے۔"

"اچھی بات ہے" بادشاہ نے کہا۔ "لیکن شرط یہ ہے کہ تم واپس آ جاؤگے۔"

طوطے نے لوٹنے کا پکا وعدہ کیا اور اپنے وطن ہندوستان کی طرف اڑ چلا۔ وہ وطن پہنچ گیا۔ کئی دن تک اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے ساتھ رہا اور پھر بادشاہ کے پاس لوٹ آیا۔ وہ اپنے وطن سے بادشاہ کے لئے ایک تحفہ لایا تھا۔ یہ کسی پھل کا ایک بیج تھا جس کو طوطا اپنے منہ میں زبان تلے دباکر لایا تھا۔ بادشاہ کی ہدایت پر اس بیج کو شاہی باغ میں بو دیا گیا۔ اس سے پودا اگا جس کی خوب

اچھی طرح دیکھ بھال کی جانے لگی۔ دو چار سال میں وہ پودا ایک درخت بن گیا۔ اس میں پھول لگے، پھر پھل آئے اور کچھ ہی دنوں میں وہ پھل پک کر تیار ہو گئے۔

مالی سب سے پہلے کچھ پھل توڑکر سونے کی طشتری میں بادشاہ کے پاس لایا۔ بادشاہ اس وقت اصطبل میں اپنے بہترین گھوڑے کو لاڈ پیار کر رہا تھا۔ گھوڑے نے اچانک طشتری میں منہ مارا اور ایک پھل اٹھاکر کھا گیا۔ کھاتے ہی وہ وہیں گر پڑا اور دم توڑ دیا۔ بادشاہ کو طوطے پر اتنا غصہ آیا کہ اس نے فوراً ہی طوطے کو پنجرے سے نکال‌کر اس کی گردن مروڑ دی۔ اصل میں بات یہ تھی کہ ایک دن ایک سانپ کی مادہ اپنے نر کی تلاش میں نکلی تو اس کو اس باغ میں اسی درخت کے نیچے زمین میں گڑا ہوا پایا تھا۔ اس کو کسی نے مارکر درخت کے نیچے گاڑ دیا تھا۔ یہ سمجھکر کہ یہ ضرور مالی کے ہاتھ کا کام ہے، سانپ کی مادہ اس درخت کے نیچے اپنا زہر چھوڑ گئی تھی۔" قصہ ختم کرکے پری نے کہا:

"اب بتاؤ، قصوروار کون ہے؟"

غریب کی بیٹی نے جواب دیا:

"قصور بےشک گھوڑے کا ہے۔ بھلا اس نے وہ پھل کھایا ہی کیوں تھا؟"

"ہائے! کس بےوقوف سے میرا واسطہ پڑا ہے" آق‌بیلک کہہ اٹھی۔ "لٹ گئی میری قسمت! اب مجھے اس گدھے کی بیوی بننا پڑےگا۔ ہائے کتنے ہی رعب داب‌والے شہزادے آئے اور میں نے ان سب کے سر کٹوا دئے۔ تمہارے تو نہ مونچھیں ہیں نہ داڑھی۔ لیکن تم جیت گئے، میں ہاری۔"

پھر نقارے بج اٹھے۔ اعلان ہوا کہ شہزادی تیسری بار بول چکی ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جشن منائے جائیں، اہل شہر کی دعوت کی جائے۔

ادھر غریب کی بیٹی نے اپنی تلوار کھینچ لی اور کڑک‌کر کہا:

"بدمعاش شہزادی! تمہاری وجہ سے کتنے ہی لوگوں نے اپنی جانیں گنوا دی ہیں۔ اب تمہاری بھی موت کی گھڑی آ پہنچی ہے۔"

آق‌بیلک رو پڑی اور کہنے لگی: "ہائے میری سیاہ قسمت! میرا کیا قصور ہے؟ جب میں پیدا ہوئی تھی تو ایک سیاہ‌کار جادوگر نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ اب تم نے وہ جادو اتار دیا ہے۔ اب تم مجھ سے جو سلوک چاہو کرو۔"

غریب کی بیٹی نے شہزادی کی باتوں پر یقین کر لیا۔ اس نے بھی شہزادی کو اپنی مختصر کہانی سنا دی اور پھر اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے شوہر کو

ڈھونڈ نکالے اور غداری کی پاداش میں اس کو قتل کرا دے۔ آق‌بیلک نے اس کی یہ فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کر لیا۔

سارے ملک ارم میں شہزادہ خردماغ کو تلاش کیا گیا لیکن وہ کہیں بھی نہ ملا۔ تب غریب کی بیٹی شہزادی آق‌بیلک سے رخصت ہوکر اپنے ملک روانہ ہو گئی۔

وہ چلتی رہے اور آپ ذرا شہزادہ خر دماغ کا حال سنئے۔

غریب کی بیٹی نے شہزادی آق‌بیلک کو اپنا حال بیان کیا تو اسی وقت وزیر دوڑا ہوا اپنے کولھو پر آیا اور شہزادہ خردماغ سے کہا:

"شہزادے، تمہاری بیوی آ گئی ہے۔ وہ تمہارے خون کی پیاسی ہو رہی ہے۔ تم کہیں چھپ جاؤ۔"

شہزادہ خر دماغ فوراً گندے پانی کے ایک گڑھے میں اتر گیا اور جب تک اس کی بیوی واپس اپنے ملک نہ چلی گئی وھیں چھپا بیٹھا رہا۔

جب وہ چلی گئی تو وزیر شہزادہ خر دماغ کو آق‌بیلک کے پاس لے آیا۔ شہزادی نے اس سے پوچھا:

"کیا یہ سچ ہے کہ تم ملک عجم کے بادشاہ کے بیٹے ہو؟"

شہزادہ خردماغ نے فوراً دوزانو ہوکر خوشامدانہ لہجے میں کہا:

"اے شہزادی! یقین رکھو سچ مچ ھی میرا باپ ملک عجم کا بادشاہ ہے۔"

اس نے اپنی بیوی کے خلاف شہزادی آق‌بیلک کے خوب کان بھرے اور کہا:

"میں نے اپنے باپ کو ایک خط بھیج کر اس سے کہا تھا کہ اسے پاتے ھی میری کل منھی بیوی کے ٹکڑے کرا دینا۔ لیکن وہ چڑیل بچ نکلی اور سب کو الو بناکر مردانہ کپڑے پہنے میری تلاش میں یہاں آ پہنچی۔ وہ عورت نہیں، ایک چڑیل ہے، جادوگروں کی استانی ہے۔ اب دیکھو نا ایک گداگر کی بیٹی نے تم کو، ملک ارم کی شہزادی کو بھی چکمہ دےکر بولنے پر مجبور کر دیا۔ تمہیں اس سے بدلہ لینا چاھئے۔"

مارے غصے کے شہزادی آق‌بیلک کا چہرہ گل زعفران کی طرح پیلا پڑ گیا۔ اس نے شہزادہ خر دماغ سے کہا:

"تم چالیس ہزار کی فوج لےکر اپنے ملک جاؤ اور اس چالاک بھکارن کو پکڑ آؤ۔ میں اس کے خون کا رنگ دیکھنا چاھتی ہوں۔"

"تمہارا حکم سر آنکھوں پر" شہزادے خر دماغ نے خوش ہوکر کہا اور جلدی سے اٹھ کر تیاری کے لئے چلا گیا۔ اسے اتنی جلدی تھی کہ سیڑھیاں اترتے ہوئے ٹھوکر

کھا گیا اور گرکر نیچے لڑھک گیا اور اس کو کتنی ہی جگھوں پر چوٹ آئی اور کتنی ہی جگھوں پر اس کی جلد چھل گئی۔

چالیس ہزار کی فوج لےکر شہزادے خر دماغ نے ملک عجم کی راہ لی۔ چلتے چلتے وہ اپنی فوج کے ساتھ عجم کی حدود تک پہنچ گیا اور اپنے ایلچی کے ذریعے اپنے باپ کو ایک خط بھیج دیا جس میں لکھا تھا:

"میں تین دن کے بعد شہر عجم پہنچ جاؤں گا۔ اے میرے پدر! میں سات اقلیم کا فرماں روا ہوں۔ اگر تم نے میرے آگے سر نہ خم کیا اور شہر کے باہر نکل کر مناسب طور پر میرا استقبال نہ کیا تو میں تمہاری ساری سلطنت کو مٹی میں ملا دوں گا۔"

عجم کا بادشاہ اپنے بیٹے کی طبیعت سے بخوبی واقف تھا۔ خط پڑھکر خوف کے مارے اس کا برا حال ہو گیا۔ وہ فوراً اپنے چار سو لمبی لمبی داڑھیوں والے علما و فضلا کو اور چالیس وزرا اور دیگر درباریوں کو ساتھ لےکر شہزادہ خردماغ کے استقبال کے لئے شہر کے باہر نکل آیا۔ علماوفضلا اور وزرا وغیرہ جو اپنی گردنوں میں تلواریں لٹکائے ہوئے تھے راستے کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے اور خود بادشاہ راستے کے بیچوں بیچ دھول میں کھڑا ہو گیا۔ کافی دیر کے بعد شہزادہ خردماغ مع اپنی فوج کے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ناک اونچی اٹھائے، گالوں کو پھلائے، مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا۔ کسی کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا تھا۔ وہ جب اپنے باپ کے پاس پہنچا تو اپنا گھوڑا روک لیا اور باپ سے مخاطب ہوکر سختی سے کہا:

"اے پدر! میں نے تم کو لکھ بھیجا تھا کہ میری بیوی کے سبھی لوگوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو۔ تم نے میرا حکم پورا کیوں نہ کیا؟"

یہ کہہ کر شہزادہ خردماغ نے اپنے باپ کے وزرا اور درباریوں کو تلوار سے کاٹنا شروع کر دیا۔ بادشاہ خود راستے کی دھول میں منھ کے بل لیٹ گیا اور اپنا سر ہاتھوں سے چھپا لیا۔ استقبال کرنےوالے لوگوں کے بیچ شہزادہ خر دماغ کی بیوی بھی موجود تھی۔ اس نے اپنے شوہر کے کرتوت دیکھے تو فوراً سپاہیوں کا لباس پہنا، ایک ہاتھ میں تلوار لی، دوسرے ہاتھ میں ڈھال اور اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، للکارتی ہوئی آگے بڑھی اور شہزادہ خر دماغ کی فوج پر ٹوٹ پڑی۔

شہزادہ خردماغ نے اپنی بیوی کو تلوار اٹھائے، ڈھال سنبھالے گھوڑے پر سوار للکارتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہی اس کے غرور کا سارا نشہ اتر گیا۔ کیونکہ وہ اپنی بیوی کے کارناموں سے واقف ہو چکا تھا۔ خود اس کا یہ حال تھا کہ بکری کے سامنے شیر بنتا تھا اور شیر کے سامنے بکری بن جاتا تھا۔ چنانچہ بیوی کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا، تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ اس نے گوبر کے ایک ڈھیر پر اپنے آپ کو گرایا اور اپنا سر اس میں گاڑ لیا۔ اپنے فرماں روا کا یہ حال دیکھ کر ارم کے چالیس ہزار فوجی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ اتنی تیزی سے بھاگے جا رہے تھے کہ کوئی ہرن بھی ان کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔

غریب کی بیٹی نے شہزادہ خر دماغ کی گردن میں رسی ڈال کر اس کو گوبر کے ڈھیر سے کھینچ کر نکالا اور گھسیٹتی ہوئی شہر کے مرکزی چوک پر لے آئی۔ وہاں اس کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ جہاں تک بادشاہ کا تعلق تھا، اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔

عوام نے ملک عجم کے تخت پر غریب کی بیٹی کو بٹھا دیا۔

# سینگوں والا سکندر

قدیم زمانے کی بات ہے، سکندر نام کا ایک بادشاہ تھا جو نائیوں کے لئے فرشتۂ اجل کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس نائی سے وہ بال ترشواتا اسے قتل کرا دیتا تھا۔ وہ کیوں ایسا کرتا تھا، یہ بات بہت دنوں تک لوگوں کے لئے راز بنی رہی۔

ایک دفعہ بادشاہ سکندر شہر سمرقند آ نکلا۔ یہاں بھی اس نے بہت سے نائیوں کو قتل کرا دیا۔ آخر نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ سارے شہر میں ایک بھی نائی نہ رہ گیا جو بادشاہ کے بال تراش دیتا۔ بہت تلاش کرنے کے بعد ایک بوڑھا آدمی ایسا ملا جس نے جوانی کے دنوں میں نائی کا کام کیا تھا۔ اسے پکڑ کر محل میں لایا گیا اور وزیر نے حکم دیا:

"جاؤ، بادشاہ کے بال تراش دو۔"

بوڑھا بڑی خوشی سے راضی ہو گیا۔ اس بےچارے کو کہاں خبر تھی کہ سکندر جس نائی سے اپنے بال ترشواتا ھے اس کو زندہ نہیں چھوڑتا۔ وہ سکندر کے بال تراشنے لگا تو اچانک اس نے دیکھا کہ سکندر کے سر پر سینگ ھیں۔ لیکن اپنی حیرت دبائے چپ چاپ اپنا کام کرتا رہا۔ کام ختم کرکے جانے لگا تو سکندر پکار اٹھا:

"جلاد!"

بوڑھا خوف‌زدہ ہوکر سکندر کی منتیں کرنے لگا:

"بادشاہ عالم! میری جان بخش دیجئے۔ میں بیٹوں پوتوں‌والا بوڑھا آدمی ہوں۔ میرے تھوڑے سے خون سے آپ کا کیا بھلا ہوگا؟"

سکندر کو بوڑھے پر رحم آ گیا اور اس نے اسے چھوڑ دیا لیکن اس نے بوڑھے سے یہ قسم لی کہ وہ جیتے جی کبھی کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرےگا کہ سکندر کے سر پر سینگ ھیں۔

اس کے بعد بہت دن گزر گئے۔ بوڑھے نے اپنی قسم یاد رکھی اور چپ سادھے رہا۔ لیکن وہ راز تھا کہ بیچارے کو اندر ھی اندر کھائے جا رہا تھا۔ اس نے بوڑھے کا دن کا چین اور رات کا آرام حرام کر رکھا تھا۔ بات نہ پچنے سے اس کا پیٹ پھولتا گیا۔ وہ پھول‌کر پہلے ایک تربوز جیسا، پھر ایک سماور کے برابر ہو گیا۔ اور پھر پھولتے پھولتے جیسے ایک بڑا سا ڈھول بن گیا۔

اب بوڑھے سے نہ رہا گیا۔ وہ اپنے گھر سے نکلا اور شہر کے باہر ایک ویران اور سنسان جگہ پر آیا۔ وہاں ایک سوکھا ہوا کنواں تھا۔ بوڑھے نے اس کنویں میں جھک‌کر تین بار پورے زور سے چیخ کر کہا:

"سکندر کے سر پر سینگ ھیں!"

"سکندر کے سر پر سینگ ھیں!"

"سکندر کے سر پر سینگ ھیں!"

یہ کہتے ھی بوڑھے کا پیٹ پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور راز کو اپنے اندر چھپائے رکھنے سے اس کو برابر جو تکلیف ہو رہی تھی وہ دور ہو گئی۔ بوڑھا ھشاش بشاش اپنے گھر لوٹ آیا۔

کچھ دنوں بعد اس کنویں کے اندر سے ایک خوبصورت سا بانس اگ آیا۔ اس

طرف سے گزرنےوالے ایک چرواہے نے اس بانس کو دیکھا اور اسے کاٹ کر اس سے ایگ بانسری بنا لی۔ لیکن اس نے بانسری کو اپنے ہونٹوں سے لگاکر اپنی پسندیدہ دھن بجانے کی کوشش کی تو بانسری کی آواز سن‌کر دنگ رہ گیا۔ بانسری سے آواز آ رہی تھی: "سکندر کے سر پر سینگ ہیں!" چرواہے نے بانسری کو بس میں لانے کی سخت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس میں سے بار بار یہی نغمہ ابھرتا تھا:

"سکندر کے سر پر سینگ ہیں!"

بانسری کا یہ نغمہ اڑتا ہوا پل بھر میں بادشاہ سکندر کے کانوں تک پہنچ گیا۔ اس نے حکم دیا کہ بوڑھے نائی کو پکڑکر لایا جائے۔

سپاہی فوراً جاکر بوڑھے کو پکڑ لائے اور اس کو بادشاہ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس وقت اچانک کہیں دور سے پھر وہی نغمہ سنائی دیا۔

بادشاہ سکندر نے سوچا کہ شاید اجنبی فوجیں میری سرحدوں میں گھس آئی ہیں اور وہی مجھ کو بدنام کر رہی ہیں۔ یہ سوچ‌کر اس نے اپنی فوج کو اسی طرف بھیج دیا جس طرف سے وہ نغمہ سنائی دے رہا تھا۔

سپاہیوں نے اس چرواہے کو پکڑ لیا اور اس کو بلا تاخیر بادشاہ کے سامنے حاضر کیا۔

چرواہا واقعے سے بےخبر یہ سوچتا ہوا کہ شاید بادشاہ کو میرا نغمہ سننے کی خواہش ہوئی ہے، بادشاہ کے سامنے بےخوف کھڑا تھا۔

بادشاہ سکندر نے بوڑھے نائی سے کڑک‌کر کہا:

"بول، تو نے اپنی قسم توڑنے کی جرأت کیسے کی؟"

بوڑھے نے جواب دیا: "بادشاہ عالم! آپ میری جان بخش دیں تو عرض کروں۔"

"اچھا بخش دی میں نے تیری جان۔ بول!" بادشاہ نے گرج کر کہا۔

بوڑھے نے سارا قصہ شروع سے آخر تک کہہ سنایا۔ پھر چرواہے نے بھی ساری بات بتائی۔

سارا حال معلوم ہونے پر بادشاہ سکندر نے چرواہے سے بانسری چھین‌کر اس کو توڑ ڈالا اور بوڑھے نائی اور چرواہے دونوں کو محل سے نکلوا دیا۔

لیکن سکندر کی سینگوں‌والی بات ایک زبان سے دوسری زبان پر منتقل ہوتی گئی، ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتی گئی۔

اور اب میری زبانی اس راز سے آپ بھی واقف ہو گئے۔

# فال دیکھنے والا

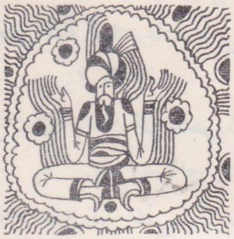

کسی زمانے میں کسی جگہ ایک بوڑھا آدمی رہتا تھا۔ ایک دفعہ اس کی بیوی حمام گئی تو نہائے بغیر لوٹ آئی۔ بات یہ تھی کہ جس وقت بڑھیا حمام پہنچی عین اس وقت بادشاہ کے ایک نوکر نے آکر اعلان کیا:

"درباری فال‌گو کی بیوی نہانے آ رہی ہے۔ حمام کو اس کے لئے فوراً خالی کر دو۔"

بڑھیا نے گھر آ کر اپنے شوہر سے کہا:

"اب معلوم ہوا کہ بادشاہ کے فال دیکھنےوالے بھی بڑے رعب داب‌والے ہوتے ہیں۔ اب تم بھی فال دیکھنا سیکھ لو اور بادشاہ کے فال‌گو بن جاؤ۔ ورنہ میں تم کو چھوڑکر چلی جاؤں گی۔"

بوڑھے کو نہ فال دیکھنا آتا تھا اور نہ ہی وہ فال‌گو بننے کی کوئی خواہش رکھتا تھا۔ لیکن کرتا بھی کیا؟ بیچارے کو اپنی بیوی کا حکم ماننا ہی پڑا۔ اس نے لکڑی کے ایک ٹکڑے کو تراش کر چھے پہلوؤں‌والی ایک چھوٹی سی چیز بنائی اور اُس کے چھیوں پہلوؤں کو چھے الگ الگ رنگوں میں رنگ دیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی سے ایک تھیلا بنوایا۔ ایک کاغذ کو جس پر نہ جانے کیا الائیں بلائیں لکھی ہوئی تھیں کہیں سے ڈھونڈکر تھیلے میں ڈالا اور فال‌گو بن بیٹھا۔ وہ اس تھیلے کو اپنے گلے میں لٹکاکر روز بازار میں جا بیٹھتا۔ اپنے آگے زمین پر ایک کپڑا بچھاکر اس پر اپنی یہ چھے پہلوؤں اور چھے رنگوں‌والی چیز رکھ دیتا اور گاہکوں کا انتظار کرنے لگتا۔ کوئی فال دکھانے آتا تو بوڑھا اپنے اس آلے کو ہاتھ میں لےکر اچھالتا۔ لکڑی کا ٹکڑا کبھی اس پہلو گرتا، کبھی اس پہلو۔ بوڑھا اس کو دیکھتے ہوئے جو جی میں آتا کہہ دیتا۔ اتفاق سے اس کی فال اکثر صحیح ثابت ہوتی۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں کے اندر اس نئے فال دیکھنےوالے کی شہرت سارے شہر میں پھیل گئی۔

ایک دفعہ بادشاہ کے لوگ آبادی سے ٹیکسوں کے طور پر وصول کئے جانےوالا سونا چاندی خچروں پر لادکر شاہی خزانے میں جمع کرانے کے لئے لا رہے تھے کہ

خچروں میں سے ایک کہیں راستے میں گم ہو گیا۔ بادشاہ نے فوراً شہر کے تمام فال دیکھنےوالوں کو بلوایا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ بتا سکا کہ سونے چاندی سے لدا ہوا وہ خچر کہاں ہے۔ تب درباریوں میں سے ایک نے بادشاہ کو بتایا:

"آج کل شہر میں کوئی نیا فال‌گو نمودار ہوا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ وہ کبھی نہیں چوکتا۔"

بادشاہ کے حکم پر اس بوڑھے فال‌گو کو فوراً دربار میں حاضر کیا گیا۔ بادشاہ نے اس سے کہا:

"سونے چاندی سے لدا ہوا میرا ایک خچر کھو گیا ہے۔ تم اس کو ڈھونڈ نکالو۔ ورنہ میں تمہاری گردن کٹوا دوں گا۔"

بوڑھے نے تھیلے سے چھے پہلوؤں اور چھے رنگوں‌والا اپنا آلہ نکال‌کر اسے سفید بکری کی کھال کے پوستین پر پھینکا۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچتا رہا پھر خچروں کو ہانکنےوالوں سے پوچھا:

"اچھا، یہ تو بتاؤ، تم لوگ راستے میں کہیں رکے تو نہیں تھے؟"

"ہاں رکے تو تھے" خچربانوں نے جواب دیا۔ "ہم نے ایک جگہ رک‌کر جھاڑیوں میں خچروں کو چرایا تھا۔"

بوڑھے نے بادشاہ سے مخاطب ہوکر کہا:

"بادشاہ عالم! آپ کا خچر انہی جھاڑیوں میں ہے۔ کسی کو بھیجئے اسے ہانک لائے۔"

بادشاہ نے فوراً اپنے نوکروں کو بھیجا تو فال سچ ثابت ہوئی۔ بادشاہ نے بوڑھے کو انعام و اکرام دےکر اس کو اپنا درباری فال‌گو بنا لیا۔

ایک دفعہ شاہی خزانے میں ڈاکا پڑا اور ڈاکو سونے سے بھری ہوئی ایک بوری اٹھا لے گئے۔ بادشاہ نے تمام فال دیکھنےوالوں کو بلاکر ان کو حکم دیا:

"چوری جانےوالے مال کا سراغ لگاؤ۔ ورنہ سب کے سب قتل‌کر دئے جاؤ گے۔"

بوڑھے فال‌گو نے چالیس دنوں کی مہلت مانگی۔ بادشاہ نے یہ مہلت دے دی۔

بوڑھا محل سے نکل‌کر سیدھا بازار گیا جہاں اس نے ایک میوہ‌فروش سے چالیس اخروٹ لئے اور اپنے گھر روانہ ہوا۔ گھر آکر اس نے اپنی بیوی سے کہا:

"تمہاری وجہ سے میری جان جوکھم میں پڑ گئی ہے۔ بادشاہ کے خزانے سے

ڈھیر سارا سونا چوری ہو گیا ہے۔ بادشاہ نے اس کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے چالیس دنوں کی مہلت دی ہے۔ لیکن مجھے کیا پتہ کہ وہ مال کہاں ہے۔ اب مجھے مرا ہوا ہی سمجھو۔ اور یہ سب تمہاری ہی وجہ سے ہوا۔ خیر میں تمہارا سارا قصور معاف کئے دیتا ہوں۔ لیکن تم بھی ایک کام کرو۔ چالیس دنوں تک میرے ساتھ ذرا پیار محبت سے پیش آؤ۔ ذرا میرا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرو۔"

اب ذرا ڈاکوؤں کا حال سنئیے۔

بادشاہ کے سونے کو چالیس ڈاکوؤں کا ایک گروہ اٹھا لے گیا تھا۔ ان ڈاکوؤں نے سنا کہ بادشاہ کے دربار میں ایک نیا فال‌گو آیا ہے جو بہت پکا ہے اور اس نے مال کو چالیس دنوں کے اندر ڈھونڈ نکالنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ چنانچہ ڈاکوؤں کے سردار نے اپنے آدمیوں میں سے ایک سے کہا:

"تم اس فال‌گو کے گھر جاکر معلوم کر آؤ کہ وہ کیا کر رہا ہے۔"

وہ ڈاکو چپکے سے بوڑھے کے گھر میں آیا اور چھپ کر گھروالوں کی باتیں سننے لگا۔

بوڑھے نے چالیس اخروٹوں میں سے ایک توڑکر کھا لیا اور پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہوکر کہا:

"بیگم، لو چالیس میں سے ایک یہاں آ گیا ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکو ڈر گیا۔ اس نے سوچا کہ اس کو معلوم ہے کہ ہم چالیس ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ میں یہاں آیا ہوں۔ یہ سوچ کر وہ دوڑا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور سارا حال ان کو سنا دیا۔ پھر اس نے سردار سے کہا:

"کسی طرح اس کو اپنی طرف جھکا لینا چاہئیے۔ ورنہ ہماری خیر نہیں ہے۔"

سردار نے غصے میں اس کو ڈانٹتے ڈپٹتے ہوئے کہا:

"بزدل! احمق کہیں کے! بوڑھے کا مطلب ضرور کچھ اور تھا۔ تم غلط سمجھ کر ڈر گئے ہو۔"

اگلے دن رات کو سردار نے دو ڈاکوؤں کو بوڑھے کے گھر بھیج دیا۔

بوڑھے نے تھیلی میں سے دوسرا اخروٹ نکالا اور اس کو توڑکر کھا لیا۔ پھر اس نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی سے کہا:

"لو بیگم! یہ چالیس تھے، دو یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

یہ سن کر دونوں ڈاکو ڈر گئے اور فوراً وہاں سے بھاگے۔

تیسرے دن اندھیرا ہوتے ہی خود سردار اپنے دو ساتھیوں کو لےکر بوڑھے کے گھر آ پہنچا۔ بوڑھے نے تھیلی میں سے تیسرا اخروٹ نکال کر توڑا۔ آدھے اخروٹ کو کیڑا کھا گیا تھا۔ بوڑھے نے اس آدھے مجروح سے اخروٹ کو کھا لیا اور ایک بار پھر اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا:

"بیگم! لو اب تیسرا بھی یہاں آ گیا ہے۔ اور یہ بالکل مجروح ہے۔"

اتفاق سے ڈاکوؤں کا سردار لنگڑا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ بوڑھا اسی کی بات کر رہا ہے۔ اس نے فوراً اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو اپنے ڈیرے میں بھیج دیا کہ وہ ایک تھیلی سونے کی لے آئے۔ وہ سونے سے بھری تھیلی لےکر واپس آیا تو سردار نے بوڑھے فال گو کے دروازے پر دستک دی۔

بوڑھے نے آکے دروازہ کھولا اور پوچھا:

"تم لوگ کون ہو؟"

ڈاکوؤں کے سردار نے جواب دیا:

"آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہم وہی ہیں جو بادشاہ کے خزانے میں سے سونے کی ایک بوری اٹھا لے گئے تھے۔ سارا سونا جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ ہم نے اس میں سے کچھ بھی نہیں لیا ہے۔ اس کو ہم نے جوں کا توں ایک جگہ چھپا رکھا ہے۔ اب تو ہمارا مرنا جینا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ از راہ کرم ہم کو بچا لیجئے۔ بادشاہ سے ہمارا ذکر نہ کیجئےگا۔"

بوڑھے نے سونے کی تھیلی لےلی اور ڈاکوؤں سے کہا:

"تم لوگوں نے بہت اچھا کیا کہ خود آ گئے۔ مجھے تو اسی دن سارا حال معلوم ہو گیا تھا۔ لیکن مجھے تم لوگوں پر رحم آ گیا اسی لئے میں نے بادشاہ سے چالیس دنوں کی مہلت مانگ لی۔ مجھے یقین تھا کہ کسی دن تم خود آکر توبہ کر لوگے۔ اچھا اب تم بےخوف ہوکر چلے جاؤ۔"

اگلے دن بوڑھا محل میں آیا اور بادشاہ سے کہا:

"جہان پناہ! آپ کا سونا میں نے تلاش کر لیا ہے۔ لیکن چوروں کا سراغ نہیں مل سکا۔ وہ کہیں بہت دور چلے گئے ہیں" اور اس نے اس جگہ کا پتہ بتا دیا جہاں چوروں نے سونے کی بوری چھپا رکھی تھی۔

بادشاہ نے اپنے کچھ سپاہیوں کو بھیجا جو سونے کی بوری نکال لائے۔

بادشاہ نے اپنے سب سے بڑے درباری فال‌گو کو بلواکر اس کے چالیس کوڑے لگوائے اور اسے محل سے نکلوا دیا۔ اس نے بوڑھے فال‌گو کو قیمتی انعام و اکرام دےکر اس کو درباری فال دیکھنےوالوں کا سردار مقرر کیا۔

بوڑھے نے گھر آکر اپنی بیوی سے کہا:

"لو اب تمہاری خواہش پوری ہو گئی۔ بادشاہ نے مجھ کو اپنے فال دیکھنےوالوں کا سردار بنا دیا ھے۔ جس دن مرنا ھوگا مر جاؤں‌گا۔ لیکن اس وقت تو میں ایک بڑا آدمی بن گیا ھوں۔ بوڑھا بڑا آدمی تو بن گیا لیکن اسے برابر یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کس وقت بادشاہ اس کے قتل کا حکم صادر کر دے۔ بیچارے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بادشاہ کی اس نوکری سے کس طرح نجات حاصل کرے۔

ایک دفعہ وہ حمام گیا اور حمام کے اندر اپنے سر پر دھی لگاکر بیٹھا اسی بات پر دماغ‌سوزی کر رہا تھا کہ اچانک اس کو بادشاہ سے چھٹکارا پانے کا ایک طریقہ سوجھ گیا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں اسی حالت میں دربار میں جاکر بادشاہ کا گریبان پکڑ لوں۔ بادشاہ یہ سوچ‌کر کہ میں پاگل ہو گیا ھوں، مجھ کو دربار سے نکال دےگا۔

یہ خیال آتے ھی وہ حمام سے نکلا اور سر پر دھی لگائے ھوئے ننگ دھڑنگ محل میں جا پہنچا۔ بادشاہ دالان میں بیٹھا ھوا تھا۔ بوڑھے نے پاگلوں کی طرح جاکر اس کو گریبان سے پکڑ لیا اور کھینچتا ھوا نیچے صحن میں لے آیا۔ یہ انوکھا منظر دیکھ‌کر سپاھیوں کے اوسان خطا ھو گئے اور وہ بت بنے کھڑے رھے۔

اتفاق سے اسی وقت اچانک زور کا زلزلہ آیا اور دالان کی چھت دھم سے نیچے آ رھی۔

دہشت اور حیرت سے بادشاہ بت بن گیا۔ پھر جب ھوش و حواس درست ھوئے تو اس نے بوڑھے سے پوچھا:

"تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ زلزلہ آنےوالا ھے؟"

بوڑھے نے بتایا:

"میں حمام گیا تھا۔ وھاں بیٹھے بیٹھے میں نے فال دیکھی تو معلوم ھوا کہ جس دالان میں آپ بیٹھے ھوئے ھیں اس کی چھت ابھی گرنےوالی ھے۔ چنانچہ میں شرم و حیا کو بھول‌کر ننگ دھڑنگ دوڑا ھوا پہنچا تاکہ آپ کو بچا سکوں۔"

بادشاہ کو بوڑھے سے اور بھی زیادہ محبت اور عقیدت ہو گئی۔ اس نے اس کو قیمتی انعامات دئے اور اب اس کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنے لگا۔

ایک دن بادشاہ اپنے درباریوں کے ساتھ شہر سے باہر سیر کو نکلا۔ ایک جگہ گھوڑے سے اتر کر چہل قدمی کر رہا تھا تو ایک ٹڈی کو پھدکتے ہوئے دیکھا۔ اسے پکڑ کر مٹھی میں بند کر لیا اور اپنے فال گو کے پاس آکر اس سے کہا:

"ذرا بتاؤ تو میری مٹھی میں کیا ہے۔"

بوڑھا شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ وہ اپنی ہی بات سوچتے ہوئے اداس ہو کر کہنے لگا:

"آہ میری جان! ایک بار بھاگی تو بچ گئی۔ دوسری بار بھی بچ گئی۔ تیسری بار تو پھنس گئی۔"

"شاباش! کمال ہے!" بادشاہ نے بہت خوش ہو کر کہا اور اس نے اپنی مٹھی کھول دی۔

اس دفعہ بھی اتفاق نے بوڑھے کا ساتھ دیا۔ لیکن اس طرح کب تک کام چل سکتا تھا؟ آخر ایک نہ ایک دن بھانڈا پھوٹنا ہی تھا۔ چنانچہ ایک دن بوڑھا جی کڑا کر کے بادشاہ کے پاس گیا اور اس سے کہا:

"بادشاہ عالم! میں آپ کو اکیلے میں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ نے فوراً درباریوں کو باہر نکال دیا اور بوڑھے سے کہا:

"اچھا اب کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"بادشاہ عالم!" بوڑھے نے کہا۔ "میں کوئی فال گو نہیں تھا۔ قسمت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے یہ ڈھونگ رچانا پڑا تھا۔"

پھر بوڑھے نے بادشاہ کو شروع سے آخر تک سارا حال سنا دیا۔ یہ قصہ سن کر بادشاہ خوب ہنسا اور اس نے بوڑھے کو فال گو کے عہدے سے سبکدوش کر کے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

# باپ کی وصیت

ایک آدمی کے تین بیٹے تھے۔ اس کی موت کی گھڑی قریب آگئی تو اس نے بڑے بیٹے کو اپنے پاس بلاکر پوچھا:

"بیٹے! کیا میرے مرانے کے بعد تم میری قبر کے پاس تین راتیں بسر کروگے؟"

بڑے بیٹے نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو اس آدمی نے منجھلے بیٹے کو بلاکر اس سے بھی یہی سوال کیا۔ منجھلے بیٹے نے بھی اس سوال کا نفی میں جواب دیا۔ پھر اس نے سب سے چھوٹے بیٹے کو بلاکر اس سے بھی پوچھا:

"بیٹے! کیا میرے مرنے کے بعد تم میری قبر کے پاس تین راتیں بسر کروگے؟"

چھوٹے بیٹے نے جواب دیا:

"اباجان! اگر آپ کہیں تو تین راتیں کیا میں سو راتیں آپ کی قبر کے پاس گزارنے کو تیار ہوں۔"

چھوٹے بیٹے کے جواب سے مطمئن ہوکر باپ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ اسے دفن کر دیا گیا اور چھوٹا بیٹا رات کو قبر کے پاس رہ گیا۔ آدھی رات کے وقت وہ قبر کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ اچانک آسمان سے سفید رنگ کا ایک گھوڑا اترا۔ اس پر زین کسی ہوئی تھی اور اس سے ہتھیار لٹکے ہوئے تھے۔ گھوڑے نے دوڑتے ہوئے قبر کے تین چکر لگائے۔ نوجوان جاگ اٹھا۔ اس نے گھوڑے کو پکڑ لیا اور اس سے پوچھا:

"تم نے قبر کے تین چکر کیوں لگائے؟"

"میں کبھی تمہارے باپ کی سچے دل سے خدمت کرتا تھا" گھوڑے نے جواب دیا۔ "اب اس کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے آسمان سے اترا ہوں۔"

پھر اس نے اپنی گردن کے کئی لمبے بال توڑکر نوجوان کو دئے اور اس سے کہا:

"جب کبھی تمہارے اوپر کوئی مصیبت آئے تم ان بالوں میں سے ایک کو جلا دینا— میں فوراً حاضر ہو جاؤں‌گا" یہ کہہ‌کر وہ پھر آسمان کی طرف اڑا اور پلک جھپکتے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا—

دوسری رات بھی نوجوان نے اپنے باپ کی قبر کے پاس گزاری— آدھی رات کے وقت کالے رنگ کا ایک گھوڑا آسمان سے اترا— اس نے بھی دوڑتے ہوئے قبر کے تین چکر لگائے— نوجوان نے اس کو بھی پکڑ لیا اور اس سے پوچھا:

"تم نے قبر کے تین چکر کیوں لگائے؟"

گھوڑے نے جواب دیا:

"کبھی میں تمہارے باپ کی تحویل میں تھا— وہ بڑے شوق سے میری سواری کرتا تھا— اب وہ مر گیا ہے تو میں اس کی یاد منانے کے لئے آسمان سے اتر آیا ہوں—"

اس نے بھی اپنی گردن کے کچھ بال توڑکر نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"اگر کبھی کسی مشکل میں پڑ جاؤ تو ان میں سے ایک کو جلا دینا— میں اسی وقت حاضر ہو جاؤں‌گا" یہ کہہ‌کر وہ آسمان کی طرف اڑا اور پل بھر میں غائب ہو گیا—

نوجوان نے تیسری رات بھی اپنے باپ کی قبر کے پاس گزاری— اس بار آدھی رات کے وقت ایک گھوڑا آسمان سے اترا جو بھورے رنگ کا تھا— اس نے بھی قبر کے تین چکر لگائے— نوجوان نے اس کو بھی پکڑ لیا اور پوچھا:

"تم نے قبر کے تین چکر کیوں لگائے؟"

گھوڑے نے جواب دیا:

"کبھی تمہارا باپ میرا مالک تھا— وہ جہاں کہتا میں اس کو اپنی پیٹھ پر بٹھاکر لے جاتا— اب جب وہ مر گیا ہے تو میں اپنا آخری فرض ادا کرنے آیا ہوں" یہ کہہ‌کر اس نے بھی اپنی گردن کے کچھ بال توڑکر نوجوان کو دئے اور بوقت ضرورت فوراً حاضر ہونے کا وعدہ کرکے آسمان کی طرف اڑ گیا—

نوجوان نے چوتھے دن بھی ساری رات اپنے باپ کی قبر کے پاس گزاری لیکن اس رات کو کچھ نہ ہوا— نوجوان اپنے باپ کی وصیت کا مطلب سمجھ گیا اور اس کے بعد رات کو وہاں آنا بند کر دیا—

باپ جو کچھ چھوڑ گیا تھا وہ تینوں بھائیوں نے آپس میں تقسیم کر لیا— لیکن یہ دولت کچھ ہی دنوں میں ختم ہو گئی اور اس کے بعد تینوں بھائی پیٹ پالنے

کے لئیے گاؤں کے لوگوں کی بھیڑ بکریاں اور گائیں چرانے لگے۔ چھوٹا بھائی تو اپنا کام ایمانداری سے کرتا رہا۔ مگر دونوں بڑے بھائیوں نے بےایمانی کا راستہ اپنایا۔ وہ اکژ دوسروں کے مویشیوں کو چپکے سے بازار میں بیچ آتے، دوسروں کی بھیڑوں اور بکریوں کو ذبح کرکے کھاتے اور اس طرح موج اڑاتے رہتے تھے۔ گاؤں والوں نے تنگ آکر تینوں ھی کو گاؤں سے نکال دیا۔ اب وہ ایک دوسرے گاؤں میں جاکر گلہ‌بانی کرنے لگے۔ یہاں بھی دونوں بڑے بھائیوں کا وھی حال رہا۔ کام صرف چھوٹا بھائی کرتا تھا اور دونوں بڑے بھائی کھاتے پیتے اور سیر سپاٹا کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ دونوں بڑے بھائی مویشیوں کو چرانے کا سارا کام چھوٹے بھائی کے ذمے ڈال کر خود شہر چلے گئے۔ وھاں انہوں نے ایک نہایت دلچسپ تماشا دیکھا۔

شاھی محل کے سامنے میدان میں نہایت اونچی سیڑھیاں بنی ھوئی تھیں جن کے بڑے چوڑے چوڑے زینے تھے۔ سیڑھیوں کے اوپر ایک خیمہ لگا ھوا تھا جس میں بادشاہ کی بیٹی بیٹھی ھوئی تھی۔ بادشاہ نے سارے ملک میں اعلان کرا رکھا تھا:

"جو بھی جوان گھوڑے، گدھے یا اونٹ پر سوار ھوکر یہ سیڑھیاں طے کرتا خیمے تک پہنچ جائےگا اور شہزادی کے ھاتھ سے ایک پیالی پانی پی‌کر اور اس کے ھاتھ کی انگوٹھی لےکر واپس زمین پر اتر آئےگا میں اس کے اعزاز میں چالیس دنوں تک سارے ملک کی دعوت کروں‌گا اور اس سے شہزادی کی شادی کر دوں‌گا۔"

یہ اعلان سن‌کر ملک کے کونے کونے سے ہزاروں لوگ اپنی اپنی قسمت آزمانے آئے۔ ان میں سے کوئی گھوڑے پر سوار تھا، کوئی گدھے پر اور کوئی اونٹ پر۔ وہ باری باری سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کرنے لگے لیکن ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ھو سکا۔ وہ سب سیڑھیوں پر سے گر گرکر مر گئے یا اپاھج ھو گئے۔

دونوں بڑے بھائی رات کو اپنے ڈیرے پر لوٹے تو انہوں نے چھوٹے بھائی سے کہا:

"ارے بھیا! کیا عجیب تماشا دیکھ‌کر آئے ھیں ھم شہر میں!"

"کون سا عجیب تماشا تھا؟ بتائیے تو سہی" چھوٹے بھائی نے کہا۔

بڑے بھائیوں نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا وہ سب چھوٹے بھائی کو سنا دیا۔ تب چھوٹے بھائی نے ان سے کہا:

"تو پھر کل مویشیوں کو آپ لوگ چرائیے اور مجھے چھٹی دیجئیے۔ میں بھی شہر جاکر یہ انوکھا تماشا دیکھ آؤں۔"

لیکن بڑے بھائی راضی نہ ہوئے- کام کرنے میں ان کا ذرا بھی جی نہیں لگتا تھا-
اگلے دن صبح دونوں بڑے بھائیوں نے پھر شہر کی راہ لی- چھوٹا بھائی اکیلا مویشیوں کو چراتا رہا- جب دن ڈھلنے لگا اور مویشی خوب سیر ہو گئے تو چھوٹے بھائی نے ان کو ایک طرف درختوں کے سایے میں لاکر بٹھا دیا- پھر اس نے سفید گھوڑے کے باریک بال کو جلایا- پلک جھپکتے میں وہ سفید گھوڑا جس پر زین کسی ہوئی تھی اور جو ہتھیاروں، زرہ، ڈھال غرضیکہ ایک گھڑسوار سورما کے تمام لوازمات سے لیس تھا، ہنہناتا ہوا آ گیا- نوجوان گھڑسواروں کا لباس اور زرہ پہن کر، ہتھیاروں سے آراستہ ہوکر اور ڈھال سنبھال کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اسے دوڑاتا ہوا شہر کے میدان میں جا پہنچا- سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے للکارا: "جلدی چل!" اور گھوڑا تیر کی طرح اڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا- شہزادی کے خیمے تک دو ہی زینے رہ گئے تھے کہ نوجوان نے اچانک گھوڑے کو پیچھے موڑا اور سیڑھیاں اترکر واپس نیچے آ گیا- تماشائی یہ دیکھ کر افسوس کرتے رہ گئے- نوجوان اپنے ڈیرے میں لوٹ آیا اور اس طرح اپنے مویشیوں کو چرانے میں مصروف ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو-
دونوں بڑے بھائی شہر سے لوٹ آئے تو بڑے جوش سے چھوٹے بھائی کو سنانے لگے:
"آج میدانوں کا بسنے والا ایک گھڑسوار سورما سیڑھیوں پر چڑھ گیا- لیکن آہ! بس دو ہی زینے باقی رہ گئے تھے کہ وہ اپنے گھوڑے پر پیچھے مڑکر نیچے اتر آیا-"
چھوٹے بھائی نے پھر اپنے بڑے بھائیوں کی منتیں کیں کہ مجھے ایک دن کی چھٹی دے دیجئے- میں بھی ذرا شہر جاکر یہ سب کچھ دیکھ آؤں- لیکن بڑے بھائیوں نے پھر انکار کر دیا-
اگلے دن صبح دونوں بڑے بھائی حسب معمول پھر شہر چلے گئے-
چھوٹا بھائی اپنے گلے کو چرانے لگا- مویشیوں کے پیٹ خوب بھر گئے تو وہ انہیں ہانک کے درختوں کے نیچے لایا جہاں وہ بیٹھ گئے- پھر اس نے کالے گھوڑے کا ایک بال نکال کر جلایا-
آن واحد میں کالا گھوڑا تمام سازوسامان سے لیس ہنہناتا ہوا وہاں آ گیا- نوجوان اس پر سوار ہو کر اسے دوڑاتا ہوا شہر کے میدان والی سیڑھیوں کے پاس جا پہنچا- آتے ہی اس نے گھوڑے کو ایڑ لگاکر "جلدی چل"! کہا اور گھوڑا تیر کی

طرح اڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ لوگ نیچے ٹکٹکی باندھے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور چلا چلاکر اپنے جوش اور ولولے کا اظہار کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالا گھوڑا سیڑھیوں کے اوپر تک پہنچ گیا۔ لیکن جب صرف ایک زینہ باقی رہ گیا تو نوجوان نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اس کو پیچھے موڑ دیا اور گھوڑا نیچے اتر آیا۔ لوگ ہائے ہائے کرتے اور ہاتھ ملتے رہ گئے اور نوجوان اپنی قیام‌گاہ پر واپس آ گیا۔ یہاں اس نے گھوڑے کو چھوڑ دیا اور بیٹھکر اپنے بھائیوں کا انتظار کرنے لگا۔ رات کو شہر سے لوٹنے پر دونوں بڑے بھائی بڑے جوش و خروش سے آج کی باتیں سنانے لگے۔

"جو سورما کل سفید گھوڑے پر سوار ہوکر آیا تھا وہ آج بھی آیا۔ اب وہ ایک کالے گھوڑے پر سوار تھا اور آج کا گھوڑا کل‌والے گھوڑے سے بھی کہیں عمدہ تھا۔ لیکن ہائے! وہ بھی کیا عجیب آدمی تھا! سیڑھیوں کے اوپر تک پہنچ گیا اور ایک ہی زینہ باقی رہ گیا تھا کہ اچانک پیچھے لوٹ پڑا۔"

چھوٹا بھائی اب اور بھی پرزور انداز میں بڑے بھائیوں سے منت کرنے لگا:

"آپ کے پاؤں پڑتا ہوں، مجھے بس ایک دن کی چھٹی دے دیجئے۔ میں بھی کم از کم ایک دفعہ یہ تماشا دیکھ لوں۔"

لیکن بڑے بھائی کب راضی ہونے‌والے تھے! انہوں نے کہا:

"ارے بھیا! اگر تم چلے گئے تو سارا کام ہی چوپٹ ہو جائے گا۔ ہم اس نوکری سے ہی ہاتھ دھو بیٹھیں‌گے اور فاقے کرنے پڑیں‌گے۔"

رات بیت گئی، صبح ہوئی اور دونوں بڑے بھائیوں نے سارا کام چھوٹے بھائی کو سونپ‌کر پھر شہر کا رخ کیا۔ چھوٹے بھائی نے مویشیوں کو خوب اچھی طرح چراکر اور پانی پلاکر درختوں کے نیچے سایے میں بٹھا دیا اور پھر بھورے گھوڑے کے ایک بال کو نکال‌کر جلایا۔ آن کی آن میں بھورے رنگ کا گھوڑا جس پر زین کسی ہوئی تھی، سورماؤں‌والے لباس اور ہتھیار وغیرہ سمیت کہیں سے اڑکر آ گیا۔ نوجوان پوری طرح تیار ہوکر اچھل‌کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس کو سرپٹ دوڑاتا شہر کے میدان میں جا پہنچا۔ اس بار اس نے اپنے گھوڑے پر میدان کے تین چکر لگائے، پھر سیڑھیوں کے پاس آیا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاکر "جلدی چل!" کہا تو گھوڑا اڑتا ہوا ایک ہی سانس میں سیڑھیوں کے اوپر پہنچ‌کر شہزادی کے خیمے کے سامنے رک گیا۔ نوجوان نے گھوڑے سے اترکر شہزادی کے ہاتھ سے ایک پیالی پانی لےکر پیا،

اس کی انگوٹھی اتارکر اپنی انگلی میں پہنی اور پھر گھوڑے پر چڑھکر سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ گیا۔ لوگ تالیاں بجا بجاکر اور چلا چلاکر نوجوان کو خراج تحسین پیش کرنے لگے لیکن وہ رکے بغیر ہی وہاں سے چل دیا اور اپنے ڈیرے پر واپس آکر اس طرح اپنے کام میں مصروف ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

بڑے بھائیوں نے شہر سے لوٹ‌کر وہاں کا سارا حال بڑے جوش سے اپنے چھوٹے بھائی کو سنا دیا۔ چھوٹے بھائی نے پھر ایک بار بڑی حسرت بھری نگاہوں سے اپنے بڑے بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"آپ لوگ کتنے خوش‌قسمت ہیں کہ یہ عجیب و غریب تماشا روز دیکھتے ہیں۔ کاش میں بھی ایک دفعہ دیکھ لیتا! مجھ پر رحم کیجئے۔ مجھے بھی ایک دن کی چھٹی دے دیجئے نا۔"

لیکن بڑے بھائیوں نے کہا:

"اب تو یہ تماشا ہی ختم ہو گیا۔ اب تو بس بادشاہ اس نوجوان کے اعزاز میں ساری رعایا کی دعوت کرےگا اور اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر دےگا۔"

بادشاہ نے چالیس دنوں تک اہل‌ملک کی دعوت کی اور اس سورما کا انتظار کرتا رہا جس کو شہزادی نے اپنے ہاتھوں سے پانی پلایا تھا اور جس نے اس کے ہاتھ کی انگوٹھی اتار لی تھی۔ لیکن اس سورما کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ وہ تو اس طرح اپنے مویشیوں کو چراتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ تب بادشاہ نے اپنے محل میں دعوتوں کا سلسلہ پھر سے شروع کیا اور اپنے آدمیوں سے کہہ دیا:

"جو بھی دعوت کھانے آئے اس کا ہاتھ دھلوایا جائے اور کسی کی انگلی میں شہزادی کی انگوٹھی دکھائی دے تو فوراً ہمیں اس کی اطلاع دی جائے۔"

ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن آنےوالوں میں سے کسی کی انگلی میں وہ انگوٹھی دکھائی نہ دی۔

تب بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا: "ملک کے سبھی لوگ آئے؟ کوئی رہ تو نہیں گیا؟"

"دوردراز کے میدانوں میں کچھ چرواہے رہ گئے ہیں۔ باقی سب آ چکے ہیں۔"

بادشاہ نے حکم دیا کہ ان رہے سہے چرواہوں کو بھی بلایا جائے۔

تمام چرواہوں کو بلایا گیا۔ بازی جیتنےوالا نوجوان چرواہا بھی اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ محل میں آیا۔ جب وہ اپنے ہاتھ دھونے لگا تو بادشاہ کے ایک خاص آدمی نے

جو پاس ہی کھڑا تھا اس کی انگلی میں شہزادی کی انگوٹھی کو دیکھ لیا اور فوراً جاکر بادشاہ کو اس کی خبر کر دی۔ اپنے چھوٹے بھائی کی انگلی میں شہزادی کی انگوٹھی دیکھکر دونوں بڑے بھائی بھی سخت حیران ہوئے— تب چھوٹے بھائی نے سارا قصہ شروع سے آخر تک ان سے کہہ سنایا— یہ قصہ سن‌کر بڑے بھائیوں کو اس بات کا بہت ہی افسوس ہوا کہ انہوں نے اپنے باپ کی وصیت ٹھکرا دی تھی لیکن اب پچھتانے سے کیا ہو سکتا تھا— ان کے لئے اب بس یہی باقی رہ گیا تھا کہ اپنے چھوٹے بھائی کی شادی کریں—

بادشاہ نے بڑی دھوم دھام کے ساتھ نوجوان چرواہے سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی— شادی کی یہ دھوم دھام تیس دنوں تک برابر جاری رہی—

اس کے بعد ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ ایک دن اچانک بادشاہ فوت ہو گیا— عوام نے اس کی جگہ اس کے داماد کو بادشاہ بنا دیا— چھوٹے بھائی کے ستارے کی یہ چمک دمک دیکھکر دونوں بڑے بھائی حسد کی آگ میں بالکل جل بھن‌کر رہ گئے اور وہ ٹھنڈی آہیں بھر بھرکے ایک دوسرے سے کہنے لگے:

"ہائے ہماری قسمت! جو کوئی اپنے باپ کی وصیت کو ٹھکرا دےگا اس کا یہی حشر ہوگا!"

اور چھوٹا بھائی اپنی مرادیں پا گیا—

# پانیوں کا باپ

سچ ہے یا جھوٹ، یہ تو معلوم نہیں لیکن کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں نورآتا* کے پہاڑوں کے دامن میں ایک شہر بسا ہوا تھا جس کا نام وقت کی گہرائیوں میں گم ہو چکا ہے— اس شہر میں لوہاروں کا ایک محلہ تھا جہاں ایک مشہور لوہار رہتا تھا— تب سے اب تک بہت دن گزر چکے ہیں— انسان کی یادداشت کی عمر اتنی ہی چھوٹی ہوتی ہے جتنے استرا پھرے ہوئے سر کے بال اور اس میں اتنے ہی سوراخ ہوتے ہیں جتنے کسی زمانے میں بخارا

* نورآتا: نور برسانےوالے بزرگ— مترجم—

کے بھیک‌منگوں کے چیتھڑوں میں ہوتے تھے۔ چنانچہ اب کسی کو یاد بھی نہیں رہا کہ اس لوہار کا نام کیا تھا جو تھا تو غریب، لیکن بڑا شریف انسان تھا۔

انتہائی خشک‌سالی کے دن تھے۔ جو دریا موسم‌گرما کے دنوں میں پانی سے لبالب بھرے رہتے تھے اب بالکل سوکھ گئے تھے۔ نالوں کی تہوں میں دراریں پڑ گئی تھیں۔ درخت اپنی پتیوں کو کھوکر بالکل ننگے ہو گئے تھے۔ ریگستان کی آگ بھری سانسوں نے ساری فصلوں کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔ بھکمری شروع ہو چکی تھی۔

لیکن دوسری طرف امیروں، بیگوں اور خانوں کے باغات میں درخت پھلوں سے لدے کھڑے تھے۔ ان کے کھیتوں میں فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ خشک‌سالی اور جگھوں پر تو کتنی ہی مہلک کیوں نہ رہی ہو ان باغات اور کھیتوں کو اس سے آنچ تک نہیں آئی تھی کیونکہ پہاڑ کے دامن میں سے پھوٹنےوالے چشمے کیا گرمی اور کیا سردی کسی بھی موسم میں سوکھنے کا نام نہیں لیتے تھے اور ان سب کا پانی شہر کے ان لوگوں کے قبضے میں تھا جو امیر تھے، لالچی تھے اور جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ‌ڈور تھی۔

ندیاں اور تالاب سب سوکھ گئے تھے۔ گرمی اور پیاس کے مارے لوگوں کی جانیں حلق میں آ گئی تھیں۔ مائیں پیاس سے دم توڑتے ہوئے بچوں کو سینوں سے لگائے شہر کی مٹی اور دھول سے اٹی سڑکوں پر ماری ماری پھرتی تھیں۔ دوسری طرف سرسبز و شاداب باغوں اور لہلہاتے کھیتوں کے مالک، شہر کے امرا اور شرفا تھے کہ غریبوں کی آہ و زاری سے بےنیاز گلچھرے اڑا رہے تھے۔

بےانتہا مایوسی سے روتے روتے ماؤں کی آنکھیں سوکھ گئیں۔ چیختے چلاتے بچوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ لوگوں کی آہ و زاری کی آوازیں اونچی پہاڑی کے اوپر بنے ہوئے شاہی محل کی دیواروں سے جاکر ٹکراتی تھیں۔ ان کی فریادیں آسمان کے ستاروں تک پہنچ جاتی تھیں۔

شہر کے باشندے حاکم شہر کے پاس گئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ زندگی اور نجات کا راستہ بتائے۔

"ہمارے بچے بھوک اور پیاس سے مر رہے ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہے، آپ کے پاس پانی ہے، دولت کا انبار ہے۔ ہماری مدد کیجئے!" شہروالوں نے بادشاہ سے فریاد کی۔ محل سے بادشاہ کے بجائے ارکان‌دین، مولوی اور شیخ نکل آئے اور انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاکر اعلان کیا:

"وهی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ خدا کی یہی مرضی ہے تو بندوں کو بھی صبروشکر سے کام لینا چاہئے۔ جو خدا کی مرضی کے خلاف چلے وہ کافر ہے۔"

شہروالوں کے دلوں میں غم وغصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ لوگ "پانی! پانی" پکارتے ہوئے شہر میں گھومتے پھرتے تھے اور شہر کے بازاروں اور میدانوں میں جمع ہوکر امیروں کے خلاف احتجاج کے نعرے بلند کرتے تھے۔ عوام کے غیض و غضب کی آگ تیز سے تیزتر ہوتی گئی۔

لیکن امیروں کے محلوں کی دیواریں بڑی اونچی اور مضبوط ہوتی ہیں۔ عوام کے غم وغصہ کی لہریں ان سنگین دیواروں سے ٹکرا ٹکراکر پاش پاش ہو گئیں۔ قوت و توانائی اور جرأت و ہمت سے بھرے ہوئے کتنے ہی مرد بادشاہ کے سپاہیوں کی تلواروں سے کٹ کر ہلاک ہو گئے۔ بادشاہ کے حکم پر ان کی لاشیں شہر سے دور بیابانوں میں لے جاکر پھینک دی گئیں اور بہت دنوں تک گدھوں کے قافلے ان کے اوپر منڈلاتے رہے۔

سارے شہر میں ایک اداس سا سناٹا چھا گیا۔ سڑکیں اور بازار سنسان اور ویران ہو گئے۔ بس لو آگ برساتی ادھر ادھر دوڑتی پھرتی تھی۔

لوہار غم و غصہ سے بھرا ہوا پہاڑوں کی طرف چلا گیا۔ اس کی دکان میں خاموشی طاری ہو گئی۔ ہتھوڑے کے لوہے پر ضرب لگانے کی گونجدار آواز بند ہو گئی۔ دھونکنی میں راکھ سرد پڑ گئی۔

پتھروں اور چٹانوں کے بیچ گھومتے پھرتے ایک دن لوہار کی ایک سفیدریش بوڑھے چرواہے سے ملاقات ہو گئی جس کے یہاں اس کو پناہ اور آرام کے لئے جگہ مل گئی۔ رات کو جب وہ دونوں غار کے اندر بیٹھے ہوئے تھے اور پتھر کے چولھے پر چڑھی دیگچی میں غریبانہ کھانا پک رہا تھا تو لوہار نے چرواہے کو اپنے دکھ درد اور عوام کی مصیبتوں کا قصہ سنایا۔ بزرگ چولھے میں جلتی ہوئی آگ پر نظریں جمائے چپ‌چاپ یہ درد بھری کہانی سنتا رہا۔ پھر وہ اٹھکر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ غار کے عین گنبد کے نیچے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"میں پانیوں کا باپ ہوں" اچانک بزرگ نے کہا۔ "ساری وادی کو زندگی بخشنےوالے دریا کے پانی کا رکھوالا ہوں۔ وادی کے باشندوں کو کس طرح سکھی بنایا جائے، کس طرح ان کو ایک عظیم طاقت کا مالک بنایا جائے، یہ مجھے معلوم ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ نیچے وادی میں چلے جاؤ۔ شہر اور دیہاتوں میں رہنےوالے

تمام لوگوں کو اکٹھا کرو اور ان سے کہو کہ وہ سب اپنی کدالیں اور پھاوڑے اٹھاکر یہاں چلے آئیں۔" گرد و غبار سے بھری ہوئی وادی کے اوپر جب سورج طلوع ہو رہا تھا تو لوہار جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا شہر کے بلند و بالا میناروں کی طرف چلا جا رہا تھا۔

لوہار چلتا رہا اور کسی ڈھنڈورچی کی طرح ہر راستے پر، ہر گاؤں میں، شہر کی ہر مسجد اور ہر حمام کے سامنے پکار پکارکر لوگوں کو بزرگ کا پیغام سناتا رہا۔

ہزاروں ہزار آدمی پہاڑ پر بزرگ کے پاس آ گئے۔ پانیوں کے باپ نے جمع ہونےوالے لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا:

"لوگو! تمہاری مصیبتوں کی جڑ ہے خشک‌سالی۔ آؤ گھاٹی میں باندھ تعمیر کرو۔ پانی کا ایک ذخیرہ بنا لو۔ تب پھر کتنا ہی سوکھا کیوں نہ پڑے ریگستانوں سے آنےوالی آگ بھری لو تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکےگی۔

لوگ کمریں کس‌کر اور آستینیں چڑھاکر باندھ تعمیر کرنے میں لگ گئے۔ امیروں کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ انہوں نے دور ریگستان میں رہنےوالے سیاہ‌کار جادوگر اعجوب کے پاس اپنے ایک آدمی کے ذریعے یہ کہلا بھیجا: "اے سبھی جانداروں اور بےجان اشیا کے خداوند! کالے کالے ہاتھوالے حقیر اور ناچیز لوگ تمہاری عظمت و ثروت کے بمقابل ایک قلعے کی دیواریں اٹھا رہے ہیں۔ یقین نہ آئے تو تم خود اڑکر پہاڑوں پر آؤ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

سیاہ‌کار اعجوب پہاڑوں کی طرف دوڑا۔ گرد و غبار اڑکر آسمان کے نیلے گنبد تک پہنچا اور ستاروں کو ڈھانپ لیا۔

پاگل بنے ہوئے اعجوب نے گھاٹی میں پھاوڑے چلاتے ہوئے ہزاروں لوگوں پر آگ کی آندھی پھونکی۔ کتنے ہی لوگ جل‌کر مر گئے۔ کتنے ہی لوگوں کے دم گھٹ گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ اب وہاں کوئی زندہ نہیں بچےگا۔ لیکن پانیوں کے باپ نے پہاڑی جھیل کے پانی کو چھلکا دیا۔ یخ‌بستہ پانی کے دھارے نے تپتی ہوئی چٹانوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ ہوا نم اور خوشگوار ہو گئی جیسی کہ حمام کے اندر ہوتی ہے۔ اعجوب مارے غصے کے تلملاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

لوگ پھر سے کام میں لگ گئے۔ وہ زمین کھودتے اور پتھروں کو توڑکر باندھ کی تعمیر کرتے رہے۔ لیکن ان پر ایک اور آفت آ رہی تھی۔ اچانک زمین ہل اٹھی

اور زور زور سے ھچکولے کھانے لگی۔ آسمان کا چاند اس طرح جھولنے لگا جیسے وہ کسی زنجیر سے بندھا، چھت سے لگا ھوا کوئی چراغ ھو۔ زمین کراہ اٹھی۔ پہاڑ کی چوٹیاں ایک دوسرے سے ٹکرانے اور ٹوٹ ٹوٹ‌کر نیچے گھاٹی میں گرنے لگیں۔ بھاری چٹانیں مسلسل ٹوٹ ٹوٹ‌کر لوگوں کے اوپر گر رھی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے دیووں کے پاؤں تلے چیونٹیاں رینگ رھی ھوں اور یہ سب کی سب ابھی کچل کے رہ جائیں گی۔

لیکن پانیوں کے باپ نے لوگوں کو گھاٹی سے اٹھا اٹھاکر پہاڑ کی ڈھلان پر رکھ دیا۔ وہ موت سے بچ گئے۔ یہی نہیں، یہ آفت ڈھانےوالی چٹانیں لوگوں کو کام بھی دے گئیں۔ خود بخود باندھ کے تننے میں لگ‌کر انھوں نے لوگوں کے کام کی رفتار کو تیز کر دیا۔

مگر اعجوب کو اب بھی چین نہیں آیا۔ پہاڑوں اور وادیوں میں جتنے بھی آگ لگانےوالے اجگر، خونخوار شیر، چیتے، بھیڑیے، زھریلے سانپ، بچھو وغیرہ تھے ان سب کو جمع کرکے اعجوب نے لوھار کی زیر رھنمائی کام کرنےوالے لوگوں سے لڑنے کے لئے بھیج دیا۔

رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف گہرا سناٹا اور ایسا گھپ اندھیرا چھایا ھوا تھا کہ ھاتھ کو ھاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ دن بھر کی سخت محنت سے تھکے ھوئے لوگ تہہ‌خانوں میں دنیا و مافیہا سے بےخبر پڑے سو رھے تھے۔ دفعتاً خونخوار اور زھریلے جانوروں کی فوج ان پر ٹوٹ پڑی۔ ساری گھاٹی میں ھلچل مچ گئی۔ لیکن اس سراسیمگی کے عالم میں بھی لوھار نے اپنے ھوش و حواس نہیں کھوئے۔ اس نے ھدایت کی کہ ارچہ کے درختوں کو شاخیں کاٹ‌کر لاؤ اور ان کے الاؤ جلاؤ۔ جگہ جگہ الاؤ جلا دئے گئے تو ان سے اٹھنےوالے سرخ شعلوں سے ڈرکر اور ارچہ کی رال کی تیز بو کی تاب نہ لاکر تمام جانور تتر بتر ھو گئے۔

لوھار اور اس کے ھم‌وطنوں نے بالآخر باندھ کی تعمیر مکمل کر لی۔ اس کی اونچائی پاپلر کے پانچ درختوں کی اونچائی کے برابر تھی۔ وہ بڑی بڑی چٹانوں کو ایک دوسرے سے جوڑکر بنایا گیا تھا جن میں سے ھر ایک لمبائی اور چوڑائی میں کم و بیش ایک مکان کے برابر تھی۔ ان کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے لئے لوھار نے ان کے درمیان خالی جگھوں میں پگھلا ھوا سیسہ بھر دیا تھا اور یہ سیسہ بھی آس پاس کے پہاڑوں کو کھودکر نکالا گیا تھا۔

باندھ بن کر تیار ہو گیا تو لوگ پہاڑ کو کاٹ کر سرنگ بنانے میں لگ گئے تاکہ پانی اس میں سے ہوکر وادی میں پہنچے۔

لیکن اعجوب اب بھی اپنی سیاہ‌کاریوں سے باز نہ آیا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ دریا جس پر باندھ تعمیر کیا گیا ھے، عوام کے بہت کام آئے گا۔ وہ پیاسی زمین کو سیراب کرے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کی ھمت بندھ جائے گی اور وہ سیاہ‌کار جادوگر کی اطاعت کرنا چھوڑ دیں گے اور اس کی ساری عظمت و ثروت مٹ کر رہ جائے گی۔

چنانچہ جادوگر ایک بار پھر ان بہادر لوگوں کو مٹانے کی کوششوں میں لگ گیا۔ اس نے ان پر بجلیاں گرانی شروع کیں۔ ان کو سرنگ کے اندر کچل دینے کی کوشش کی۔ زھریلے سانپوں سے ان کو ڈسوایا۔ لیکن لوگوں نے ھمت نہ ھاری۔ دن رات برابر پھاوڑے چلتے رھے۔ پھاوڑے زور زور سے پہاڑ کے سینے میں گڑتے تو پہاڑ کراہ اٹھتا اور لرزنے لگتا تھا۔

یہ سلسلہ ایک ہزار دن تک برابر چلتا رہا اور بالآخر لوگوں کی محنت اور جانفشانی اپنا میٹھا پھل لائی: خوشیوں کا دن آ گیا۔ باندھ کی زنجیر میں جکڑ دئے جانے کے بعد دریا بس میں آ گیا۔ اس کا پانی زمین‌دوز نہر میں بہتا ہوا وادی میں پہنچا اور اس نے چلچلاتی دھوپ اور آگ بھری ھواؤں سے جھلسی ہوئی زمین کی پیاس بجھاکر اس کو ترو تازہ کر دیا۔

ایک اونچی سیاہ چٹان پر اعجوب انتہائی بےبسی کے عالم میں بیٹھا مارے غصے کے تلملاتا رہا۔

فتحمند لوگ شہر میں واپس آ گئے۔ شہر کے تمام باشندوں نے ان کا انتہائی پرجوش خیرمقدم کیا۔ سارے شہر میں خوشیاں منائی گئیں۔ ھر طرف دعوتیں ہوئیں اور رقص و نغمہ کی محفلیں سجائی گئیں۔

شہر کے امیر لوگ، محلوں اور باغات کے مالک دوڑے ہوئے لوھار کے پاس آئے اور اس کے قدموں میں گر پڑے۔ وہ اپنے تمام ٹھاٹھ باٹھ اور غرور کو بھول کر اب لوھار کے آگے گرد سے اٹی ہوئی زمین پر پڑے تھے اور اس کے گن گاتے ہوئے اس کی منتیں کر رھے تھے۔ لوھار کو ان پر رحم آ گیا۔ اس نے ان غرور کے پتلوں کو قتل نہیں کروایا۔ اس نے ان کو معاف کر دیا اور تباھی کے بیج بو دئے۔ وہ دانشمندوں کا یہ قول بھول بیٹھا کہ وہ دشمن بہتر ھے جس کا سر قلم کر دیا گیا ہو۔

امیر لوگ اپنی نفرت کو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ انہوں نے لوہار اور اس کے معتقدوں کو مٹانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

اعجوب لق و دق صحراؤں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اس میں اب اتنی بھی طاقت نہیں رہ گئی تھی جتنی ایک چھوٹی سی چڑیا میں ہوتی ہے۔ لیکن ایک دن شہر کے امیروں نے چپکے سے اس کو بلوا لیا اور اندھیرے کونوں میں اس کے ساتھ سرگوشیاں کرتے رہے۔ پھر سیاہ‌کار اعجوب دوردراز کسی ملک کو روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے وحشی و خونخوار صحرائی قبائلیوں کو بتایا کہ فلاں شہر میں اتنی دولت اور ہر چیز کی اتنی فراوانی ہے کہ کیا کہنا۔

قبائلیوں کے دلوں میں لالچ جاگ اٹھا اور انہوں نے اس شہر پر یورش کر دی۔ وحشی قبائلیوں کے ہجوم نے شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بڑی گھمسان کی لڑائیاں ہوئیں۔ دونوں طرف کے کتنے ہی آدمی مارے گئے۔ لوہار کے زیر سرکردگی شہر کے باشندوں نے جرأت‌وشجاعت کے نمونے دکھائے۔ اس جیالے لوہار نے ایک جنگ میں قبائلیوں کے سردار کو مار ڈالا اور رواج کے مطابق شہروالوں کی جیت ہو گئی۔

دشمن تھک گئے تھے۔ ان کے بازوؤں میں برچھی اور تلوار پکڑنے تک کی طاقت نہیں رہ گئی تھی۔ انہوں نے اپنے ملک لوٹ چلنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن اچانک شہر کے امرا کا ایلچی دشمنوں کی چھاؤنی میں آ پہنچا اور اس نے قبائلیوں کو بتایا:

"یہاں سے کچھ دوری پر باندھ بنا ہوا ہے جس سے شہر کو پانی ملتا ہے۔ اسی پر شہر کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ باندھ پتھر اور سیسے کا بنا ہے اور سیسہ گرمی سے پگھل جاتا ہے۔"

بس پھر کیا تھا، ہزاروں گھڑسوار قبائلی گھاٹی میں پہنچ گئے۔ وہ ادھر ادھر سے جانے کتنی ہی لکڑیاں اور گھاس پھوس جمع کر کے لائے اور باندھ کے نیچے ان کا بہت بڑا ڈھیر لگاکر اس میں آگ لگا دی۔ آگ کی لپٹیں آسمان تک پہنچ گئیں۔ گرمی کی شدت سے سیسہ پگھل‌کر بہہ گیا۔ پتھر جن کو سیسے نے ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا اب ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور پانی کے دباؤ کی تاب نہ لاکر نیچے گرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے باندھ ٹوٹ گیا۔ جھیل کا سارا پانی ایک دہشتناک دھارے کی شکل میں وادی کی طرف بہہ نکلا۔ تمام کھیت اور باغ زیر آب ہو گئے۔ سارا شہر تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کے بہت سے باشندے ہلاک ہوئے۔ دشمن کی فوج بھی ساری کی ساری مٹ گئی۔

سیاہ کار جادوگر اعجوب کا بھی نام و نشان باقی نہ رہا۔

شہر کے باشندوں میں سے بہت کم لوگ زندہ بچے لیکن وہ بھی شہر چھوڑکر کہیں چلے گئے۔ اس دن سے شہر کھنڈر بنا پڑا ہے۔

یہ ایک سچی کہانی ہے۔ جس کسی کو اس کی سچائی پر یقین نہ آئے وہ اس گھاٹی میں چلا جائے۔ وہاں آج بھی کچھ پتھر ایسے مل جائیں گے جن پر سیسہ چڑھا ہوا ہے۔ یہ وہی پتھر ہیں جن سے لوہار نے باندھ تعمیر کیا تھا۔

# چالیس ڈاکو اور گنجا

پرانے زمانے کی بات ہے، کسی جگہ ایک گنجا آدمی رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک بیل تھا۔ ایک دن وہ اپنے بیل کو چرانے لے جا رہا تھا کہ اچانک چالیس ڈاکو اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کے بیل کو چھین لے گئے۔ وہ گنجا آدمی بڑا چالاک تھا۔ اس نے ڈاکوؤں سے بدلہ لینے کا عہد کیا اور اگلے ہی دن اپنے گدھے کو لےکر ڈاکوؤں کے ڈیرے پر پہنچا اور ان سے کہا:

"میرے گدھے کے تھان میں کبھی لید نہیں ہوتی۔ روز صبح اس کے پاؤں تلے مجھے ایک ہزار اشرفیاں ملتی ہیں۔"

ڈاکوؤں نے گنجے کی بات کا یقین کر لیا اور ایک ہزار اشرفیاں دےکر اس کے گدھے کو خرید لیا۔ وہ اپنے سردار سے بہت ڈرتے تھے۔ چنانچہ اپنے سردار کی خوشامد کرنے کے لئے وہ گدھے کو اس کے پاس لے گئے۔ گدھے کی خاصیت سن‌کر سردار بہت خوش ہوا اور وہ پورے ایک دن اور ایک رات برابر گدھے کے پاس رہ‌کر اس کو چارا کھلاتا رہا۔ وہ ساری رات جاگتا رہا لیکن صبح ہونے کے قریب بیٹھے بیٹھے اچانک سو گیا۔ آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ گدھا بھی بالکل ویسا ہی ہے جیسے سب گدھے ہوتے ہیں۔ پھر بھی اس نے اپنی مایوسی کو چھپاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"آج صبح مجھے اس گدھے کے تھان میں دو ہزار اشرفیاں ملی ہیں۔"

باقی ڈاکو بھی باری باری گدھے کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ وہ اس کو اتنا کھلاتے جتنا وہ کھا سکتا تھا لیکن ان کے ھاتھ کچھ نہ لگا۔ سب سمجھ گئے کہ گنجے نے ان کو چکما دیا ھے۔ چنانچہ انھوں نے گنجے کو مار ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔

گنجا ڈاکوؤں کا ارادہ بھانپ گیا لیکن وہ ذرا بھی خوف‌زدہ نہ ھوا۔ اس نے ایک بھیڑ ذبح کرکے اس کا خون اس کی آنت میں بھر لیا اور اس آنت کو اپنی بیوی کے گلے میں کپڑوں کے اندر لٹکا دیا۔ پھر اس نے بیوی سے کہا:

"میں تم سے جو کچھ بھی کرنے کو کہوں تم اس کے برعکس کام کرنا۔ میں تم کو تلوار سے ماروں‌گا اور تم مر جانا۔ پھر میں چھڑی سے ماروں‌گا تو تم زندہ ھو جانا اور دوبارہ اپنے کام کاج میں لگ جانا۔"

گنجا یہ سب کچھ ابھی کہہ چکا تھا کہ ڈاکو آ دھمکے۔ ان کے سردار نے گنجے سے مخاطب ھوکر کڑک‌کر کہا:

"تم نے ھم کو دھوکا دیا ھے۔ ھم تمھیں جان سے مار ڈالیں‌گے۔"

لیکن گنجے نے اس دھمکی کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ یہی نہیں اس نے ڈاکوؤں کا اس طرح استقبال کیا جیسے وہ عزیز مہمان ھوں اور بیوی کو جلدی سے چولھے میں آگ جلانے کی ھدایت کی۔ بیوی نے فوراً جاکر چولھے میں آگ جلانے کے بجائے جو آگ جل رھی تھی اسے بجھا دیا۔ گنجا آگ بگولہ ھو گیا اور اپنے باپ سے ورثے میں ملی ھوئی تلوار اٹھاکر اپنی بیوی کی گردن پر وار کیا۔ خون کا فوارہ پھوٹ نکلا اور اس نے وھیں گرکر دم توڑ دیا۔ اس سے بھی گنجے کا غصہ ٹھنڈا نہ پڑا اور وہ بیوی کو چھڑی سے مارنے لگا۔ چھڑی کی کئی ضربیں کھاکر مری ھوئی بیوی پھر سے زندہ ھو گئی اور اٹھ‌کر دوبارہ اپنے کام کاج میں لگ گئی۔ یہ تماشا دیکھ‌کر ڈاکوؤں کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ یہ سوچ‌کر کہ چھڑی میں کوئی جادو ھے انھوں نے گنجے سے چھڑی چھین لی اور چلے گئے۔ اپنے ڈیرے میں آکر سب سے پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ اپنی بیویوں کو مار ڈالا اور پھر انھیں اسی گنجے‌والی چھڑی سے مارنے لگے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ ھوئی۔ ڈاکو سخت غصے کے عالم میں دوبارہ گنجے سے انتقام لینے کے لئے اس کے گھر کی طرف چل پڑے۔

ادھر گنجا ایک نئی چال چلنے کی تیاریاں کر رھا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا:

"آج ڈاکو پھر آئیں‌گے۔ میں ایک گڑھا کھودتا ھوں۔ اس میں آپ لوگ مجھے زندہ دفن‌کر دیجئے۔"

گھروالوں نے گنجے کو زندہ دفن کر دیا اور اس کے کہنے پر انہوں نے قبر میں ایک سوراخ کر دیا۔ صبح ڈاکو آ دھمکے۔ گنجے کے گھروالوں نے بتایا کہ وہ تو رات ہی کو مر گیا تھا۔ ہم اس کو دفن کر آئے ہیں۔ ڈاکو اپنی آنکھوں سے دیکھکر مطمئن ہونے کے لئے گنجے کی قبر پر گئے۔

گنجے کی قبر سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس دھوئیں کو دیکھکر ڈاکوؤں نے سوچا، معلوم ہوتا ہے گنجا اپنے کئے کا پورا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ وہ خوش ہوکر زور شور سے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں اچانک قبر سے دھواں نکلنا بند ہو گیا۔ ڈاکوؤں کو بڑا تعجب ہوا اور وہ قبر کے سوراخ میں جھانکنے لگے۔ گنجا قبر کے اندر سے پسی ہوئی لال مرچ ان کی آنکھوں میں جھونکنے لگا۔

"ارے معلوم ہوتا ہے کہ بدمعاش مرا نہیں ہے" ڈاکوؤں کے سردار نے کہا اور اس نے اپنے آدمیوں کو قبر کھود ڈالنے کا حکم دیا۔ ڈاکوؤں نے ایسا ہی کیا۔ جونہی قبر کا منہ کھلا گنجا اچھل کر باہر آیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈاکو اس کے پیچھے دوڑے۔ انہوں نے اس کو پکڑ لیا اور ایک بورے میں بند کر کے دریا میں پھینک دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسے بورے میں بند کر کے دریا کی طرف لئے جا رہے تھے کہ اچانک گھاس پر پھدکتی ہوئی کچھ بٹیروں پر ان کی نظر پڑی۔ بس پھر کیا تھا کہ انہوں نے گنجے کے بورے کو زمین پر رکھ دیا اور بٹیروں کو پکڑنے چلے۔ وہ بٹیروں کا پیچھا کرتے ہوئے کافی دور نکل گئے۔ اتنے میں اس جگہ سے جہاں گنجا بورے میں بند بیٹھا ہوا تھا ایک سوداگر بازار میں خریدی ہوئی کچھ بھیڑوں کو ہانکتا ہوا گزرا۔ بورے کے سوراخ سے گنجے نے اس کو دیکھا تو فوراً ہی اچھل کر کہنے لگا: "میں نہ خان بننا چاھتا ہوں نہ بیگ بننا چاھتا ہوں۔" یہ دیکھکر سوداگر رک گیا اور بورے کے پاس آکر پوچھا:

"تم کون ہو؟ اور بورے میں کیوں بند ہو گئے ہو؟"

"میں ایک غریب آدمی ہوں" گنجے نے جواب دیا۔ "لوگ مجھ کو ایک شہر کا خان بنانا چاھتے تھے۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ اب وہ مجھ کو اس بورے میں بند کرکے لے جا رہے ہیں اور زبردستی خان بنانا چاھتے ہیں۔"

"اگر تم خان بننا نہیں چاھتے تو مت بنو۔ تمہارے بدلے میں خان بننے کو تیار ہوں" سوداگر نے کہا اور اس نے بورے کا منہ کھول دیا۔ گنجا باہر آ گیا اور اس کے بدلے سوداگر بورے میں بیٹھ گیا۔ گنجے نے جھٹ سے بورے کا منہ کس کر باندھا اور جلدی سے وہاں سے کھسک گیا۔ اپنے ساتھ وہ سوداگر کی بھیڑوں کو بھی ہانک لے گیا۔

تھوڑی دیر میں ڈاکو واپس آ گئے۔ ایک بھی بٹیر ان کے ھاتھ نہیں آئی تھی۔ اس سے وہ اور بھی آگ بگولہ ہو رہے تھے۔ انہوں نے آکر بورے کو اٹھا لیا اور آگے بڑھ گئے۔ بورےوالا سوداگر بار بار چلا رہا تھا کہ "میں خان بننا چاھتا ہوں! میں خان بننا چاھتا ہوں!" ڈاکو یوں بھی غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ سوداگر کا چلانا سن‌کر ان کا اور بھی پارا چڑھ گیا۔ انہوں نے اس کی خوب پٹائی کی اور لے جاکر دریا میں پھینک دیا۔

اس کے بعد کچھ دن گزر گئے۔ ایک مرتبہ ڈاکو کہیں ڈکیتی کرکے اپنے ڈیرے کو لوٹ رہے تھے کہ اچانک راستے میں گنجے پر ان کی نظر پڑی جو کچھ بھیڑوں کو ھانکتا ہوا لئے جا رہا تھا۔ ڈاکو ھکا بکا ہوکر رہ گئے اور بہت گھبرا بھی گئے۔ انہوں نے گنجے سے کہا:

"ارے بھلے آدمی! ہم نے تو تم کو پھینک دیا تھا۔ تم یہ زندہ کیسے پھر رہے ہو؟ اور یہ اتنی ساری بھیڑیں تمہیں کہاں سے مل گئی ہیں؟"

گنجے نے جواب میں کہا:

"ارے بھائیو! کتنے ناسمجھ ہو تم لوگ بھی! ارے تم لوگوں کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ میرے ھاتھ میں کوئی ڈنڈا ونڈا دے دیتے۔ میں بھیڑوں کے اس گلے کو کتنی مشکلوں سے دریا کی تہہ میں سے ھانکتا ہوا لا رہا ہوں۔"

یہ سن‌کر ڈاکو اچھل پڑے اور گنجے سے کہنے لگے:

"اچھا! یہ بات ہے؟ تو پھر آؤ، ہم کو دریا میں پھینک دو تاکہ بھیڑوں کے ایسے گلے ہمیں بھی مل جائیں۔"

"اچھی بات ہے" گنجے نے کہا۔ "مگر تم لوگ ایک ایک لمبا موٹا ڈنڈا ھاتھ میں لے لو۔"

ڈاکو فوراً دوڑتے ہوئے گئے اور کہیں سے ایک ایک ڈنڈا لے آئے۔ گنجے نے دریا کی ایک گہری سی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"اب جاؤ، جاکر اس جگہ تم خود ہی کودو۔"

ڈاکوؤں نے آپس میں طے کیا کہ ہم سب میں ہمارا سردار ہی سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ سب سے پہلے وہی دریا میں کودے۔ اگر دریا زیادہ گہرا نہیں ہے اور دریا کی تہہ میں کافی بھیڑیں موجود ہیں تو وہ ہم کو بلا لے۔

اس فیصلے کے بعد ڈاکوؤں کا سردار دریا میں کود پڑا۔ کودتے ہی وہ ڈوبنے لگا

اور اپنے ہاتھ پانی سے نکال کر ہلانے لگا۔ ڈاکوؤں نے سمجھا کہ یہ ہم کو بلا رہا ہے۔ چنانچہ وہ بھی ایک ایک کرکے دریا میں کود پڑے۔ سب کے سب ڈوب گئے۔

گنجا نہ صرف یہ کہ ڈاکوؤں سے چھٹکارا پا گیا بلکہ ان کی ساری دولت کا مالک بن گیا اور بہت ہی چین اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگا۔

سچ ہی کہا جاتا ہے کہ لالچ میں مبتلا ہونےوالوں کا انجام ہمیشہ ہی برا ہوتا ہے اور وہ اپنے حرص و ہوس کے منصوبوں میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں تک ان کا داؤ چل جائے، لیکن یہ منصوبے ایک نہ ایک دن بہرحال خاک میں مل جاتے ہیں۔

## پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے متعلق آپ کی قیمتی رائے اور آئندہ مطبوعات کی تجاویز اور مشوروں کا بصد شکریہ خیرمقدم کرے گا۔

براہ کرم اپنے تبصرے اور مشورے مندرجہ ذیل پتے پر بھیجئے:

دارالاشاعت ترقی کی شاخ

۳۰۔ نوائی اسٹریٹ

تاشقند ۔ سوویت یونین

Progress Publishers Branch
30, Navoi Street,
Tashkent, U.S.S.R.